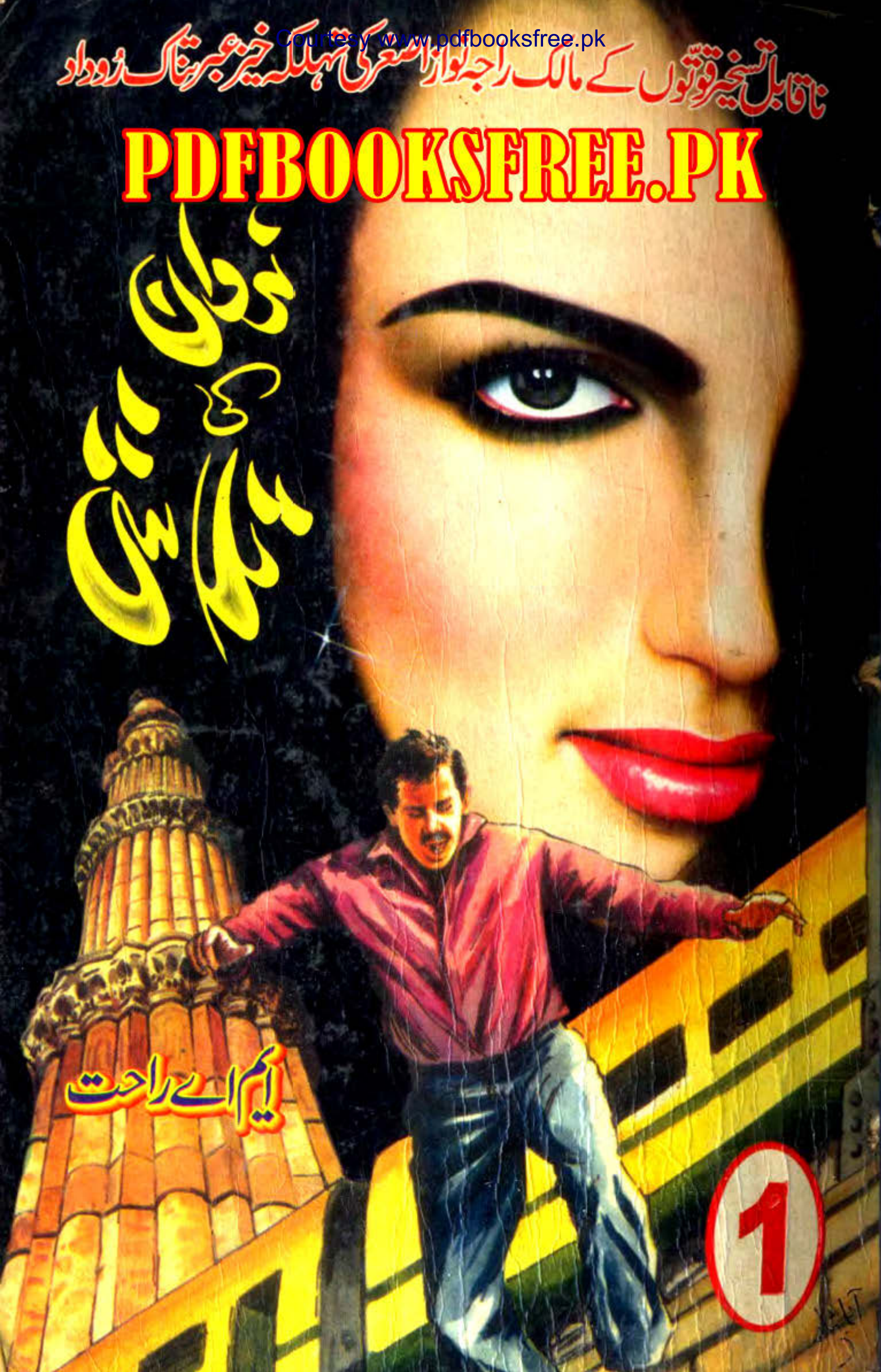


Courtesy www.pdfbooksfree.pk
ناقابل تسخیر قوتوں کے مالک راجہ نواز اصغری تہلکہ خیز عبرتناک روداد
PDFBOOKSFREE.PK
نروان کی تلاش
ایم اے راحت
1

پیش لفظ

جناب آتش نے نہ جانے جوانی میں کیا غضب ڈھائے ہوں گے کہ آج تک ان کی جوانی بدنام ہے۔ اور کبھی نہ کبھی ہر شخص اپنے ماضی کو آتش سے منسوب کر دیتا ہے۔

زوال کی تلاش بھی ہم نے اسی نادانیوں کے دور میں لکھا تھا۔ جب ہر چمکتی چیز سونا نظر آتی ہے۔ چنانچہ چمکتی چیزوں کی اس داستان کو ہماری جوانی کی بھول سمجھ کر قبول کیا جائے اور اس کی روشنی میں ہمارے کردار کا تجزیہ نہ کیا جائے۔

ہم نہایت شریف آدمی ہیں' ویسے شریف آدمی راجہ نواز اصغر بھی ہے' لیکن آپ حالات کا کیا کریں گے جو انسان کو نہ جانے کون کونسے راستوں پر لے جاتے ہیں۔ سرائے عالمگیر کا یہ نوجوان ایک معصوم دیہاتی تھا۔ لیکن وقت نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔

اللہ اسے بھی معاف کرے اور ہمیں بھی۔ ہاں یہ اس کے کردار کا اصل روپ تھا کہ جب ایک شیطان صفت مجرم اسے اس کے مسلک سے ہٹانے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

"پنجاب کی قسم' ترلوکا' تو ایسا نہ کر سکے گا۔"

اس کے بعد اس نے لہلہاتی سرزمین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی قوت سے ہزار گنا طاقت والے ترلوکا کو چیونٹی کی طرح مسل کر زمین کی گہرائیوں میں پہنچا دیا۔

اپنے وقت کی مقبول ترین داستان۔ ملاحظہ فرمایئے۔

ایم اے راحت

میری کہانی کا آغاز کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے کیونکہ کہانی کہیں سے بھی شروع ہو سکتی
۔ میرے خیال میں اپنے تعارف سے آغاز کروں۔ بریاڈومینک جواب خدا کے فضل سے مسلمان
رزیب النساء بن چکی ہے' میری بیوی ہے اور اسی کے نام پہ امریکہ کی ایک خوبصورت شاہراہ پر
شوروم "زیبی کارپٹس" کے نام سے ہے۔ خود میں زندگی کی اڑتیس منزلیں طے کر چکا ہوں۔
ں سو چھتیس میں پنجاب کے سرسبز و تاریخی مقام سرائے عالمگیر میں پیدا ہوا۔ جہلم کی گود میں
رے لیتا ہوا یہ چھوٹا سا قصبہ قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں میں
اتے ہوئے چنے کے پودوں کی سوندھی سوندھی خوشبو آج بھی روح پر نقش ہے۔ انہی کھیتوں میں
پن گزارا جوانی کی سرحدوں کو چھوڑا۔ مڈل تک قصبے کے اسکول میں تعلیم حاصل کی اور اس کے
پل کے اس طرف دریائے جہلم کے کنارے آباد شہر جہلم کے سیکنڈری اسکول سے میٹرک کیا۔
ڑک کرنے کے بعد جہلم کے پنگوڑے سے نکل کر لاہور آنا پڑا۔ باپ دادا کسان تھے' زندگی بھر
مین کا سینہ چیر کر غلہ اگاتے رہے۔ لیکن ہواؤں کے رخ بدل رہے تھے۔ تعلیم کی ضرورت کا
ساس ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اور میرے والدین بھی مجھے زیادہ سے زیادہ تعلیم دلا کر افسر بنانا چاہتے تھے۔
ن کے پسینے کی کمائی کا بڑا حصہ میری تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ خوش تھے۔ انگریزوں کی چیرہ
ستیوں سے بھی وہ اکتائے ہوئے تھے اور ان کے مقابلے میں ستون کھڑے کرنا چاہتے تھے۔ میں
یکھتا رہا۔ میرے ہم وطن ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ وطن آزاد ہو گیا اور زمین کے
سینے پر ایک پاک مملکت پاکستان ابھر آئی۔ مسلمانوں کا وطن' جس کی فضا میں آزادی کی خوشبوئیں
رچی ہوئی تھیں اور ان خوشبوؤں کو برقرار رکھنے کے لیے انتھک محنت کرنی تھی۔ میں تعلیم حاصل
کرتا رہا۔ اپنی بدقسمتی کا ذمہ دار میں کسی کو نہیں ٹھہراؤں گا' جس دن میں نے بی اے میں کامیابی
حاصل کی اور اپنے والدین کو اس خوشی میں شریک کرنے کے لیے بھاگم بھاگ سرائے عالمگیر پہنچا' تو
میں نے اپنے کچے مکان کے صحن میں مردوں اور عورتوں کا ایک مجمع پایا۔ اس مجمع میں میری ماں' بین

کر رہی تھی، چھوٹا بھائی پریشان آنکھوں سے ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا ـــــــ اور ـــــــ مجمع کے درمیان چارپائی پر میرے باپ کی لاش سفید چادر اوڑھے ہوئے پڑی تھی۔

میں سکتے میں رہ گیا۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر تھا میں نہیں جانتا تھا کہ میرے دیوہیکل باپ کو موت نے کس طرح دبوچ لیا۔ تب ـــــــ ہمدردی کرنے والوں نے، اور صبر کی تلقین کرنے والوں نے مجھے بتایا کہ میرے باپ کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ حسب معمول کھیت پر کام کر رہا تھا کہ کہیں سے سانپ نکل آیا اور میرا باپ بے خبری میں مارا گیا۔ مجھے شدید حیرت تھی۔ میرے باپ کی چوڑی کلائیاں پورے قصبے میں مشہور تھیں۔ اس کے تنومند جسم کے سامنے بڑے بڑے جوان آج بھی شرماتے تھے۔ اس شاندار جسامت، اس قوی ہیکل جسم نے موت کس آسانی سے قبول کرلی۔

کامیابی کی خوشیاں موت کے اندھیروں میں جا سوئیں۔ کس طرح سب کو تسلی دیتا۔ خود ہی رو دھو کر چپ ہوگئے۔ مجھے صرف اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ باپ کے پاس میرے سوا کوئی اثاثہ نہیں تھا۔ وہ بڑھاپے میں صرف میرے سہارے زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن وہ وقت آنے سے قبل ہی اس نے یہ دنیا چھوڑ دی۔ اپنی زندگی بھر کی محنت کو وہ پھلتے پھولتے نہ دیکھ سکا۔ میرے ذہن پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ ہفتوں میں نے دریائے جہلم کے کنارے موجود خوشنما مسجد، جس کا سایہ جہلم کے پانی میں مکمل نظر آتا ہے، کے صحن میں گزارے۔ وہاں پڑا اپنے مستقبل پر غور کرتا رہا۔ گھر سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ بہت سے لوگ میرے پاس آئے مجھے میری ماں کی حالت بتائی۔ چھوٹے بھائی کی سرپرستی کے حوالے دیئے، لیکن مجھے ان کی باتوں سے جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ میں بھی جانتا تھا۔ یہاں، اس پرنور مسجد کے صحن میں، میں اپنی ماں اور بھائی کے مستقبل پر ہی غور کرتا تھا۔ مسجد کے پیش امام مولوی حاجی صاحب علی میرے مونس و غم خوار تھے۔ ان بزرگ کی حیثیت سے شاید اہل جہلم واقف نہ ہوں، لیکن میں جانتا ہوں وہ کیا تھے۔ اور یہ بھی مجھے ایک طویل عرصے کے بعد معلوم ہوا۔ اس وقت جب میں زندگی کے ایک نازک موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ اس وقت جب میں نے خلوص دل سے خدا کو پکارا تھا۔ حاجی صاحب علی بھی میری دلجوئی کرتے ہوئے کہتے تھے۔ "بیٹے ـــــــ تمام پریشانیوں کا حل عبادت الٰہی میں موجود ہے۔ خود کو خدا کے حضور پیش کردو۔ وہ تمہیں سنبھال لے گا اور پھر تمہیں کوئی غم نہیں رہے گا، تمہیں سیدھی راہ مل جائے گی۔"

اس وقت میں اوپری دل سے حاجی صاحب کی باتیں سنتا تھا۔ بعض اوقات میرے چہرے سے ناگواری کا اظہار ہوتا تھا، تو وہ بزرگ مجھے دعائیں دیتے ہوئے میرے پاس سے اٹھ جاتے تھے۔ بالآخر باپ کی موت کا غم سینے سے ہلکا ہوگیا۔ مجھے احساس ہوا کہ مسجد کے صحن میں پڑے پڑے میں کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکوں گا۔ مجھے عملی زندگی میں آنا چاہیے۔ مجھے کہیں ملازمت کرنی چاہیے، تاکہ میری ماں اور بھائی فاقہ کشی کا شکار نہ ہوں اور یہ خیال میرے ذہن میں پختہ ہوگیا۔ اور ایک صبح میں نے خاموشی سے جہلم چھوڑ دیا۔ میں لاہور جانے والی بس میں سوار ہوگیا میرے پاس چند روپے

موجود تھے۔ لیکن یہ اتنے تھے کہ میں لاہور جاسکتا تھا اور وہاں دو ایک روز گزارہ کرسکتا تھا۔ لاہور پہنچ کر میں نے اس مکان کا رخ کیا جہاں میں اپنے پانچ دوستوں کے ساتھ کرائے پر رہا کرتا تھا۔ اس چھوٹے سے مکان کو ہم نے کرائے پر لیا ہوا تھا اور پانچوں مل کر تھوڑی تھوڑی رقم ادا کردیا کرتے تھے۔ میرے یہ دوست بھی لاہور اور پنڈی کے نواحی علاقوں کے رہنے والے تھے۔ کوئی گوجرانوالہ کا، کوئی سیالکوٹ کا۔ انہوں نے میرے چہرے پر موت کی سی اداسی پائی تو چونک پڑے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے تو انہوں نے اظہار غم کیا اور میری دلجوئی کرنے لگے۔ لیکن اب مجھے دلجوئی کی ضرورت نہیں تھی۔ اب تو میں عملی زندگی میں آکر اپنے چھوٹے سے خاندان کی کفالت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں اب تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا، اب مجھے ملازمت کی تلاش ہے۔ بہرحال وہ بے چارے افسوس کرنے کے علاوہ اور کیا کرسکتے تھے۔ لاہور میں میرا تعلق صرف کالج سے تھا، کالج سے باہر کی زندگی میں میرے واقف کار نہیں تھے۔ تاہم مجھے بھروسہ تھا کہ اپنی اولوالعزمی کے سہارے میں ماحول کو سازگار بنا سکوں گا اور دوسرے دن سے ہی میں نے ملازمت تلاش کرنا شروع کردی۔ میں نے ذہن سے تمام خیالات نکال دیئے تھے۔ صرف ایک خیال باقی رہنے دیا تھا وہ یہ کہ مجھے ہر قیمت پر ملازمت کرکے زندگی کے راستے تلاش کرنے ہیں اونچی نیچی بلڈنگوں میں، سرکاری و غیر سرکاری دفاتروں میں، ہر اس شخص سے ملا، جس نے ذرا بھی میری طرف توجہ دی۔ بہت سے لوگوں نے ملازمت کے بارے میں سن کر رویہ بدل لیا۔ بہت سوں نے وعدے کیے اور میں ان کے وعدوں پر وقت برباد کرنے لگا! ہر رات مایوسیوں کی رات ہوتی تھی۔ ہر صبح امیدوں کی صبح ہوتی تھی۔ دن چڑھتا، سورج ڈھلتا اور مایوسیاں گھیرنے لگتیں۔ چند روپے ختم ہوچکے تھے۔ دو تین ہفتے دوستوں کے ساتھ کھاتا رہا۔ ایک آدھ روپیہ بھی کسی سے مل جاتا، جو دفتروں کے چکر لگانے میں کرائے پر خرچ ہو جاتا۔ لیکن اس کے بعد دوستوں کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ پہلے وہ کھانے پر میرا انتظار کرتے تھے۔ میں پہنچ جاتا تو کھانا کھاتے، پھر انہوں نے جلدی کھانا شروع کردیا۔ بچا کھچا میں کھالیتا تھا۔ کسی دن ایسا بھی ہوتا کہ کھانا نہ بچتا اور مجھے بھوکا ہی سونا پڑتا۔ پھر ایسا ہوتا کہ میرے دوست آخری شو دیکھنے چلے جاتے اور مجھے مکان بند ملتا۔ بارہ بجے تک کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرتا اور جب وہ آتے تو گھر میں داخل ہوتا۔ اب انہوں نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کسی بات پر قہقہے لگا رہے ہوتے، میں پہنچتا تو خاموشی چھا جاتی اور پھر وہ اوڑھ لپیٹ کر پڑ جاتے۔

میں سب کچھ محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ان پر غصہ بھی آتا، ان کی بے اعتنائی پر رنج بھی ہوتا، لیکن میں جانتا تھا کہ حالات میرے خلاف ہیں۔ وہ بے چارے بھی کیا کرتے۔ ہاں ہر صبح میں سوچتا کہ ملازمت مل جائے تو میں ان لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کروں کہ انہیں اپنے اس رویے پر سخت شرمندگی ہو۔ لیکن میری یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ پورے تین ماہ گزر گئے۔ بالآخر میرے دوستوں نے مجھ سے معذرت کرلی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک نیا آدمی تلاش کرچکے ہیں جو ان کے ساتھ قیام کرے گا، وہ تمام کرائے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے اس لیے اب میری گنجائش نہیں ہے۔

میں نے کوئی شکوہ، کوئی گلہ نہ کیا۔ یہ بات تو انہیں بہت پہلے کہہ دینی چاہیے تھی۔ اتنے دن انہوں نے صبر کیا یہی ان کی عظمت تھی، ورنہ مجھ جیسے ناکارہ انسان کے لیے کس کے پاس جگہ ہے۔ میں خود اپنی نگاہوں سے گر گیا تھا۔ مجھے اپنی بے وقعتی کا احساس ہو گیا تھا۔ اور فٹ پاتھ کی پہلی رات میرے لئے اذیتوں کی رات تھی۔ اس رات میں کرب سے کروٹیں بدلتا رہا۔ لاہور میرا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ مجھے لاہور چھوڑ دینا چاہیے۔ پھر کہاں جاؤں؟

کراچی۔۔۔۔۔ میرے ذہن میں ابھرا۔ ہاں کراچی۔ دولت کی کان جہاں ہر شخص کے لیے جگہ موجود ہے۔ جہاں پہنچ کر پریشانی کا حل مل جاتا ہے اب کراچی ہی میری مصیبتوں کا حل تھا۔ مجھے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا۔ بلاوجہ اتنا وقت ضائع کیا۔ مجھے پہلے ہی کراچی چلا جانا چاہیے تھا۔ لاہور میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن پھر ایک اور سوال۔ کراچی تک جانے کا کرایہ کہاں سے لاؤں؟ میرے پاس تو تن کے کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ رات کو تین بجے تک یہ سوچتا رہا اور بالآخر فیصلہ کیا کہ بغیر ٹکٹ سفر کروں گا۔ ذلت و رسوائی میرے لیے اب کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ پکڑا گیا تو جیل بھیج دیا جاؤں گا، کیا ہرج ہے۔ میری شخصیت ہی کیا ہے۔ ایک بے وقعت انسان، زمین کا بوجھ۔ اور میں اس فیصلے پر اٹل ہو گیا۔

دوسرے دن صبح سڑک پر لگے ایک نلکے سے تھوڑا سا پانی پیا اور اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ پیٹ خالی تھا۔ آنکھوں کے گرد گنجان دائرے رقص کر رہے تھے۔ سرائے عالمگیر کے چھوٹے سے محلے کا کچا مکان یاد آ رہا تھا، جہاں کے در و دیوار کی خوشبو میرے جسم میں آج بھی موجود تھی۔ چنے کے کھیتوں سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو، جہلم کی گنگناتی موجیں، جو محبت کے گیت گاتی تھیں۔ دل میں شدید خواہش ابھری۔ ایک بار پھر انہیں دیکھ لوں۔ بوڑھی ماں کے ممتا بھرے ہاتھ کا لمس اپنی پشت پر محسوس کر لوں۔ ننھے بھائی کی معصوم آنکھوں میں جھانک لوں۔ لیکن کس منہ سے۔ کیا منہ لے کر ان کے سامنے جاؤں۔ میں کیا تھا۔ ایک بے حقیقت پتھر۔ اداس افلاس زدہ چہرہ۔ سوکھے ہوئے خشک ہونٹ، بکھرے ہوئے بال۔ دھنسی ہوئی آنکھیں انہیں کون سی خوشی بخش سکتی تھیں۔ بے کار۔ بے مقصد۔ جذباتی فیصلے مقدر نہیں بناتے۔ کبھی کچھ بن سکا تو ان کے سامنے جاؤں گا، ورنہ وہ مجھے بھی صبر کر لیں گے۔ اور میں اسٹیشن پہنچ گیا۔ لاہور کے خوبصورت اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا! انسانوں کا ہجوم۔ مضطرب مضطرب سا۔ ٹرینوں کا شور۔ زندگی کی گہما گہمی۔ یہ سب کون ہیں؟ انہوں نے زندگی کے راستے کیسے اپنائے ہیں۔ انہیں معاشی سکون کہاں سے ملا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں ان لوگوں میں خود کو اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ بلاشبہ مجھے اس دنیا میں جینا نہیں آتا۔ میرے اندر کوئی کمی ہے اور میں ناکارہ انسان اس کمی کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ کسی بلند جگہ کھڑا ہو کر ان سے خطاب کروں۔ ان سب کو جمع کر کے پوچھوں کہ انہوں نے یہ پرسکون زندگی کہاں سے حاصل کی ہے۔ کیا کرنا پڑتا ہے اس کے لیے؟ میں بھی اسی دنیا میں پیدا ہوا ہوں۔ میں بھی انہیں کی طرح گوشت پوست کا انسان ہوں۔ پھر وہ میری حیثیت کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ ان سب نے مجھے کیوں نظرانداز کر دیا ہے۔

لیکن میں کچھ نہ کر سکا۔ نہ جانے کب تک میں پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں بیٹھا رہا۔ ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا لیٹ جاؤں اور پھر کبھی نہ اٹھوں۔ سو تا رہوں۔ سو تا رہوں، کبھی نہ جاگوں۔ پھر خیبر میل کی گرجدار آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں کراہتا ہوا اٹھا اور کھچا کھچ بھرے ڈبوں میں اپنی جگہ تلاش کرنے لگا! کوئی جگہ نہیں تھی۔ کامیاب لوگ کامیابی سے اپنی سیٹوں پر قبضہ جما چکے تھے، ہاں فرش پر جگہ تھی۔ میں نے اسے ہی اپنا مقدر سمجھ لیا اور فرش پر دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ ٹرین نے سیٹی دی اور پلیٹ فارم چھوڑنے لگی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

عرض کر چکا ہوں کہ فن داستان گوئی مجھے نہیں آتا۔ ممکن ہے احساسات کا اظہار طویل ہو گیا ہو۔ لیکن اس سے آپ کو میری ذہنیت، میرے بھٹکنے کی وجہ ضرور معلوم ہو جائے گی۔ اس تکلیف دہ سفر کی داستان کیا لکھوں۔ دکھوں اور مصیبتوں کے جو پہاڑ مجھ پر ٹوٹے ان کا احساس کر کے آج بھی جسم میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ قسمت یاور تھی۔ بغیر ٹکٹ سفر کے جرم میں پکڑا نہ گیا اور خیبر میل نے مجھے کراچی پہنچا دیا۔ کراچی کینٹ پر اترا۔ خوفزدہ سا پریشان سا، بری حالت تھی۔ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گیٹ کی طرف بڑھا۔ ٹکٹ چیکر موجود تھا، لوگوں سے ٹکٹ لے رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا اور جب آنکھیں کھولیں تو گیٹ کے باہر تھا۔ دل نے نہ جانے کیا کیا کہا۔ میں کسی بات پر غور کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اسٹیشن کی سیڑھیاں اتر کر ایک وسیع میدان میں آ گیا۔ ٹیکسیاں، آٹو رکشہ، گھوڑا گاڑیاں ایک ہجوم۔ ایک ہنگامہ۔ تب میری نگاہ ایک طرف اٹھ گئی۔ ایک صاحب نصف درجن بچوں اور بیوی کے ساتھ ہانپتے کانپتے ایک وکٹوریہ پر سوار ہو رہے تھے۔ بے شمار سامان تھا، پھلوں کی ٹوکریاں صندوق، بستر۔ نہ جانے کیا کیا تھا۔ لیکن میری نگاہ کیلوں کے اس گچھے پر تھی جو ان کی پھلوں کی ٹوکری سے نیچے گر گیا تھا۔ وکٹوریہ آگے بڑھ گئی۔ اس مالدار شہر کے کسی باشندے نے ان کیلوں کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ زمین پر گری چیز نہیں اٹھاتے تھے، لیکن میں۔ بھوک سے بلبلاتا انسان۔ میں انہیں کیسے نظرانداز کر سکتا تھا۔ میرے لرزتے قدم آگے بڑھے۔ میرا ضمیر تو اسی وقت دم توڑ چکا تھا، جب میں نے بغیر ٹکٹ سفر کا عزم کیا تھا۔ اب میں اس کی چیخوں کو کیسے سنتا۔ میں نے کیلے اٹھا لئے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ سب میرے پیٹ میں تھے۔ یہ کراچی کا پہلا تحفہ تھا میرے لیے۔ پیٹ کے دوزخ کی آگ کسی حد تک سرد ہو گئی۔ آگے بڑھا اور اس چوک تک نکل آیا جہاں بسیں اور ٹرام کھڑی ہوتی ہے۔ چھوٹے بڑے ہوٹل۔ دوکانیں۔ لمبی تاحد نگاہ سڑک جس پر ٹرام کی پٹڑی بچھی ہوئی تھی۔ میں اس سڑک پر بڑھ گیا۔ وسیع و کشادہ عمارتیں، بلند و بالا بلڈنگیں۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ یہ وسیع شہر مجھے ضرور اپنی آغوش میں پناہ دے گا۔

جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا۔ میری آنکھیں کھلتی گئیں۔ چوڑی اور کشادہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ پھر صدر کا علاقہ آ گیا۔ جہاں کراچی کی آدھی دولت موجود ہے۔ میرا یہی اندازہ ہے۔ خوش پوش لوگوں کے ہجوم بے پناہ خریداری کرتے ہوئے، چمچماتی کاریں، بسیں رکشا ٹیکسیاں۔ میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری زندگی کا آغاز کہاں سے ہو گا؟

نہ جانے میں کہاں کہاں گھومتا پھرا۔ صدر کا علاقہ پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر میں تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ بیٹھا رہا۔ سورج ڈھل گیا۔ شام ہو گئی۔ تب میں اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔ ایک جگہ میں نے مفلوک الحال لوگوں کی لائن دیکھی۔ ان سب کا رخ ایک ہوٹل کی طرف تھا۔ نہ جانے میرے ذہن میں کیا سمائی۔ میں بھی اس لائن میں شامل ہو گیا۔ دوسرے لوگوں نے مجھے گھورا' لیکن میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ لائن آگے بڑھتی رہی اور جب کسی نے مجھ سے کہا "ابے آنکھیں تو کھول۔ سو رہا ہے کیا۔" تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں ہوٹل کے سامنے تھا۔ پتھروں کے کاؤنٹر پر دیگچیاں سجائے بیٹھے آدمی نے ایک پلیٹ میرے ہاتھ میں تھما دی جس میں شوربہ اور بوٹیاں تھیں اور پھر دو روٹیاں بھی مجھے دے دی گئیں۔

میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میرا خیال تھا اب مجھ سے پیسے طلب کئے جائیں گے۔ لیکن جب پیچھے کھڑے پٹھان نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا تو میری جان میں جان آئی۔ گویا یہاں پیسے نہیں طلب کئے جاتے۔ میں اس نعمت کو لے کر دوسرے لوگوں میں جا بیٹھا۔ دو روٹیوں نے جسم میں زندگی دوڑا دی۔ پانی پینے کے بعد میں وہاں سے اٹھ آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مفت کھانا کس خوشی میں مل رہا تھا۔ اور جب میری سمجھ میں آیا تو میرا دل خون کے آنسو رو اٹھا۔ نہ جانے کب تک میں اذیت سے تڑپتا رہا۔ وہ رات ایک فٹ پاتھ پر گزری۔ اور دوسرے دن سے میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ میرے پاس میرا سرمایہ صرف میرے تعلیمی سرٹیفکیٹ تھے' جنہیں میں احتیاط سے سینے سے لگائے ایک ایک دفتر کے چکر کاٹتا پھرا لیکن اس معاملے میں یہاں کے لوگوں کا رویہ لاہور والوں سے بھی سخت تھا۔ وہ کم از کم بات تو سن لیتے تھے۔ یہاں اگر کسی کو روک کر حال دل کہنے کی کوشش کی تو اس نے گھاس ہی نہ ڈالی۔ یہ ہوشیار لوگ میرے جیسے انسانوں سے بخوبی واقف تھے۔ دفتروں کے چپراسی دور ہی سے مجھے دیکھ کر ڈانٹ دیتے تھے۔ کچھ نہ ملا کچھ نہ ہوا۔ کراچی نے بھی مجھے مایوس کیا۔ دنیا سے میرا اعتماد اٹھ گیا۔ مذہب و ملت سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا۔ سب دولت کے بندے ہیں۔ سب حرص و ہوس کے پجاری ہیں۔ سب بلندیوں کے قدر دان ہیں کوئی کسی کا سہارا نہیں ہے۔ کسی کے پاس ہمدردی و انسیت نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے لئے جی رہا ہے۔ دولت زندگی ہے باقی سب ڈھکوسلہ ہے۔ سب بکواس ہے۔ مجھے خودکشی کر لینی چاہیے۔ لیکن خودکشی حرام ہے۔ ذہن کے کسی گوشے سے آواز ابھری۔ "کیا حرام" "کیا حلال۔ سب ڈھکوسلے ہیں۔ سب فضول باتیں ہیں۔ انسان کا مذہب صرف دولت ہے اور جب پیٹ بھر جاتے ہیں تو سجے سجائے ایوانوں میں بیٹھ کر' مرغن کھانوں کی ڈکاریں لے کر مذہب و ملت کی باتیں کی جاتی ہیں۔ انسانوں کے حقوق کے بیان جاری کئے جاتے ہیں۔ سب فراڈ ہیں۔ سب بکواس کرتے ہیں۔ انسان بے مقصد پیدا ہوا ہے' بیکار جیتا ہے اور پھر زیست کا بوجھ ہلکا کر دیتا ہے اور اس جیسے دوسرے انسان پیدا ہو جاتے ہیں۔ سلسلہ حیات یونہی چلتا ہے' چلتا رہے گا' میں موت کا انتظار کیوں کروں۔ خود آگے بڑھ کر اسے کیوں نہ پکار لوں۔ زندگی نے کیا دیا ہے جو اسے سینے سے چمٹائے رہوں۔ بیکار' بے مصرف بوجھ۔ میں نے دانت پیسے اور میرے قدم ایک طرف اٹھ گئے۔ میں جانتا تھا کہ یہ راستہ سمندر کی طرف جاتا ہے۔ میں اس سے قبل

سمندر دیکھ چکا تھا۔ کلفٹن سے کچھ آگے نیٹی جیٹی کا پل ہے اور اس کے نیچے سمندر میں چٹانیں' کائی' دلدل اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ میرے جیسے انسانوں کے لیے بہترین پناہ گاہ۔ ہاں سمندر کی آغوش وسیع ہے۔ سمندر زمین سے زیادہ رحمدل ہے۔ یہ زمین انسان کو برہنہ کر دیتی ہے۔ اس کی بے بسی کو زمانے کی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتی ہے' جبکہ سمندر کا ظرف بلند ہے۔ وہ ہزار ہا مظلوموں کے لیے اپنی ٹھنڈی آغوش وا کر دیتا ہے۔ ان کے راز اپنے سینے میں چھپا لیتا ہے۔ سمندر عظیم ہے۔ ہاں سمندر عظیم ہے۔ میں اسی عظمت کی آغوش میں پناہ لوں گا۔ یہ رواں دواں زندگی میرے لیے نہیں ہے۔ جامع کلاتھ مارکیٹ میں خریداروں کا ہجوم' رنگ برنگی دوکانیں' ٹراموں کی کھڑکھڑاہٹ۔ بسوں کی دوڑیں۔ رکشاؤں کا شور' لائٹ ہاؤس کے سامنے ٹکٹ حاصل کرنے والوں کی لمبی قطاریں' ڈینسو ہال کی دوکانوں میں لاکھوں اور کروڑوں کے وارے نیارے۔ حبیب اسکوائر کی بلند و بالا عمارت' لکشمی بلڈنگ کے سرخ پتھر اور اس کے آگے میری منزل۔ ہاں یہی تو میری منزل تھی۔ جو کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا' اس میں میری گنجائش نہیں تھی۔ بس ——— یہ سمندری لہریں میری مونس و غمخوار ہیں۔ وہ مجھے منہ اٹھائے دیکھ رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں محبت ہے۔ ان کے بازو پھیلے ہوئے ہیں۔ مجھے معاف کر دینا ماں۔ میرے ملک کو میری ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارا سہارا نہیں بن سکا۔ رحمت کو تعلیم مت دلانا۔ تعلیم انسان کو عقل بخش دیتی ہے اور جب انسان کو عقل آتی ہے تو خودکشی کر لیتا ہے۔ میرا باپ کسان تھا بہت سیدھا تھا وہ۔ مجھے بھی کسان بنا دیتا تو اس وقت میں ——— ہل چلانے کے بعد تھکن سے چور چارپائی پر بے سدھ پڑا ہوتا' یہاں کھڑا موت کو گلے لگانے کا آرزومند نہ ہوتا۔ رحمت کو تعلیم مت دلانا ماں۔ ورنہ وہ بھی جوان ہو کر خودکشی کر لے گا اور تمہارا یہ سہارا بھی چھن جائے گا۔

میرے پنجے پل کی ریلنگ سے لپٹے ہوئے تھے اور میرے گالوں کو آنسوؤں کی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ طویل کہانی ختم ہوا چاہتی تھی جس نے سرائے عالمگیر میں جنم لیا تھا جہلم کی لہریں۔ ان لہروں پر سفید چمکدار مسجد کا عکس' چنوں کے کھیت کی سوندھی سوندھی خوشبو' اسکول کی شرارتیں' کالج کی رنگینیاں لاکھوں قصے' لاکھوں فسانے' آج ان کا اختتام تھا۔ وقت کے دھارے گواہ رہنا۔ میں نے جینے کی ——— کوشش کی تھی۔ لیکن زندگی نے مجھے اپنانے سے انکار کر دیا۔ ہاں زندگی سے مایوس ہو کر میں اس کا دوسرا رخ اپنا رہا ہوں۔ میں نے دل کڑا کیا۔ آنکھیں بند کیں۔ اور میرا لرزتا ہوا جسم ابھرا۔ اور اسی وقت پیچھے سے ایک بھاری آواز آئی۔

"نواز ———"

میں چونک پڑا۔ کون ہے یہ۔ کس نے مجھے پکارا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اندھیرے میں ایک بھدے' موٹے جسم کا سایہ نظر آیا۔ اس سے قبل کہ میں اس سے اس کے بارے میں پوچھتا وہ میرے قریب بڑھ آیا۔

"مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ لیکن میں آبکاری والوں کی نگاہوں میں آ گیا ہوں۔ کچھ لوگ میرا پیچھا کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں چکر دے کر آیا ہوں۔ لو یہ سنبھالو۔ شاہ

جی ٹرک میں تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ مگر اب تم وہاں نہیں جاؤ گے۔ بلکہ ریل سے سفر کرو گے۔ لیکن ہے شاہ جی بھی آبکاری والوں کی نگاہ میں ہو۔ اس کے ساتھ جانا خطرناک ہے۔" اس نے میرے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھما دیا۔ کافی وزنی سوٹ کیس تھا۔ میں اسے سنبھال نہ سکا اور زمین پر رکھ دیا۔ میرے مقابل نے پھر مجھے نہ بولنے دیا۔ اور ایک پرس میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ "یہ رکھو اس میں رقم ہے۔ راستے میں کام آئے گی۔ اور اس میں پتہ بھی موجود ہے۔ پشاور پہنچ کر سب ٹھیک ہو جائے گا اپنا محنتانہ لے لینا۔"

پرس بھی میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہوں موٹے جسم والا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میں کبھی پرس کو دیکھتا' کبھی قدموں میں رکھے سوٹ کیس کو اور کبھی تاریکی میں اس موٹے آدمی کو تلاش کرنے لگتا جو نہ جانے کہاں ہو گیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی اور پھر میرے پھیپھڑوں کی گہرائیوں سے ایک قہقہہ ابل پڑا۔ ڈر گئی نا زندگی میرے عزم سے۔ احساس ہو گیا نہ اسے بھی میرا۔ موت کی رقابت میں آ کر اسے میرا بھی خیال کرنا پڑا۔ میں نے پرس کھول کر دیکھا۔ سو سو کے چند نوٹ' دس کے کافی نوٹ موجود تھے۔ ایک سفید رنگ کا پرچا بھی تھا جسے میں تاریکی میں نہیں پڑھ سکتا تھا۔

کافی ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ سوٹ کیس میں کچھ بھی ہو مجھے کیا۔ میں تو مردہ انسان ہوں۔ پھر میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور واپس پلٹ پڑا۔ سب سے پہلے میں نے ٹلور کے ایک ہوٹل میں قدم رکھا۔ گرم کھانوں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ لوگ کھانے اور چائے پینے میں مصروف تھے میں نے بھی ایک کرسی سنبھال لی۔ سوٹ کیس قدموں کے پاس رکھ لیا اور بیرے کو بلا کر کھانے کا آرڈر دیا۔ کافی رقم تھی۔ بہت دن سے بھوکا تھا۔ اپنی پسند کے کھانے منگوائے' خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد چائے پی۔ چائے کی دو پیالیاں پینے کے بعد میں نے پرس سے پرچہ نکالا لیا۔ اس پر ایک پتہ لکھا ہوا تھا۔

"شاہ زورین۔ ٹیپو سلطان روڈ گولڈن ہاؤس۔ پشاور۔"

پشاور۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ میرے دل میں درجنوں خیالات تھے سوٹ کیس میں کیا ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس نے مجھے میرے نام سے پکارا تھا۔ لیکن۔ دنیا میں صرف میرا نام ہی تو نواز نہیں ہے۔ کسی اور نواز کے دھوکے میں مجھے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اب میں کیا کروں؟ سوٹ کیس کہیں پھینک دوں اور رقم لے کر فرار ہو جاؤں۔ مگر سوٹ کیس میں ہے کیا؟" میں نے سوٹ کیس پر نگاہ ڈالی۔ چمڑے کا شاندار سوٹ کیس تھا۔ سامنے کے رخ پر تالے لگے ہوئے تھے جن کی چابی میرے پاس نہیں تھی۔ تالوں پر سرخ لاخ کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ گویا مہریں توڑ کر ہی تالا ——— کھولا جا سکتا تھا۔

ہوٹل کے بیرے کو میں نے ایک اور چائے کا آرڈر دے دیا۔ میں اس سلسلے میں فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ بے وقوف نہیں تھا۔ کسی حد تک اندازہ ہو رہا تھا کہ کیا چکر ہے۔ یہ کراچی ہے۔ یہاں بڑے بڑے آرٹسٹ موجود ہیں۔ اور میں کیا ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ دنیا مجھے جو کچھ بنا

زندگی نے مجھے موت کے منہ سے گھسیٹا ہے۔ وہ مجھے اپنی پسند کا رخ دینا چاہتی ہے۔ کیوں نہ اس سے تعاون کروں۔ میں نے تو کوئی خواہش نہیں کی تھی۔ میں نے تو اچھا انسان بننے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دنیا مجھے کسی اور ہی روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔ جب یہی روپ میرا مقدر ہے تو کیوں نہ اسے ہی اپنا لوں۔ اور فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ میں نے طے کر لیا کہ میں سوٹ کیس اسی طرح لے کر پشاور جاؤں گا۔ اور اسے اس کے مالک تک پہنچا دوں گا۔ اس سے کہوں گا کہ مجھے کسی اور کے دھوکے میں یہ کام سونپا گیا ہے۔ لیکن اگر وہ پسند کرے تو میں خلوص دل سے یہ سب کچھ کرنے پر راضی ہوں۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں اٹھ گیا۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر بل ادا کر کے میں باہر نکل آیا اور اب میرے قدم ——— اسٹیشن کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہاں سے میں نے ٹرین کے اوقات معلوم کئے آج رات میں پشاور کے لیے روانہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کل صبح ٹرین مل سکتی تھی۔ چنانچہ میں اسٹیشن سے نکل آیا۔ دولت میری جیب میں تھی' لیکن ایک رات کے لیے میں نے کسی ہوٹل کا رخ نہیں کیا اور حسب معمول ایک فٹ پاتھ پر رات گزاری۔ سوٹ کیس سرہانے رکھ لیا۔ اور یہ تعجب ہی کی بات تھی کہ دوسری صبح وہ مجھے سرہانے ہی موجود ملا۔ شاید کسی آرٹسٹ کا اس فٹ پاتھ پر گزر نہیں ہوا تھا۔ دوسرے دن صبح میں نے ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا اور بازار کھلنے کے انتظار میں ہوٹل میں ہی بیٹھا رہا۔ پھر بازار کھلنے پر میں نے ایک ریڈی میڈ شاپ سے اپنے لیے ایک پتلوان اور بشرٹ خریدا۔ چند دوسری چیزیں اور انہیں لے کر برنس روڈ کی طرف چل پڑا۔ جہاں ایک سیلون میں داڑھی بنوائی۔ بال ترشوائے اور انسانی شکل میں آ گیا۔ وہیں حمام میں غسل کر کے میں نے لباس تبدیل کر لیا اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن چل پڑا۔ سیکنڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں سفر کرتے ہوئے میری ذہنی حالت عجیب تھی۔ میں تقدیر پر ہنس رہا تھا۔

کیا بننا چاہتا تھا' کیا بن گیا۔ لیکن جو کچھ بن گیا تھا' اس پر افسوس نہیں تھا۔ سوٹ کیس میں نے لاپرواہی سے ایک طرف رکھ دیا تھا تاکہ کوئی اس پر غور نہ کر سکے۔ سفر جاری رہا۔ دن گزارا' رات گزری اور لاہور آ گیا۔ میں نے دل پر جبر کیا' نہ جانے کیسے کیسے جتن کر کے میں نے خود کو لاہور میں اجنبی محسوس کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ان یادوں کو کھرچنے کے لیے سخت محنت کی جو لاہور سے وابستہ تھیں۔ لاہور گزر گیا۔ لیکن اب ہر اسٹیشن میرے لیے وبال جان بنا ہوا تھا۔ میں اس پورے علاقے سے لگاؤ رکھتا تھا اور کیا بتاؤں کہ لاہور کے بعد کا سفر میرے اوپر کیسا گزرا۔ میرے دل پر کیسے کیسے زخم تھے۔ آج بھی ان کی یاد دل کو کھرچنے لگتی ہے۔ بہرحال میں اس سفر کی تفصیل نہ بیان کر سکوں گا۔ پشاور کے اسٹیشن پر میں سوٹ کیس ہاتھ میں لئے اتر گیا۔ تندرست و توانا لوگ۔ جانے پہچانے چہرے۔ میں نے تانگہ کیا اور چل پڑا۔ پرس کی حالت کافی مضبوط تھی۔ چنانچہ میں نے تانگے والے سے کسی ہوٹل چلنے کے لیے کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد تانگہ "اسپین غر" کے سامنے رک گیا۔

مجھے ہوٹلوں کی قسم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسپین غر کی پہلی منزل کے کمرہ نمبر دس میں'

میں نے قیام کیا۔ شام ہو چکی تھی۔ میں ایک معزز انسان کے طور طریقوں سے واقف تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ حالات نے میری شخصیت مسخ کر دی تھی۔ ہوٹل کے لوگوں کو ذرا بھی شک نہیں ہوا کہ میں کوئی معزز گاہک نہیں ہوں۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر چائے پی اور پھر آرام کرنے لیٹ گیا۔ نرم و گداز بستر پر لیٹے ہوئے میرے ذہن میں پھر گزرے ہوئے واقعات کی فلم چلنے لگی۔ میں اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ میری ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ چنانچہ میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اور اس کوشش میں کامیابی ہو گئی۔

ایسا سویا کہ رات کا کھانا بھی گول ہو گیا۔ رات کے کسی پہر میری آنکھ کھلی، چاروں طرف سکوت طاری تھا۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا البتہ بھوک لگ رہی تھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بہت وقت گزر چکا ہے۔ لیکن اس وقت کھانے کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں بھی میں بھوک برداشت کرنے کا عادی ہو گیا تھا اس لیے کوئی خاص تکلیف نہیں محسوس ہوئی اور میں اطمینان سے سو گیا۔ دوسری صبح غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا اور پھر اخبار پڑھتا رہا۔ گیارہ بجے میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور نیچے اتر آیا۔ ایک آٹو رکشا روکا اور اس میں بیٹھ کر ٹیپو سلطان روڈ چل پڑا۔ فاصلہ طویل نہیں تھا۔ میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات جنم لے رہے تھے۔ شاہ زورین کی شخصیت، اس کے رویئے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ تب رکشہ والے کی آواز سنائی دی۔

"کدھر جانا ہے بابو؟"

"ٹیپو سلطان روڈ یہی ہے؟"

"ہاں۔"

"بس یہیں روک دو۔" میں نے کہا اور رکشہ رک گیا۔ میں نے اتر کر پیسے دیئے اور پھر پیدل چل پڑا۔ گولڈن ہاؤس۔ کیا ہے یہ؟ میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ بس دوکانوں کے بورڈ پڑھ رہا تھا۔ اور پھر ایک چھوٹی سی دوکان پر مجھے گولڈن ہاؤس کا بورڈ نظر آیا۔ ایک بھاری جسامت اور بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی وہاں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ہارڈویر کا کچھ سامان، رسی، کیلیں، مکان صاف کرنے کی جھاڑو برش اور ایسی ہی دوسری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

اس گولڈن ہاؤس کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ بہرحال میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے سوٹ کیس دوکان کے ایک خالی حصے میں رکھا۔ دوکاندار مجھے گھور رہا تھا۔

"میرا نام نواز ہے۔" میں نے کہا اور وہ اچھل پڑا۔ اس نے غور سے سوٹ کیس دیکھا اور پھر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اشارے سے ایک لڑکے کو بلایا اور اسے دوکان پر بٹھا کر مجھے سوٹ کیس اٹھانے کا اشارہ کیا اور پھر ایک لمبے راستے پر چل پڑا۔ میں وزنی سوٹ کیس لیے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور میرا ساتھی پلٹ پلٹ کر مجھے گھور رہا تھا۔ پھر وہ ایک خوبصورت سے مکان کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ اس نے دستک دی۔ پہلے دو بار، پھر تین بار۔ اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک تومند آدمی تھا۔ اس نے موٹے کی شکل دیکھی اور ایک طرف ہٹ گیا۔ موٹا مجھے لئے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ اندر سے بھی یہ مکان کافی خوبصورت تھا۔ پھر ایک راہداری سے گزر کر

ایک اور دروازے میں داخل ہو گئے۔ لیکن دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی میری ناک سے عجیب سی بو ٹکرائی۔ میں نے نیم تاریک ہال میں نگاہیں دوڑائیں۔ دس بارہ آدمی بیٹھے ہوئے تھے، ان میں چند مقامی تھے اور باقی سفید نسل کے ہپپی! بوسیدہ لباس۔ جھاڑ جھنکار بال بکھری ہوئی ڈاڑھیاں وہ مختلف مشاغل میں مصروف تھے۔ لیکن چرس کی بو کو میں صاف پہچان گیا۔ یہ ساقی خانہ تھا۔

اور پھر ہم ایک اور دروازے کے سامنے رک گئے۔ موٹے آدمی نے مقامی زبان میں کچھ کہا اور اندر سے اس کا جواب مل گیا۔ چنانچہ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ جس میں ایک طرف صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ قالین بچھا ہوا تھا۔ دوسری سمت ایک لمبی میز پڑی تھی جس پر دو ٹیلی فون رکھے ہوئے تھے۔ میز کے پیچھے ایک اور قوی ہیکل آدمی شلوار قمیض میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بہت بڑا تھا۔ نوکیلی مونچھیں بے حد گھنی تھیں اور آنکھیں خون کی طرح تھیں۔

"جاؤ۔" اس نے موٹے کی طرف اشارہ کیا۔ اور موٹا گردن جھکائے باہر نکل گیا۔

"دروازہ بند کر دو۔" اس نے دوسرا حکم مجھے دیا اور میں نے سعادت مندی سے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ "آؤ" اس نے پھر کہا اور میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ قوی ہیکل آدمی مجھے بری طرح گھور رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔ اور سوٹ کیس اٹھا کر میز پر رکھ دو۔" میں نے اس کے اس حکم کی بھی تعمیل کی تھی۔

"یہ پشاور ہے۔ کراچی نہیں ہے۔" اس نے خطرناک لہجے میں کہا اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ "اور میرا نام شاہ زورین ہے۔" اس نے پھر کہا۔

"مجھے آپ کے پاس ہی بھیجا گیا ہے۔"

"باہر کتنے آدمی ہیں؟"

"کہاں۔ ہال میں؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"بکواس کی تو آنتیں نکال دوں گا۔" اس نے نیفے میں ہاتھ ڈال کر ایک لمبا چاقو نکال لیا۔ بٹن والا چاقو پلک جھپکنے میں کھل گیا اور اس کی چمک میری نگاہوں کو خیرہ کرنے لگی۔

"مَیں۔ میں سمجھ نہیں سکا شاہ زورین۔"

"تم سی آئی ڈی کے آدمی ہو؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"آبکاری سے تعلق رکھتے ہو؟"

"بالکل نہیں۔"

"مادر نجطا ـــــ تم نواز نہیں ہو۔" اس نے غراتے ہوئے کہا۔ "مجھے کراچی سے ٹیلی فون ملا ہے کہ مال غلط ہاتھوں میں چلا گیا ہے اور تم اسے لے کر شرافت سے یہاں چلے آئے ہو۔ ضرور تم نے حکومت سے بات کی ہے مگر ـــــ میں شاہ زورین ہوں۔ سمجھے یہاں میری حکومت ہے کون ہے جو مجھ سے آنکھ ملا سکے؟" اس نے چاقو میز میں گاڑ دیا۔ اور مجھے خونخوار نگاہوں سے

گھورنے لگا۔ میں بتاچکا ہوں کہ افلاس اور پریشانیوں نے میری بری حالت کردی تھی۔ میری شخصیت کچھ بھی نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن میرے باپ کی چوڑی کلائیاں پورے قصبے میں مشہور تھیں۔ اس کے مضبوط بازو بگڑے ہوئے بیل کو دو منٹ میں ٹھیک کردیتے تھے۔ چنانچہ باپ سے ورثے میں مجھے بھی کچھ ملا تھا۔ میرا ڈیل ڈول بھی کچھ کم نہیں ہے اور اس افلاس کے باوجود میری رگوں میں جوش مارتا ہوا خون تھا۔ شاہ زورین نے مجھے گالی دی تھی۔ جسے میں برداشت نہ کرسکا۔ دوسرے لمحے میں نے کرسی کو ٹھوکر ماری اور کھڑا ہوگیا۔

"تم نے مجھے گالی دی ہے شاہ زورین۔ میری شرافت کا یہ بدلہ دیا ہے۔ اٹھو۔ تمہیں اس گالی کا حساب چکانا ہوگا۔ اٹھو۔ دروازہ بند ہے۔ میں تمہیں کتے کی موت ماروں گا۔ اٹھو نامرد میری شکل کیا دیکھ رہے ہو۔" میں نے اس کی میز میں ٹھوکر رسید کردی۔ لیکن خلاف توقع شاہ زورین کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں نرمی آگئی پھر اس نے چاقو میز سے نکالا۔ اسے بند کرکے نیفے میں رکھ لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"بیٹھ جا جوان۔ بیٹھ جا۔ تو غلط آدمی نہیں ہوسکتا۔ میں نے تجھے گالی دی ہے۔ تو مجھے گالی دے کر حساب برابر کرلے۔ مگر تو نواز نہیں ہے۔"

"ہاں۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ لیکن میرا نام نواز ہی ہے۔ میرا پورا نام راجہ نواز اصغر ہے۔"

"مگر میرے آدمی کو دھوکہ کیسے ہوگیا؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں پل پر کھڑا تھا کہ تمہارے آدمی نے رات کی تاریکی میں مجھے میرے نام سے پکارا اور یہ سوٹ کیس میرے ہاتھ میں دے کر پرس بھی دے دیا' جس میں تمہارا پتہ اور نوٹ تھے۔"

"مگر تم اتنا شریف کیوں نکلا۔ تم کہیں اور بھی جاسکتا تھا؟" شاہ زورین نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ میں ایک بیکار انسان ہوں۔ ملازمت کی تلاش میں ناکام رہا ہوں۔ زندگی سے بیزار تھا اور خودکشی کرنے گیا تھا۔ میں نے یہی کام غنیمت سمجھا کیونکہ مجھے معاوضہ کی اطلاع بھی دی گئی تھی۔"

"تو دلیر آدمی ہے یار۔ تیری بات پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ شاہ زورین نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر تجھے بہت غلط اطلاعات مل گئیں ہیں۔ تجھ سے ہمیں نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔"

"میں تمہیں بھروسہ دلانے کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

"میرے آدمی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ مال غلط آدمی کے پاس پہنچ گیا ہے۔ میں پریشان تھا۔ ایک منٹ۔" اس نے کہا اور پھر اس نے چاقو دوبارہ نکال لیا۔ چاقو سے اس نے سوٹ کیس پر لگی ہوئی سیل توڑی۔ پھر میز کی دراز سے چابیاں نکال کر تالے کھولے اور پھر سوٹ کیس کھول دیا۔

میں اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ سوٹ کیس میں سبز پتے چنے ہوئے تھے جن میں ایک عجیب قسم کی مہک تھی۔ شاہ زورین پتے ہٹانے لگا۔ بہت سے پتے ہٹ جانے کے بعد نیچے سے کوکین برآمد ہوئی۔ کافی مقدار میں تھی۔ پتے شاید اس کو بو چھپانے کے لیے استعمال کئے گئے تھے اور کسی خاص قسم کے تھے۔ شاہ زورین کوکین دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم نے ایمانداری سے کام کیا ہے۔ تمہیں معاوضہ ضرور ملے گا۔ یہاں کب پہنچا تھا؟"

"کل رات۔"

"کہاں ٹھہرا ہے؟"

"اسپین غر میں۔"

"تمہارا سامان وہاں ہوگا؟"

"میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تب ٹھیک ہے دوست۔ تم ہمارے کام کے معلوم ہوتے ہو۔ پڑھے لکھے ہو؟"

"ہاں۔"

"کتنے؟"

"بی اے ہوں۔" میں نے جواب دیا اور شاہ زورین گردن ہلانے لگا

"یہ بہت اچھی بات ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اس کام میں ضروری ہیں۔ میں تمہارے لیے بات کروں گا۔" اس نے میز کی دراز میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا اور پھر اس نے نوٹوں کی کافی بڑھی تعداد نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ معاوضہ ہے۔ لیکن تمہیں ایک ہفتے تک ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔ دیکھو' ہمارا کام ایسا ہے کہ ہم فوراً کسی پر بھروسہ نہیں کرسکتے۔ جب ہمیں تم پر اعتماد ہوجائے گا تب تم آزاد ہوگے۔"

میں خاموشی سے نوٹ تھامے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ آزادی کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میں تو زندگی سے ہی آزاد ہونے جارہا تھا۔ اب جو کچھ بھی مل رہا تھا مجھے خوشی سے قبول کرلینا چاہیے تھا۔ چنانچہ میں نے گردن ہلادی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر گھمایا اور دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے کے بعد بولا۔ "عالم گل۔ گاڑی بھیج دو۔ ایک مہمان آرہا ہے۔" اور پھر اس نے فون رکھ دیا۔ "کیا خاطر کروں تمہاری چائے پیو گے؟"

"پلادو شاہ زورین۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ میں جس لائن میں آگیا تھا' اب اسی کے لوگوں کی سی زندگی گزارنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ چائے آگئی اور ہم چائے ہی پی رہے تھے کہ ایک آدمی نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ شاہ زورین نے اسے اندر بلالیا۔ بگڑی ہوئی شکل کا ایک مضبوط آدمی تھا۔

”عالم گل۔ مہمان کو لے جاؤ۔ اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ تکلیف نہ ہو۔ لیکن اگر برائی کرے تو گولی ماری جاسکتی ہے۔“ عالم گل نے گردن ہلادی۔ تب شاہ زورین نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا بھائی۔ جاؤ۔ آرام کرو۔ ہم بہت جلدی تم سے ملاقات کرے گا۔“ اور میں عالم گل کے ساتھ باہر نکل آیا۔ عمارت کے باہر ایک وین کھڑی تھی جو چاروں طرف سے بند تھی۔ عالم گل نے میرے لیے پچھلے حصے کا دروازہ کھول دیا اور پھر اسے باہر سے بند کرکے خود ڈرائیونگ سیٹ پر جابیٹھا۔ وین اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی اور میں جیب میں رکھے نوٹوں کو گننے لگا۔ ڈھائی ہزار تھے۔ بہت کافی رقم تھی۔ کس سلسلے میں حاصل ہوئی تھی' اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے ذہن سے گناہ و ثواب مٹ گیا تھا۔ بس اس دنیا میں جس طرح جیا جائے جی لو۔ اور اگر ضمیر کی آواز طاقتور ہو تو پھر خودکشی کرلو۔ چنانچہ میں نے خود کو بدل دیا۔ اب مجھے کسی چیز سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں آرام سے نرم سیٹ پر بیٹھا سفر کرتا رہا۔ گاڑی تقریباً ایک گھنٹے دوڑتی رہی تھی۔ اس کی رفتار بھی کافی تیز تھی' جس کا مطلب تھا کہ اس نے کافی سفر کیا ہے۔ پھر وہ رک گئی۔ عالم گل نے دروازہ کھولا اور مجھ سے نیچے اترنے کو کہا۔ نیچے اتر کر میں نے چاروں طرف دیکھا بوسیدہ کھنڈر تھے۔ اندرونی حصہ مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کونسی جگہ تھی۔ عالم گل کے اشارے پر میں اندر کی سمت چل پڑا۔ اور پھر سیڑھیوں سے گزر کر میں کھنڈر نما عمارت میں داخل ہوگیا۔ سیڑھیوں کے دوسری طرف ایک کشادہ اور بلند و بالا چھت کا ہال تھا۔ اور اس ہال میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ میں نے انہیں حیرت سے دیکھا لمبے لمبے سنہرے بال' بکھری ہوئی ڈاڑھیاں۔ پھٹے ہوئے کپڑے۔ سوکھے مدقوق جسم' چہروں پر ویرانی۔ عجیب عجیب لباس' کوئی پتلون پہنے۔ کوئی شلوار کے اوپر خوبصورت کوٹ پہنے۔ کسی کے جسم پر صرف نیکر۔ اور اوپری جسم برہنہ۔ کوئی پائجامہ پہنے' ایک چیز ان سب میں مشترک تھی۔ وہ یہ کہ وہ سب لمبے لمبے پڑے تھے' بے سدھ بے حال ایک اوندھے پڑے ہوئے شخص کے قریب میں نے اس کی کمر پر ٹانگیں رکھے ہوئے ایک شخص کو دیکھا لیکن اس کے سینے پر گداز ابھار دیکھ کر میں چونک پڑا۔ وہ عورت تھی۔ ہاں----- گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ ہونٹ ابھرے ہوئے اور دلکش تھے۔ بڑی معصوم نظر آرہی تھی۔ گویا ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ میں نے طائرانہ نگاہ ہال میں دوڑائی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مردوں اور عورتوں کی تعداد تقریباً یکساں ہے۔ عالم گل سیدھا جارہا تھا اس لیے میرے قدم نہ رکے۔ میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ باہر سے ویران نظر آنے والے یہ کھنڈر اندر سے بہت عمدہ اور قابل رہائش تھے۔ مجھے ایک خوبصورت کمرے میں پہنچادیا گیا۔ جہاں تعیشات کا تمام سامان موجود تھا عمدہ فرنیچر' اعلیٰ قالین' شاندار مسہری۔ ڈائننگ ٹیبل۔ ایک طرف فرج بھی موجود تھا۔ کمرہ بھی ایرکنڈیشنڈ معلوم ہوتا تھا۔

”آرام کرو صاب۔ جس چیز کی ضرورت ہو۔ یہ گھنٹی بجاؤ اور نوکر کو بول دو۔۔“ عالم گل نے کھڑی اردو میں مجھ سے کہا۔ اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں مسہری پر بیٹھ گیا' جوتے اتار دیئے اور پھر آرام سے لیٹ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے دل سے اس ماحول کی وحشت نکل

جائے۔ میں خود کو یہاں ضم کرلوں۔ اگر یہ لوگ مجھے اپنے ساتھ شریک کرلیں تو اعلیٰ پیمانے پر چرس اسمگلنگ کروں۔ ہاں اب مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی' حالانکہ کچھ عرصہ قبل مجھے اسمگلروں سے سخت نفرت تھی۔ میں اسمگلنگ کے الزام میں گرفتار لوگوں کی تصویریں اخبارات میں دیکھ کر نفرت سے ان پر تھوک دیتا تھا یہ لوگ ملک کے ناسور ہیں۔ یہ اپنی زندگی کے لیے لاکھوں زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ میں سوچتا تھا' لیکن آج مجھے ان بے بس انسانوں پر ترس آرہا تھا۔ ممکن ہے میری طرح انہوں نے اچھی زندگی گزارنے کی کوشش کی ہو اور نہ کرسکے ہوں۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ خوب گہرائی میں ٹٹولا۔ تب میرے دل سے آواز ابھری۔

”تجھے صرف اپنی زندگی پر حق ہے۔ اسے لٹادے' یا سڑکوں پر لاڈال' بھیک مانگ اور بھیک بھی نہ ملے تو موت کی نیند سوجا۔ منشیات کی اسمگلنگ کرکے لاکھوں زندگیوں سے کھیلنے کا حق تجھے کس نے دیا ہے۔ ایک اپنی زندگی کے لیے اتنی زندگیاں برباد کرکے تو بھیانک جرم کرے گا۔ اتنا خودپرست نہ بن۔ اتنا ظالم نہ بن۔ یہ تیرا ملک ہے۔ یہ تیری سرزمین ہے۔ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو تیرے خمیر میں رچی ہوئی ہے۔ تو اس خوشبو سے غداری نہ کر۔ تو اپنے بچپن کے خوشگوار لمحات نہ بھلا۔ نہ جانے کتنے بچے ابھی اس خوشبو کے طلب گار ہیں' اسے متعفن نہ کر۔“ اور ضمیر کی کشمکش نے مجھے بے چین کردیا۔ پھر کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کس طرح زندگی گزاروں؟ اور نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں' باہر ہال میں پڑے ہوئے لوگ گھوم گئے۔ میرے ذہن میں ایک چھناکہ ہوا۔

اس سے قبل بھی ان لوگوں کو دیکھ چکا تھا' سڑکوں پر' بازاروں میں گھومتے ہوئے۔ پھٹے ہوئے لباس۔ مست۔ مگن۔ میں نے کبھی خاص طور سے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ ان کی زندگی کیسی ہے؟ یہ کونسی دنیا کے لوگ ہیں؟ ان کا نظریہ حیات کیا ہے؟ اور اچانک میرے دل میں بہت سے شرارے ابھرے۔ بلک دشمن زندگی سے تو یہ زندگی ہی بہتر ہے۔ کیوں نہ میں یہی زندگی اپنالوں۔ ان کے انداز میں بے حس نہ بن جاؤں۔ ان کی طرح دنیا سے لاپرواہ نہ ہو جاؤں۔ ان کی طرح اپنی شخصیت مضحکہ خیز نہ بنالوں۔ لیکن ان کے انداز میں دنیا ضرور دیکھوں۔ ہاں وطن سے باہر نکل کر قسمت آزمائی کروں۔ اور یہ خیال پچھلے تمام خیالوں سے زیادہ مضبوطی سے میرے دل میں جم گیا۔ اس کے بعد کا وقت میں نے اسی سوچ میں گزارا۔ میرے ذہن کے بند سوتے کھلتے گئے۔ عرصہ دراز کی جمی ہوئی برف پگھلنے لگی۔ میں نے اپنی شخصیت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے اپنی صلاحیتوں کو جانچا اور پھر میں اپنے ذہن میں منصوبے بنانے لگا۔ یہ منصوبے میرے تمام منصوبوں سے جامع تھے۔ یہ سب کچھ میرے قبضہ قدرت میں تھا۔ ہاں یہ سب کچھ میرے بس میں تھا اور جب میرے دل میں یہ بات جم گئی تو میں نے اپنے آپ کا۔ اس وقت کے ماحول کا جائزہ لیا۔

میں خطرناک لوگوں کے درمیان تھا۔ ان کے کچھ راز میرے علم میں آگئے تھے۔ وہ مجھے آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ہاں میں انہیں بے وقوف بنا سکتا تھا۔ انہیں احمق بنا کر اپنا کام نکال سکتا تھا۔ بہرحال میں ایک باصلاحیت اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا اور میرے دل میں خواہشات رینگ آئیں۔ اب تک میں نے صرف اندھیرے دیکھے تھے۔ لیکن اب میرے ذہن میں اجالا پھیل گیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وطن سے نکل کر میں کچھ حاصل کرلوں گا۔

رات ہو گئی۔ میں نے کسی کو بلا کر کچھ طلب نہیں کیا تھا۔ رات کو میرے لیے کھانا آگیا۔ لذیذ قسم کا بھنا ہوا گوشت' پنیر کچھ ترکاریاں اور تندوری روٹیاں تھیں۔ بے حد لذیذ کھانا تھا۔ میں نے کھالیا۔ اور پھر قہوہ پی کر فارغ ہی ہوا تھا کہ عالم گل آگیا۔ اس نے سلام کیا اور پھر بے تکلفی سے بولا۔

"او نوازا۔ بھائی صاحب' تم ہمارا قیدی نہیں ہے۔ ہمارا بھائی ہے۔ گھومو پھرو۔ سیرو تفریح کرو۔ شاہ زورین نے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے۔ کہ تمہیں تکلیف نہ ہو۔ آؤ۔ باہر چلو۔ دیکھو ان خدائی خواروں کو۔ یہ چرس پی کر کیسا دل پشوری کرتا ہے۔" عالم گل ہنسنے لگا اور میں بھی مسکراتا ہوا اس کے ساتھ نکل آیا۔ باہر قدم رکھتے ہی مجھے نرسنگھے کی آواز سنائی دی اور پھر کسی ساز کے تار چھڑ گئے۔ نرسنگھے کی دوسری آواز سنائی دی اور ہم دونوں اسی ہال میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے گزر کر دہاں تک آئے تھے۔ ہال میں کچھ اور ہستیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ وہ سب ہوش و حواس میں تھے جو دن میں بے حس اور مردہ پڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان مردوں میں جان پڑ گئی ہو۔ سب کے ویران چہروں پر خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ ان میں چند مقامی آدمی بھی شامل تھے جو انہیں چرس اور دوسری نشہ آور اشیاء سپلائی کر رہے تھے۔ لمبی لمبی ٹونٹیاں۔ چھوٹی چلمیں' بھرے ہوئے سگریٹ اور نہ جانے کیا کیا۔ عالم گل میرے ساتھ ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اور اسی وقت ایک مقامی آدمی نے دو اسٹول لاکر ہمارے پیچھے رکھ دیئے۔

ہال میں چرس کا دھواں گھٹنے لگا۔ جس کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ "شوق کرو گے؟" عالم گل نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کی سیاہی پر غور کیا۔ اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی چرس کا شوقین ہے۔ بہرحال میں نے معذرت کرلی اور اس نے ایک سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دبالیا۔ ہال کا منظر عجیب تھا۔ یہ سب غول بیابانی سے معلوم ہو رہے تھے۔ لمبے لمبے بے ترتیب الجھے ہوئے بال۔ پھٹے چیتھڑے کپڑے' مرد' عورتیں' نشے میں سرشار ٹانگیں پھیلائے ہوئے اوندھے سیدھے۔ دم لگا رہے تھے۔ مختلف زبانیں مختلف انداز۔ ان میں جرمن بھی تھے۔ فرانسیسی بھی' امریکن بھی تھے انگریز بھی میں اسٹول پر بیٹھا ان کی زندگی پر غور کرتا رہا۔ ان کا فلسفہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کونسے خیال نے انہیں زندگی سے دور کردیا ہے۔ کونسے تصور نے انہیں تہذیب و تمدن سے بیگانہ کردیا ہے۔ کیا نظریہ ہے ان کا۔ میرے دل میں خواہش ہوئی کہ کسی سے کچھ معلوم کروں۔ لیکن ابھی یہ ممکن نہیں تھا۔ ابھی مجھے پورے ہوش و حواس سے کام لینا تھا۔

چرس پینے والوں کا نشہ بڑھتا جارہا تھا۔ اب کچھ سوکھے سڑے نوجوان اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر چٹکیاں بجاتے ہوئے لرزتے قدموں سے تھرک رہے تھے۔ پھر ایک کونے سے کسی نے فرنچ زبان میں کچھ کہا۔ اور بہت سے لڑکے اور لڑکیاں کھڑے ہو گئے۔ پھر انہیں الفاظ کا انگلش میں ترجمہ کیا گیا جو میری سمجھ میں آگیا۔

محبت کرنے والو۔۔۔۔۔

یہ دنیا کیف ہے۔ نغمہ بلبل چھیڑ دو۔ مستیاں سمیٹ لو۔ بیگانگیاں اپنالو۔ اٹھو۔ امن کے نام پر۔ محبت کے نام پر۔ گاؤ۔ رقص کرو۔ دھوئیں کی زندگی جاگ اٹھی۔ فضا حسین ہے۔ غرق ہو جاؤ۔ محبت کرنے والو۔

اور محبت کے پجاری اٹھ کھڑے ہوئے۔ لڑکیوں کے لمبے بال لہرانے لگے۔ عجیب عجیب پوز بننے لگے۔

"رک جاؤ۔" ایک بھاری آواز گونجی۔ زبان جرمن تھی قد لمبا۔ جسم سوکھا۔ نہ جانے کہاں سے کسی لکھنوی بانکے کا انگرکھا مل گیا تھا۔ جو زیب تن تھا۔ لمبے لمبے بال۔ پچکے گال۔ چمکدار آنکھیں بھنچے بھنچے سرخ ہونٹ۔ چہرے پر عجیب سا جلال۔ "محبت کے نام پر۔" اس نے انگرکھا اتار کر زمین پر ڈال دیا۔ اور اب اس کے جسم پر صرف ایک نیکر تھا۔ نیلے رنگ کا نیکر جس کی پشت پر سرخ پیوند لگا ہوا تھا۔

"دیکھو۔ میں نے عشق پر سب کچھ قربان کردیا۔ دیکھو اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" اس نے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "محبت خدا ہے۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "محبت حسن ہے۔ محبت زندگی۔ محبت زندگی۔ زندگی۔ زندگی۔!" اس نے اپنے بالوں کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔

"محبت زندگی۔!" پورے ہال میں نعرے لگے اور اس کے بعد ایک ہنگامی منظر شروع ہو گیا۔ ان سب نے اپنے اوپری لباس اتار دیئے۔ وہ اپنے لباس اتار اتار کر دنیاوی بوجھ سے آزاد ہو رہے تھے۔ ان میں نوخیز لڑکیاں بھی تھیں۔ نوجوان لڑکے بھی۔ لڑکیوں کے شفاف سینے عریاں تھے۔ نسوانی جسم لیکن نسوانیت سے آزاد۔ ایک بے کار شے کی مانند۔ کوئی راغب نہ تھا۔ کوئی متوجہ نہیں تھا۔ لیکن میرے جسم میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ میں نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا تھا۔ میری زندگی ابھی تک نسوانیت کے قریب سے نہیں گزری تھی۔

"اوئے خدائی خوارو۔ اوئے خدائی خوارو۔" عالم گل کے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ دفعتاً" جرمن مبلغ زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے جسم میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا اور پھر ایک امریکی نے بھونڈی آواز میں گانا شروع کردیا۔ وائلن' ٹین کا ڈبہ چٹکیاں اور کچھ باجے منہ سے بجائے جانے لگے۔

محبت کی چڑیو۔ گنگناؤ۔ گیت گاؤ۔ رقص کرو۔ پیار کی دیوی کے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سفید پروں سے مس ہوتی ہوئی مسحور کن ہوا۔ دیکھو۔ ہمارے بال اڑ رہے ہیں۔ ہمارے جسموں میں تازگی دوڑ رہی ہے۔ محبت خدا ہے۔ محبت حسن ہے۔

"اور اس کے ساتھ ہی ہیجان خیز رقص شروع ہو گیا۔ سب بے ہنگم طور پر اچھل رہے تھے۔ کسی کو کسی کی سدھ نہیں تھی۔ میں سکتے کے عالم میں یہ دیکھ رہا تھا۔ یہ سب میرے لیے انوکھا تھا' اجنبی تھا۔ رقص کرنے والے قہقہے لگا رہے تھے۔ دفعتاً" دو لڑکیاں اچھلتی کودتی ہمارے سامنے

آگئیں۔ ان کی پشت ہماری طرف تھی۔ پتلی سڈول کمریں۔ ایک نیکر پہنے ہوئے تھی‘ دوسری پتلون‘ پتلون کا ایک پائنچہ ران تک پھٹا ہوا تھا خوبصورت تراش کے کولہے‘ نسوانیت سے بھرپور سڈول اور ستواں پنڈلیاں۔ پھر ان کے رخ بدل گئے اور اب ان کے عریاں سینے ہمارے سامنے آگئے چھوٹے چھوٹے نوخیز ابھار‘ جو قابل احترام بھی ہیں‘ کشش انگیز بھی۔ ان کی عمریں زیادہ نہ تھیں۔ ان کی نگاہیں ہماری طرف نہیں تھیں۔ نہ ہی ان کے چہرے پر جنسی جذبات تھے۔

میرا جسم سن ہو کر رہ گیا۔۔۔۔۔ عالم گل کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر اچانک عالم گل اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک لڑکی کو دبوچ لیا۔ اپنے قوی ہیکل بازوؤں میں دبایا۔ لڑکی اب بھی تھرک رہی تھی۔ دوسری لڑکی اپنی ساتھی کے حشر سے بالکل لاپرواہ تھی۔ میں عالم گل کی اس حرکت سے چونک پڑا۔ میرا خیال تھا رقص رک جائے گا۔ یہ سب عالم گل پر ٹوٹ پڑیں گے۔ لیکن رقص جاری رہا۔ کسی نے عالم گل کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔ اور عالم گل لڑکی کو بازوؤں میں دبوچے ہوئے نہ جانے کہاں چلا گیا۔

دوسری لڑکی بدستور میرے سامنے رقص کر رہی تھی۔ پھر اس نے بالوں کو جھٹکا دیا۔ میری طرف دیکھا اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر سگریٹ مانگی۔ میں سمجھ گیا۔ وہ چرس طلب کر رہی ہے۔ لیکن میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں نگاہیں جھکا لیں۔ میں اس کے نوخیز حسن کی تاب نہ لاسکا تھا اور اسی وقت میری نگاہ اپنے قدموں میں پڑے ٹین کے پیکٹ پر پڑی۔ اسی پیکٹ سے عالم گل نے مجھے سگریٹ پیش کی تھی غالباً پیکٹ گر گیا تھا۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھایا۔ کھول کر دیکھا اس میں ایک درجن سے زائد سگریٹ تھے۔ سب کے سب بھرے ہوئے۔ لڑکی اب بھی میرے سامنے تھرک رہی تھی۔ اس کی انگلیاں باربار ہونٹوں سے جا لگتیں۔ میں نے ٹین کا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے جلدی سے پیکٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ سگریٹ نکال کر اسے سونگھا اور اس کے چہرے پر بے پناہ مسرت بکھر گئی۔ اس نے پیکٹ بند کرکے میری طرف بڑھایا۔ صرف ایک سگریٹ اس نے اپنے پاس رہنے دی تھی لیکن میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو واپس کر دیا۔ تب اس نے انوکھے انداز میں مجھے دیکھا۔ اور جرمن زبان میں کچھ کہا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ پھر اس نے پیکٹ نیکر میں اڑس لیا۔ اور اپنے ایک ساتھی سے ماچس لے کر سگریٹ سلگانے لگی۔ دوسرے لوگ رقص کر رہے تھے۔ وہ اسٹول کے نزدیک میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر میرے گھٹنوں سے ٹکا دیا اور سگریٹ کے کش لینے لگی۔

میری عجیب حالت تھی۔ اس سے قبل کوئی نوجوان لڑکی میرے اس قدر نزدیک نہیں آئی تھی۔ میں نروس ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اطمینان سے بیٹھی سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔ رقص جاری تھا اور اب وہ صرف رقص نہیں کر رہے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں امن پسندی اور محبت کا پورا پورا ثبوت دے رہے تھے۔ ماحول ناقابل برداشت ہو گیا تو میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

مجھے اٹھتے دیکھ کر میرے نزدیک بیٹھی لڑکی بھی اٹھ کھڑی ہوئی وہ بے وقوف نہ جانے کیا سمجھی تھی۔ دوسرے لمحے اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے میرے ساتھ چل پڑی۔

میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس عجیب مخلوق کے ساتھ میں کیا سلوک کرتا۔ میں کچھ فیصلہ نہ کرسکا۔ اور وہ میرے ساتھ میرے کمرے میں آگئی۔ میں سخت الجھن میں تھا۔ نہ جانے اس کا کیا ردعمل ہو۔ ممکن ہے زورین میری اس حرکت کو پسند نہ کرے۔ لیکن بہرحال یہ ایسی حرکت نہیں تھی جیسی عالم گل نے کی تھی۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر میں نے بدحواس نگاہوں سے لڑکی کو دیکھا۔ اور سچ یہ ہے کہ پہلی بار اس کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ ستواں ناک‘ خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں‘ گلاب کی پتیوں جیسے نازک ہونٹ‘ چہرے پر پیلاہٹ بال اخروٹ کی رنگت کے۔ اس کے بازو پر فیروزی رنگ کے نشانات گدھے ہوئے تھے۔ مجموعی حیثیت سے کافی خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیلاہٹ کے ساتھ سرخی عجیب لگ رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر وہ نشیلے انداز میں مسکرائی اور پھر اس نے ٹن کے پیکٹ سے ایک اور سگریٹ نکال لیا۔ پہلے سگریٹ کے آخری سرے سے اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور پھر اچانک اس نے اپنے نیکر کی بیلٹ کھول دی۔ یہ حرکت بھی میرے لیے غیرمتوقع تھی نیکر اس کے قدموں میں گر پڑا اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

تب میں نے اس کی ہنسی کی آواز سنی اور آنکھیں کھول دیں وہ قالین پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی ہنسی میں معصومیت تھی۔ لیکن اس کے دانت پیلے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قطار میں سجے ہوئے بدنما دانت‘ جو پیلاہٹ لئے ہوئے تھے۔

”کیا کروں اس کا۔ کیا کروں؟“ میں پریشان ہو گیا۔ انسان تھا۔ نوجوان تھا‘ پیٹ بھرا ہوا تھا۔ تنہائی تھی۔ اور۔ اور مسکراہٹ تھی۔ بالکل جنگلی بھی نہیں تھا‘ اس کے خودسپردگی کے انداز میں سمجھ رہا تھا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور اس نے میری انگلیاں چوم لیں۔ پھر میرے ہاتھ کو اپنے گال پر رگڑنے لگی۔ تب میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور وہ اس کا سہارا لے کر اٹھ آئی۔

اب وہ میرے مقابل کھڑی تھی اور میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی‘ جیسے میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ رہی ہو۔ لیکن اس وقت میں خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے اسے کچھ آگے بڑھایا اور وہ میرے سینے سے چپک گئی۔ اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں کے مقابل کردیئے گو اس کے ہونٹوں سے چرس کی سڑاند آرہی تھی۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیوں میری طبیعت نے مالش نہ کی۔ میں نے اپنا چہرہ آگے بڑھایا اور اس نے بے تکلفی سے میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

اس کے ہونٹ رس بھرے تھے۔ ابھی ان کا رس خشک نہیں ہوا تھا۔ اس بوسے نے میری جھجک دور کر دی۔ اور میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے مسہری پر کھینچ لیا۔ سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے قالین پر گر پڑا۔ لیکن مجھے ہوش نہ رہا۔ وہ بھی پرجوش تھی‘ نشے نے اسے بھی دیوانہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔ پھر اس کا اور میرا دونوں کا نشہ اتر گیا میں زندگی کی ایک انوکھی حقیقت سے آشنا ہوا تھا۔ وہ اب بھی میری آغوش میں سر چھپائے پڑی تھی۔ اس کی گہری گہری سانسوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ لیکن وہ بھی میری طرح جاگ رہی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا۔؟“ میں نے اس سے انگلش میں پوچھا اور وہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار نظر آئے اور پھر اس نے جرمن زبان میں کچھ کہا۔ لیکن یہ

زبان میرے پلے نہیں پڑی تھی۔ وہ مسکرا اٹھی اور اس کے ہونٹوں سے چرس کا بھپکا اٹھا۔ لیکن جناب وہ میری زندگی کی پہلی عورت تھی۔ اس وقت مجھے کچھ برا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ سب کچھ پسند تھا۔ سب کچھ گوارہ تھا۔ دور سے ڈبہ پیٹنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ۔ غالباً وہ کچھ گا رہے تھے۔ وہ میری گود میں کسمسائی اور پھر مسہری سے اٹھ گئی۔ اسے اپنا ادھ جلا سگریٹ یاد آ گیا تھا۔ اس نے مسہری کے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ سگریٹ پڑا ہوا تھا' بجھ گیا تھا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھایا قالین پر ایک گول سیاہ نشان موجود تھا۔

اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا۔ مجھ سے ماچس مانگی' لیکن ماچس میرے پاس موجود نہیں تھی۔ میں نے دونوں انگوٹھے ہلا کر ماچس نہ ہونے کے بارے میں بتایا۔ تب وہ اطمینان سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے اپنے زیریں لباس کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔ لیکن میں ہوش و حواس میں تھا۔ میں نے دروازے سے نکلنے سے پہلے ہی اسے پکڑ لیا۔ واپس لایا اور اس کا نیکر اٹھا کر اسے دیا۔ اس نے نیکر پہن لیا' صرف اس وجہ سے کہ اس میں وہ ٹین کی ڈبیہ بھی تھی جس میں ابھی دس بھرے ہوئے سگریٹ موجود تھے اور پھر وہ باہر نکل گئی۔ میں کمرے کے درمیان کھڑا رہ گیا۔

"کیا ہو گیا تھا۔ کیا کر بیٹھا تھا میں۔ احساس گناہ میرے دل میں ابھرا۔ لیکن پھر ماضی کی تلخ یادیں میرے ذہن پر چھا گئیں' سب ٹھیک ہے' یہی زندگی ہے۔ شرافت و اخلاق کی زندگی سے میرا کیا واسطہ۔ حالات نے میرے لیے جس راہ کا تعین کیا ہے۔ مجھے اسی راہ پر بے جھجک بڑھنا چاہیے۔

میں ملحقہ باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ غسل کیا' لباس پہنا اور پھر اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ دماغ میں بے شمار خیالات تھے۔ لیکن میں ان سے نجات پا کر سونا چاہتا تھا۔ اور اس کوشش میں' میں کامیاب ہو گیا دوسرے دن تقریباً گیارہ بجے آنکھ کھلی۔ کسی نے مجھے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی اور ایک ملازم اندر آ گیا۔

"ناشتہ لے آؤ۔" میں نے کہا اور وہ گردن جھکا کر چلا گیا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ اور پھر باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ناشتہ آ گیا۔ گوشت' دودھ' سلائس اور چائے۔ جس کے ساتھ کچھ مکھن بھی موجود تھا۔ میں نے بڑی رغبت سے ناشتہ کیا اور چائے کی کئی پیالیاں پینے کے بعد کھڑا ہو گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ دن میں میرے اوپر کس حد تک پابندی ہے۔ دروازہ کھول کر میں باہر نکل آیا لوگ ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ میری طرف کسی نے توجہ نہیں دی اور میں آگے بڑھتا ہوا اس ہال میں پہنچ گیا۔ جہاں رات کو عجیب و غریب ہنگامہ برپا تھا۔

ہال میں اس وقت صرف دو تین آدمی اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ یہ ہیپی ہی تھے۔ لیکن ان میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ رات والے لوگ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے حیرت سے دوسرے حصے میں دیکھا۔ یہاں تک کہ کھنڈر کے بالکل باہری حصے میں نکل آیا۔ لیکن چاروں طرف ویرانی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی سوچا کہ یہ لوگ میری طرف سے زیادہ فکر مند نہیں ہیں۔ ورنہ مجھے ٹوکنے کی کوشش ضرور کی جاتی۔ پھر میں واپس پلٹ پڑا۔ تب میں نے ایک گزرتے سے پوچھا۔

"عالم گل کہاں ہے؟"

"عالم گل۔ عالم گل تو شہر گیا ہے۔ شام کو واپس آئے گا۔"

"اور وہ سب کہاں گئے جو رات کو اس ہال میں گا بجا رہے تھے؟" میں نے دوسرا سوال کر ڈالا۔

"وہ سیاح لوگ! وہ تو آگے بڑھ گئے۔ طورخم کی طرف' وہاں سے کابل جائیں گے اور پھر نہ جانے کدھر ------ ان کا کیا ہے صاحب۔"

"اوہ۔" میں نے گردن ہلائی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اپنے کمرے کی مسہری پر لیٹ کر میں اس غلیظ محبوبہ کے بارے میں سوچنے لگا' جو ایک رات کے لیے میری زندگی میں آئی تھی۔ اپنی تمام غلاظتوں کے ساتھ۔ بہرحال وہ ایک لڑکی تھی۔ ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی گو وہ بہت سستی تھی۔ انتہائی سہل الحصول چرس کے ایک درجن سگریٹ اسے میری خلوت میں لے آئے تھے۔ اس نے خاموشی سے اپنی کائنات میرے حوالے کی اور اسی خاموشی سے اس کائنات کی وسعتوں میں گم ہو گئی۔ جو کچھ بھی تھی' وہ میری زندگی کی پہلی عورت تھی۔ اس نے پہلی بار مجھے عورت کی لطافت سے روشناس کرایا تھا۔ میں اسے کیسے فراموش کر سکتا تھا۔

لیکن ------ میں تو اس غریب کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ اگر میں نے اپنی زندگی کا تجزیہ کیا اور اگر میری زندگی کبھی اس نہج پر پہنچ سکی' جب میں اپنے بارے میں کوئی داستان لکھوں تو اس لڑکی کا نام کیا لکھوں گا۔ جو ایک تاریک سائے کی حیثیت سے آئی اور روشنی ہوتے ہی معدوم ہو گئی۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی' ہاں جب وہ میرے جسم سے چسپاں تھی تو صرف ایک عورت تھی۔ اس کے نظریات کچھ بھی ہوں۔ اس وقت اس نے مجھے صرف ایک مرد گردانا تھا اور خود کو میرا محکوم۔

میرے دل سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ تب میں نے خود پر نفرین کی۔ کیسی حماقت ہے۔ میں اس کے لیے غمزدہ ہوں جس کی قیمت صرف بارہ چرس کے سگریٹ تھے۔ وہ میری محبوبہ نہیں تھی۔ صرف کرائے کی عورت تھی۔ کوئی بھی اسے ایک درجن چرس بھرے سگریٹ دے کر خرید سکتا ہے۔ نہ جانے کتنوں نے اسے خریدا ہوگا اور نہ جانے اس نے کتنوں کی محکومی قبول کی ہو؟

اس تصور نے میرا ذہن ہلکا کر دیا۔ اور میں دوبارہ اپنے پروگرام کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ٹھنڈا کر کے کھانا ہوگا۔ اس طرح کام نہیں چلے گا اگر ذرا بھی جلد بازی کی تو نہ صرف زندگی خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ پھر اس کے بعد۔ دنیا دیکھنے کی خواہش بھی نہیں پوری ہو سکے گی۔ چنانچہ میں اطمینان سے لیٹا رہا شام کی چائے پی کر میں باہر نکل آیا۔ میں نے اسی ہال کا رخ کیا تھا۔ ہال میں سیاحوں کی تعداد پھر بڑھ گئی تھی۔ کئی جوڑے تھے۔ چار پانچ تنہا آدمی تھے۔ گویا یہاں روز کئی لوگ آتے رہتے ہیں۔ ایک لڑکی اپنا اوپری لباس اتارے سی رہی تھی۔ اس کے سینے پر صرف ایک چیتھڑا بندھا ہوا' جو اس کے سینے کے طوفانی ابھاروں کو مکمل طور سے ڈھانکنے میں ناکام تھا۔ اس کے برابر

ہی اس کا ساتھی بیٹھا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا رنگ سفیدی مائل تھا۔ نوجوان نے نیلے رنگ کی نئی پتلوان پہنی ہوئی تھی لیکن اوپری بنیان بوسیدہ اور پھٹا ہوا تھا۔ لڑکی کو سوئی دھاگہ استعمال کرتے دیکھ کر بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ماسی بشیراں یاد آ گئی۔ اس کی لڑکی نوراں یاد آ گئی۔ جس کی آنکھیں ہرنی جیسی تھیں اور جس نے ایک عید پر سفید کپڑے کے ایک رومال پر تار کشی سے دل کا نشان کاڑھ کر مجھے دیا تھا۔ میں نے خوش ہو کر رومال لے لیا تھا اور پھر سب کو دکھاتا پھرا تھا۔ نہ جانے کیوں' دوسرے دن نوراں کو میرے سامنے نہیں آنے دیا گیا۔ اس کی چھوٹی بہن رشیداں نے بتایا تھا کہ نوراں کو مار بھی پڑی ہے۔ اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا' لیکن آج۔ اس سفید لڑکی کو سوئی دھاگے سے اپنی بوسیدہ قمیض سیتے ہوئے دیکھ کر مجھے نوراں کا دل یاد آ گیا تھا۔

"ہیلو۔" لڑکی کے ساتھی کی بھاری آواز میرے کانوں میں گونجی۔ اور میں گھبرا گیا۔ نوراں کے بارے میں سوچتے ہوئے میں اس کی ساتھی لڑکی کے نیم عریاں جسم کو گھورتا رہا تھا۔ میں نے پریشان نگاہوں سے اس ہٹے کٹے انگریز کو دیکھا۔ لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔

"ہیلو۔" میں نے بھی مری ہوئی آواز میں کہا اور وہ اٹھ گیا۔ میرے نزدیک آیا اور میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ مشینی انداز میں میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔

"آپ میری کچھ مدد کر سکیں گے جناب۔" اس نے گردن جھکا کر رازداری سے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ بولو۔ کیا چاہتے ہو؟" بادل نخواستہ میرے منہ سے نکل گیا۔

"کافی۔ کھانے کے لیے بسکٹ اور تھوڑی سی چرس۔" اس نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ اور میں دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ آدمی بے تکلف معلوم ہوتا تھا۔

"میں بندوست کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ یہاں میں بھی اجنبی تھا۔ ممکن ہے وہ لوگ میری درخواست نہ مانتے۔ لیکن بہرحال میرے پاس ڈھائی ہزار روپے تھے۔ میں پیسے خرچ کر کے ان سے کام لے سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک شخص کو روکا۔ اور وہ میرے قریب آ کر رک گیا۔

"سنو۔۔۔۔ تین کپ کافی۔ تھوڑے سے بسکٹ اور کھانے کی کچھ دوسری چیزیں اور تھوڑی سی چرس وغیرہ کی ضرورت ہے۔ کیا یہ چیزیں مہیا ہو سکیں گی۔"

"کیوں نہیں جناب۔ شاہ زورین کی طرف سے ہدایت ملی ہے کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔" اس نے جواب دیا۔ اور میں نے دل سے پہلی بار ان لوگوں کا احسان قبول کیا۔ میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس شخص سے یہی کہا تھا کہ وہ یہ سب چیزیں لے کر میرے کمرے میں آ جائے۔ کافی بننے میں وقت لگا ہو گا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی ملازم میرا مطلوبہ سامان چرس کا ایک پیکٹ اور اسے پینے کے لیے ایک لمبا اور نفیس پائپ لے کر میرے پاس آ گیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" میں نے کہا اور وہ ٹرے اٹھائے میرے پیچھے چل پڑا۔ لڑکی اپنا اوپری

لباس پہن چکی تھی۔ وہ ایک کونے میں گردن جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ شاید ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ چرس تک نہیں حاصل کر سکتے تھے اور کسی اپنے جیسے آدمی کی تلاش میں تھے' جو انہیں چرس مہیا کر دے۔ مجھے اس طرح لدا پھندا آتے دیکھ کر دونوں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

"ہیلو۔" اس بار مرد کے ساتھ لڑکی نے بھی پرجوش انداز میں کہا تھا۔

"سوری۔۔۔۔۔ کچھ دیر ہو گئی۔ تازہ کافی بن رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"اوہ۔ تھینکیو۔ تھینکیو ڈیر۔۔۔۔۔ ہم نے تمہیں بہت تکلیف دی۔" دونوں نے بیک وقت کہا۔ میں نے ملازم کو ٹرے نیچے رکھنے کو کہا اور وہ دونوں پھسکڑا مار کر زمین پر بیٹھ گئے اور پھر لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پائپ اٹھا لیا۔

"اوہ' میرے خدا۔ کتنا خوبصورت ہے یہ۔ لو یہ۔ اوہ کیستاں اوہ کیستاں ڈیر۔ دیکھو۔ چرس' کتنا سارا۔! وہ کیستاں۔!" وہ خوشی سے مرد سے لپٹ گئی۔ کیستاں ممنون نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کیا یہ سب ہمارے لئے ہے جناب؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ میری طرف سے حقیر تحفہ۔" میں نے کہا۔

"مگر ہم اس کے جواب میں تمہیں کیا دیں گے؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا میں بسکٹ کھا لوں؟" لڑکی نے ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے کہا اور میں نے بسکٹوں کی پلیٹ اٹھا کر اس کے سامنے کر دی۔ کیستاں نے بھی بسکٹ اٹھا لیا۔ اور میں ان کے لیے کافی بنانے لگا! لڑکی اپنے خوبصورت دانتوں سے بسکٹ کاٹ رہی تھی اور چمکدار نیلی آنکھوں سے پائپ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

میں نے کافی بنا کر ان دونوں کے سامنے رکھ دی۔ میں خود بھی انہیں کے انداز میں زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ تیسری پیالی بنا کر میں نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔

"میرا نام ایلب کیستاں ہے۔" مرد نے سنجیدگی سے کہا۔

"مسز کیستاں؟" میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"اوہ۔ نو۔ وہ گیلتھ ہے۔ گیلتھ کاکسن۔ میری کزن۔!" کیستاں نے جواب دیا۔

"سوری۔!" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔ اور پھر میری طرف رخ کر کے بولا۔ "اور آپ؟"

"میں نواز ہوں۔ نواز اصغر۔" میں نے جواب دیا۔ اس پر وہ کافی دیر تک میرے نام کی مٹی پلید کرتے رہے' اس کے باوجود وہ میرے نام کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکے۔ "تم لوگ نام سے برٹش نہیں معلوم ہوتے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہم فرنچ ہیں۔ ہم دونوں فرنچ ہیں۔"

"خوب۔ لیکن انگلش برطانوی باشندوں کی طرح بولتے ہو۔"

"میں جرمن امریکی اور دوسری کئی زبانیں بھی انہیں لوگوں کے سے انداز میں بول سکتا ہوں۔ البتہ گیلتھ صرف انگلش جانتی ہے۔ یا مادری زبان۔" اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر کافی کی تعریفیں کرنے لگا۔ لڑکی بسکٹوں پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ یہ لڑکی رات والی لڑکی سے زیادہ ترو تازہ تھی۔ اس کا قد بوٹا سا تھا اور جسم زیادہ گداز تھا۔ وہ کیستاں کی بیوی نہیں ہے۔ کزن ہے۔ لیکن۔ کون جانے کیا ہو۔ میں زیادہ گہرائی میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم کافی سے فارغ ہوگئے۔ تب کیستاں نے چرس کا پیکٹ پھاڑتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔ دراصل ہمارے پاس کچھ ہندوستانی کرنسی تھی۔ جسے سرحد پر چھین لیا گیا' اور اب ہم بالکل کنگال ہیں۔"

"ہندوستانی کرنسی۔! تم کہاں سے آرہے ہو؟"

"ارض مقدس سے۔ مسکن انسانیت سے۔ وہاں سے جہاں زندگی ایک حقیقت ہے۔ آہ وہ مسکن محبت۔ جہاں حسن' زندگی یکجا ہے۔!" وہ شاعری کرنے لگا۔

"میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔!"

"کھٹمنڈو سے۔ جو ہماری جنت ہے۔ جہاں فراخ دلی کے دریا بہتے ہیں۔ کاش ہم پوری زندگی وہاں گزار سکتے۔ لیکن قانونی مجبوریاں مسٹر۔ نازو۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ اس نے غم سے لرزتے ہوئے ہاتھ بڑھائے اور پائپ بھرنے لگا۔ لڑکی خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پائپ کو بھرتے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر اس نے مجھ سے ماچس مانگی۔

"اوہ۔ میں مہیا کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اور پھر ایک ملازم کو دوبارہ آواز دی۔ ماچس آگئی۔ اور اس نے پائپ منہ میں دبا کر ماچس جلائی۔ چرس کا تیز بھبکا اڑا اور لڑکی زور زور سے سانسیں کھینچنے لگی۔ میں اس کی خوشی کا اندازہ لگا رہا تھا۔ چرس کی ناگوار بو میری ناک سے ٹکرائی۔ اس نے دو تین کش لگائے اور پھر پائپ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پائپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ لڑکی بے چینی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ تب میں نے پائپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اوہ۔ تھینکیو۔ تھینکیو۔" اس نے جلدی سے ندیدے بچے کی طرح پائپ میرے ہاتھوں سے لے لیا اور بے صبری سے اس کے گہرے گہرے کش لینے لگی۔ گاڑھے سفید دائرے فضا میں ناچتے ہوئے بلند ہونے لگے۔

"تب میں اس جنت ارضی کو چھوڑ کر دہلی آگیا۔ دہلی سے لاہور۔ اور لاہور سے پشاور۔ اور اب۔ یہاں سے کابل جاؤں گا اور پھر نہ جانے کہاں۔ زندگی ایک سفر ہے مسٹر نوز۔ جاری رہتی ہے۔ منزل کبھی نہیں آتی۔ تلاش جاری رہے۔ نروان مل جائے گا۔ ضرور مل جائے گا۔" اس نے اس بار پھر میرا نام بدل دیا۔ لڑکی اتنی دیر میں بہت سی چرس پی چکی تھی۔ اس نے پائپ میری طرف بڑھا دیا

اور میں نے اسی انداز میں کیستاں کی طرف۔

"تم بھی پیو دوست۔ یہ نعمت تو سب کے لیے ہے۔ جو اس سے محروم ہے وہ دنیا کا بدنصیب ترین انسان ہے۔ مگر ٹھہرو۔ لاؤ۔ پائپ مجھے دو۔ میں تمہیں جنت کا تحفہ دیتا ہوں۔ شاید یہ تم جیسے کسی دوست ہی کی قسمت میں تھا۔" اس نے اپنی پتلون سے جنت کا تحفہ نکال لیا۔ سفید رنگ کی دو گول ٹکیاں تھیں' جنہیں اس نے سگریٹ کی پنی میں بڑی احتیاط سے لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ٹکیاں ہتھیلی پر رکھ کر بڑی عقیدت سے میرے سامنے پیش کر دیں۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہیروئن۔ خالص ہیروئن۔ جسے کھا کر رگوں میں زندگی دوڑ جاتی ہے۔ کھالو۔ اور زندگی سے کینچلی اتار دو۔ حقیقت اپنالو۔ نروان ہی نروان۔ ہری اوم۔ ہری کرشن۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"شکریہ میرے دوست۔ اسے بھی میری طرف سے اپنے پاس رکھو۔ میں اس کے استعمال کے قابل نہیں ہوں۔" میں نے اس کا تحفہ قبول نہ کرتے ہوئے کہا۔ اور وہ تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ٹکیاں اسی احتیاط سے پنی میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیں۔ پائپ اب لڑکی کے ہاتھ میں تھا۔

"ایک بات بتاؤ دوست۔" میں نے رازداری سے کہا۔ اور وہ میری طرف جھک آیا۔ "یہاں کا پتہ تمہیں کس نے بتایا؟"

"اوہ۔ ہمارے پاس تمام پتے موجود ہوتے ہیں۔ کھٹمنڈو سے ہی مجھے اس جگہ کے بارے میں معلوم تھا۔ ہماری ایک لائن ہوتی ہے۔ ایک روٹ ہے جس کے نقشے ہمارے پاس ہوتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کون سے ملک میں کہاں کہاں ہمارے اڈے ہیں۔ ہم بے دھڑک سفر کرتے ہیں۔ دہلی میں میرے پاس کافی کرنسی تھی۔ لیکن بداخلاق دنیاداروں نے اسے چھین لیا۔ پھر میں گیلتھ کے ساتھ لاہور آگیا۔ لاہور کے بازاروں میں ہم نے بھیک مانگی۔ تھوڑا بہت مل گیا تو یہاں کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے پتہ نہیں پشاور کے لوگ کیسے ہیں۔ کل ہم یہاں سے پشاور روانہ ہو جائیں گے پشاور سٹی جہاں سے اگر کچھ مل گیا تو بس میں طورخم چلے جائیں گے۔ اگر نہ مل سکا تو پھر پیدل ہی' بس سفر طویل ہو جائے گا۔ اور ہمیں اس طویل سفر کی پرواہ ہی کیا۔ ہماری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ بس سفر کرتے رہتے ہیں کرتے رہیں گے' اس وقت تک جب تک زندگی کا سفر ختم نہ ہو جائے۔"

میرا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ میں اس مقصد کے بارے میں نہیں جان سکا تھا۔ تاہم مجھے تھوڑی بہت معلومات ان لوگوں کی زندگی کے بارے میں ضرور ہوگئی۔ ابھی میں ان سے گفتگو کر ہی رہا تھا کہ عالم گل نظر آیا۔ وہ شاید مجھے ہی تلاش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور مقامی آدمی تھا۔ جو شلوار قمیص کی بجائے پتلون اور بشرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے گلے میں ایک فلش لائٹ کیمرہ لٹک رہا

تھا۔

"اوئے نواز۔ کدر رہے میرے یار۔ میں تیرے کو تلاش کرتا ہوں۔" اس نے زور سے آواز لگائی۔ اور میں ان دونوں کے قریب سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔ عالم گل گیلتھ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "لڑکی برا نہیں ہے۔" راضی ہے کیا؟"

"اوہ۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی ہے۔" میں نے فوٹو گرافر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ بائی صاحب۔ ان لوگوں کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ بس سالوں کو چرس دو۔ پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ رات کو تم نے دیکھا تھا۔"

"ہاں۔ ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ فوٹو گرافر کی وجہ سے میں شرمندہ ہو رہا تھا۔

"آؤ۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ خدا کسم۔" شاہ زورین بولا "تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔"

"نہیں۔ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بس میرے پاس کپڑے نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ' اچھا اچھا۔ کل ہم باڑہ چلیں گے۔ ادھر سے تم کپڑا خریدنا پھر شہر چل کر سلنے کو دیدیں گے۔ باڑہ سے ضرورت کا اور سامان بھی خرید لینا۔" میں نے گردن ہلادی۔ تو عالم گل پھر بولا۔ "اب آؤ۔ فوٹو کھنچالو۔ شاہ زورین کو تمہارا فوٹو کا ضرورت ہے۔" میں نے پر خیال انداز میں گردن ہلادی یہ فوٹو والا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن میں نے عالم گل سے اس کی وضاحت نہیں چاہی۔ کھنڈر کے ایک روشن کونے میں لے جاکر میری کئی تصوریریں اتاری گئیں۔ اور پھر فوٹو گرافر واپس چلا گیا۔ عالم گل میرے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔ ہم کھنڈر سے دور نکل آئے۔ عالم گل کسی گہری سوچ میں گم تھا پھر ایک جگہ وہ رک گیا۔ سامنے ہی پتھروں کے اونچے نیچے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔

"بیٹھو نواز بائی۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور خود بھی میرے سامنے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "کراچی سے تمہارے بارے میں رپورٹ مل گیا ہے۔ شاہ زورین نے اندازہ لگایا ہے کہ تم خراب آدمی نہیں ہو۔ مگر تم اس وقت پل پر کیا کر رہے تھے۔ جب ہمارا آدمی تمہارے پاس پہنچا تھا؟"

"سچ بتادوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بالکل سچ بتادو دوست۔" عالم گل نے ایک خاص انداز میں کہا۔

"میں خودکشی کرنے گیا تھا۔ دنیا سے مایوس ہو کر۔ اگر تمہارا آدمی چند لمحے اور نہ پہنچتا تو شاید ــــــ آج زندگی کے ہر جھگڑے سے آزاد ہوتا۔"

"اوہ۔" عالم گل نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "دنیا نے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔"

"بہت برا عالم گل۔ اس نے میری شخصیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس نے میرے وجود کو فراموش کر دیا ہے۔"

"تب تم دنیا کے ساتھ برا سلوک کرو نواز۔ شرافت کی زندگی اپنانے کی کوشش مت کرو۔ جس طرح دولت حاصل ہو سکے' حاصل کرو۔ عیش و عشرت کی زندگی گزارو۔ ہم تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔" عالم گل نے کہا اور میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟

"ہمیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ تمہاری پچھلی زندگی کا بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ مگر تم جو کچھ نظر آتے ہو۔ ہم اس پر بھی اعتماد کر سکتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے تیار ہیں۔" عالم گل نے پھر کہا۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا عالم گل؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ درحقیقت عالم گل کی باتوں نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میں یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ میں ان سفید بے فکروں کی سی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ گو میرا دل اسے قبول نہیں کرتا تھا' لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ نیکی بدی کا احساس میرے ذہن سے مٹ گیا تھا۔ نیک بن کر زندگی بڑی کٹھن ہو جاتی ہے۔ سب کچھ فراڈ ہے۔ سب فضول ہے۔ حالات جو کہتے ہیں وہ کرو۔ میں ایک متزلزل انسان ہوں۔ میری شخصیت راہوں میں آپڑی تھی۔ میں صرف دوسروں کے سہارے کا محتاج رہ گیا تھا۔ میں اپنے لیے کوئی بھی تو مقام نہیں بنا سکا تھا۔ پھر اگر ایک حیثیت مل رہی ہے تو اسے کیوں چھوڑا جائے۔ دیکھوں تو سہی وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

"یہ تو شاہ زورین بتا سکے گا۔ میرا کام صرف اتنا ہے کہ تمہارے خیالات معلوم کروں۔"

"میں تیار ہوں عالم گل۔ میں تیار ہوں۔ شاہ زورین سے کہہ دو مجھے میرا کام بتائے۔ وہ مجھے قابل اعتماد پائے گا۔" میں نے کہا۔ اور عالم گل خوشی سے اچھل پڑا۔

"خوش رہو میرے دوست۔" اس نے کھڑے ہو کر مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ زندگی بہت خوبصورت ہے۔ تھوڑی سی ذہانت سے کام کرو۔ اور عیش کرو۔ وہ دوسرے کاموں میں یہ عیش نہیں مل سکتے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اب دنیا کی باتیں کرو۔ وہ لڑکی تمہیں پسند ہے؟ عالم گل نے کہا۔

"کونسی؟" میں نے پوچھا۔

"ارے وہی یار۔ جسے تم ناشتہ کرا رہے تھے؟"

"اس کا ساتھی اس کے ساتھ ہے؟"

"اوئے دیوانے۔ میں بول چکا ہوں' یہ لوگ ان جھگڑوں سے آزاد ہیں۔ وہ کنگلا ہے۔ دو دن کھانا نہ دو۔ وہ کچھ نہیں بولے گا' پر ایک دن چرس نہ ملے تو وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ تم اپنی بات بولو۔ اس چکر میں مت پڑو۔"

"لڑکی بری نہیں ہے۔"

"میں بات کرتا ہوں۔" عالم گل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم پرواہ مت کرو عالم گل۔ میں خود بات کرلوں گا۔"

"ہاں۔ آدمی تم بھی استاد معلوم ہوتا ہے۔" عالم گل نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر وہ کل آنے کا وعدہ کرکے مجھ سے رخصت ہوگیا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کسی شک و شبہ میں پڑنا حماقت تھی۔ وہ لوگ منشیات کی ناجائز تجارت کرتے تھے اور مجھے بھی ان کے ساتھ یہی سب کچھ کرنا ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس انداز میں مجھ سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر معاملہ میری پسند کا ہوا تو ٹھیک ہے۔ ورنہ کسی بھی وقت ان سے جان چھڑا کر فرار ہوا جاسکتا ہے۔ زندگی اور موت کی تو میری نگاہ میں کوئی اہمیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔

پھر میں گیلتھ کے بارے میں سوچنے لگا! اس کا خوبصورت جسم، حسین چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ کیا عالم گل کی بات صحیح ہے کیا وہ اتنی ہی سستی ہے۔ اور عالم گل کی بات مجھے درست ہی محسوس ہوئی۔ پچھلی رات کی لڑکی مجھے یاد تھی۔ نہ جانے کیوں میرے جسم میں خواہشات انگڑائیاں لینے لگیں۔ میں وہاں سے اٹھ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی پھر کھنڈر کے اس ہال میں داخل ہوگیا۔ ہال میں اتنے ہی لوگ موجود تھے، جتنے کہ پچھلی رات۔ چرس کے دھوئیں سے ہال اٹا پڑا تھا۔ خوب چرس فروخت ہو رہی تھی۔ آج مجھے کچھ ایسے لوگ بھی نظر آئے جن کے کپڑے قیمتی تھے، وہ بھی دوسروں کے انداز میں چرس پی رہے تھے۔ میں نے گیلتھ اور کیستاں کو بھی ایک کونے میں بیٹھے دیکھا۔ میری بخشی ہوئی دولت ان کے پاس تھی اور وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کیستاں نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ گیلتھ بھی مسکرانے لگی تھی۔ میں پھر ان کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو۔" کیستاں پرجوش انداز میں بولا۔ میں ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔ "تم نے ہمارے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ تم محسن انسانیت ہو۔" کیستاں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"میں تائید کرتی ہوں۔" گیلتھ نے زوردار آواز میں کہا۔

"میں نے تمہاری شان میں قصیدہ کہا ہے۔ لیکن تم شاید فرنچ نہیں جانتے۔ تاہم میں تمہیں ضرور سناؤں گا۔ اے مسٹر۔" اس نے ایک نوجوان کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ اس کے پاس ایک بوسیدہ گٹار موجود تھا۔ کیستاں نے اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ اور نوجوان اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ کیستاں نے چرس کا پائپ اس کے سامنے پیش کیا اور نوجوان ہنس پڑا۔ اس نے بڑے احترام سے پائپ لے لیا اور دو تین گہرے گہرے کش لگا کر اسے گیلتھ کی طرف بڑھادیا۔

"ساز چھیڑو۔ میں میں گاؤں گا۔" کیستاں نے کہا۔ رشوت وہ پہلے ہی پیش کرچکا تھا۔ نوجوان کے لیے انکار کی گنجائش نہیں تھی، اس نے گٹار سنبھال لیا۔ بلاشبہ وہ گٹار بجانے کا ماہر تھا۔ میں اس نغمے کو سمجھ نہیں سکا، لیکن وہ کانوں کو بے حد بھلا لگ رہا تھا اور پھر کیستاں کی آواز ابھری۔ اس نے قصیدہ شروع کردیا تھا۔

گیلتھ اٹھ کر میرے نزدیک آبیٹھی۔ اس نے میرے کندھے سے سر ٹکادیا۔ میں نے اس کی

طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر سلگتی سی مسکراہٹ تھی۔ تب کیستاں نے ایک لمبی آواز میں کچھ کہا اور گیلتھ نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا۔

"پہاڑوں کے اجنبی۔ محبت کے ساتھی۔ تیرے سینے میں انسانیت۔ دھڑکتی ہے۔ تیری آنکھوں میں امن ہے۔ تیرا دل سمندر ہے۔ سمندر۔ سب کا ساتھی۔ اپنوں اور غیروں کا دوست۔ تو روشنی ہے۔ جس کے سائے میں۔ پتھروں کی تمیز ہوتی ہے۔ بھٹکنے والے راستہ پالیتے ہیں۔ پاؤں زخمی نہیں ہوتے۔ تو کون ہے۔ محبت کا فرشتہ؟ سکون کا بیٹا پہاڑوں کے اجنبی کہاں سے آیا ہے۔ کہاں جائے گا۔ کچھ قدم ساتھ دے۔ تو فرشتہ ہے اور فرشتے دل میں رہتے ہیں۔" گیلتھ آہستہ آہستہ میرے کان میں کیستاں کے نغمے کا ترجمہ کر رہی تھی۔ اس کی بدبودار سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ یہ جوان سانسیں جن سے صرف چرس کی بو الگ کردی جاتی تو ان کی قیمت نہ جانے کیا ہوتی۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ نہ جانے کہاں سے مجھ میں جرأت آگئی۔ میں جھکا اور میں نے گیلتھ کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

گیلتھ مسکرانے لگی۔ کیستاں بھی مسکرانے لگا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ کسی نے برا نہیں مانا تھا۔ کسی کو احساس نہیں تھا۔ یہ سب مصنوعیت سے دور تھے۔ انہیں زندگی کی ضرورتوں کا احساس تھا۔

کیستاں کا نغمہ ختم ہوگیا۔ بہت سے گوشوں سے تالیاں ابھریں۔ اور کیستاں نے گردن جھکادی۔ گیلتھ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کیا اور پھر سب کے سامنے میری گردن جھکا کر میرے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔ میری پیشانی پسینے کے قطرات نمودار ہوگئے۔ کچھ بھی تھا، میں مشرقی تھا اور ابھی ان کی طرح حقیقت پسند نہیں بن سکا تھا۔

میں گیلتھ کے پاس سے ہٹ آیا۔ پھر میں نے کیستاں سے معذرت کی اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کوئی مقصد نہیں تھا، بس طبیعت میں عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ بھی آپ کو سمجھادوں۔ مجھے اپنے ماحول، اس کے رسم و رواج سے نفرت ہوگئی تھی۔ لیکن میری زندگی بے داغ تھی، میں نے صرف غم روزگار دیکھا تھا۔ ایسے دور سے نہیں گزرا تھا، جو بے حیائی اور بے غیرتی کا دور ہو۔ مجھے یہ سب کچھ ناپسند نہیں تھا۔ لیکن خمیر میں گھلا ہوا شرافت کا احساس اپنے مشرقی ہونے کا احساس تھا۔ جرمن لڑکی میری زندگی کی پہلی لڑکی تھی جس نے مجھے عورت سے روشناس کرایا تھا اور گیلتھ۔ اس کے ہونٹوں کے لمس کو میں نے صرف اڑتالیس گھنٹے میں دوسری بار چکھا تھا۔ مجھے یہ لمس پسند تھا۔ لیکن تنہائی میں۔ ممکن ہے کبھی میں بھی اس ماحول سے آشنا ہو جاؤں۔ میرے دل سے بھی شرم و حیا کے احساسات مٹ جائیں۔ لیکن ابھی۔ ابھی میں کچا تھا۔

رات گئے تک میں اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ پھر ایک ملازم حسب معمول میرے لئے کھانا لایا۔ اور کھانا دیکھ کر مجھے وہ دونوں یاد آگئے ان کے پاس میرے دیئے ہوئے چرس اور پائپ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ دراصل ابھی مجھے ان لوگوں کے بارے میں مکمل معلومات نہیں تھیں۔ یہ تو

بہت بعد کو معلوم ہوا کہ وہ کئی کئی دن کھائے بغیر گزارہ کر لیتے ہیں۔ صرف چرس ملتی رہے۔

بہرحال میں نے ملازم کو بلایا۔ "سنو۔" میں نے اس سے کہا۔ "ہال میں کیستاں اور گیلتھ نامی ایک جوڑا موجود ہے۔ انہیں کھانے پینے کی چیزیں پہنچادو۔"

"بہت بہتر جناب۔ ویسے یہ تو سب سالے بھوکے ہوتے ہیں۔" ملازم نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم صرف ان دونوں کو پہنچادو۔" میں نے کہا اور ملازم واپس چلا گیا۔ میں کھانا کھاتا رہا۔ کافی ہپیی جمع ہو گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ آج رات بھی کل کی طرح ہنگامہ ہوگا۔ لیکن کافی وقت گزر گیا۔ کوئی آواز نہ سنائی دی۔ تب میں اپنے کمرے سے نکل آیا۔ میں نے ہال میں نگاہ دوڑائی۔ آج وہ سب مسرور تھے۔ صرف چرس کے دھوئیں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ چند اوندھے ہو گئے تھے۔ چند غنودہ پڑے تھے۔ کسی میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ ایک کونے میں کیستاں بھی نظر آیا' وہ دونوں گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھا تھا اور اس سے کچھ دور گیلتھ کروٹ لئے لیٹی تھی۔ میں دور سے گیلتھ کے جسم کے اتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ اگر قاعدے کے لباس' اور قاعدے کی شکل میں ہوتی تو بلاشبہ جسمانی طور پر ایک حسین ترین عورت ہوتی۔ بہرحال ان لوگوں کی طرف سے مایوس ہو کر میں واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ اوپری لباس اتارا اور مسہری پر دراز ہو گیا۔ عالم گل نے کل کا وعدہ کیا ہے۔ رقم میرے پاس موجود ہے سامان خریدوں گا۔ میں ضرورت کی چیزوں کی ایک فہرست تیار کرنے لگا! شیو کافی بڑھ گئی تھی۔ بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے اور لباس۔ لباس کے علاوہ بھی کئی چیزوں کی ضرورت تھی۔

انہی خیالات میں مجھے نیند آنے لگی۔ اور پھر میری نیند پکی بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اپنے دروازے سے کسی کے ٹکرانے کی آواز سنائی دی میں چونک پڑا۔ "کون ہے۔" دوسرے لمحے میں نے آواز دی۔ لیکن ٹکرانے سے دروازے کا پٹ کھل گیا تھا اور اس سے مجھے لہراتے ہوئے بال نظر آئے۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔

"مسٹر نوز ـــــ مسٹر نوز ـــــ" مجھے گیلتھ کی آواز سنائی دی اور میں نے مسہری سے چھلانگ لگا دی۔ دوسرے لمحے میں گیلتھ کے جسم کو سنبھالے ہوئے اندر لے آیا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ گیلتھ نے نشہ آلود سرخ آنکھیں اٹھائیں اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں نے بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر اسے سہارا دیتے ہوئے ایک کرسی تک لے آیا۔ گیلتھ بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے گیلتھ۔ میرے لائق کوئی کام۔" میں نے استفسار کیا۔

"میں۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ تم نے۔ ہم لوگوں پر بہت احسان کیا ہے۔ بہت احسان۔"

"تم میرے دوست ہو۔ احسان کیسا۔" میں نے کہا۔

"تم بہت سویٹ ہو۔ بہت اچھے۔" وہ کرسی سے اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے اچک

کر میرے ہونٹ چوم لئے اور میرے ذہن میں بھی آگ بھڑک اٹھی۔ میں نے اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور باہوں میں سمیٹ لیا۔

وہ میرے سینے میں منہ چھپائے لیٹی تھی اور ایک بوالہوس پتنگا اس کے سنہرے بازو پر آبیٹھا تھا۔

مجھے پتنگے کی مداخلت پسند نہ آئی۔ اور میں نے اسے ہاتھ سے جھاڑ دیا۔ پھر میں نے اسے آواز دی۔ "گیلتھ۔"

"ہوں۔" اس نے آنکھیں بند کئے نشہ آلود انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیستاں تمہارا کون ہے؟"

"ساتھی اور۔ بس۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے۔ کیا وہ۔ کیا وہ بھی تمہیں حاصل کر چکا ہے۔ جس طرح میں۔"

"درجنوں بار۔" اس نے بڑے سکون اور لاپرواہی سے کہا۔ اور میں چونک پڑا۔ کئی منٹ تک میں اسے دیکھتا رہا۔ میرے دل کی کیفیت بدلنے لگی تھی۔ میری مشرقی رقابت عود کر آنے لگی تھی۔

"اسے معلوم ہوگا کہ تم۔ تم میرے پاس آئی ہو تو۔ تو۔"

"اسے معلوم ہے؟"

"اور اس نے اعتراض نہیں کیا؟"

"اعتراض؟" "کیوں؟" اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے لئے یہ انوکھی بات تھی کہ کوئی کسی کی آغوش میں جانے پر اعتراض کرے۔ میرے پاس اس کیوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ سنہری بدن بے قیمت تھا۔ اس کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ اسے کوئی بھی حاصل کر سکتا تھا۔ عالم گل کے الفاظ مجھے یاد آگئے۔ ظاہر ہے میرا اور ان لوگوں کا تعارف بھی کتنا تھا۔ جبکہ عالم گل انہیں نہ جانے کب سے جانتا تھا۔ پھر میں نے اس سلسلے میں کچھ نہ کہا۔ البتہ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہاں سے جانے کے بعد تم مجھے بھول جاؤ گی گیلتھ؟"

"ہاں۔ بھول جانا ضروری ہوتا ہے۔ زندگی ایک اسکرین ہے۔ سینکڑوں تصویریں نظر آتی ہیں۔ غائب ہو جاتی ہیں۔ کسے یاد رکھا جائے اور یاد رکھنے سے ملتا بھی کیا ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"یہاں سے کہاں جاؤ گی؟"

"پشاور۔ لیکن کیستاں نے کہا ہے کہ میں تم سے کچھ رقم مانگنے کی کوشش کروں۔ اگر رقم مل جائے تو ہم سیدھے کابل روانہ ہو جائیں گے۔"

"ہوں۔" نہ جانے کیوں میرا موڈ خراب ہو گیا۔ میں مسہری سے اٹھ گیا۔ میں نے اپنا لباس

پہنا۔ "کتنی رقم چاہیے۔"

"صرف کابل تک کا کرایہ۔ تھوڑی سی چرس۔" اس نے جواب دیا۔ اور میں نے اپنے لباس سے سو سو کے تین نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ گیلتھ کی آنکھیں مسرت و خوشی سے پھیل گئیں۔ اس کا سارا نشہ ایک دم اتر گیا۔

"اوہ۔ میرے خدا۔ یو آر گریٹ ڈارلنگ۔" وہ اچھل کر مجھ سے لپٹ گئی۔ لیکن میری گرم جوشی ختم ہوگئی تھی۔ اب وہ مجھے بالکل متاثر نہیں کر رہی تھی۔ مجھے اس کے نظریئے سے اختلاف تھا۔ میں اسے زندگی بھر کے لیے نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ لیکن میری خواہش تھی کہ وہ مجھے یاد رکھے۔ اور اس کے واپس چلے جانے کے بعد مجھے اس خواہش کے احمقانہ ہونے کا احساس ہوا۔ حماقت۔ گدھاپن۔ انہوں نے دنیا چھوڑ دی ہے انہوں نے انسانیت کے تمام اصول تج دیئے ہیں۔ نہ جانے گیلتھ کون سے خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ نہ جانے کیستاں کا باپ فرانس میں کیا کرتا ہوگا۔ اگر وہ شریف انسانوں کی طرح زندگی گزارتے تو معاشرے کے معزز فرد ہوتے۔ لیکن انہوں نے اس معاشرے کو ٹھکرا کر بے راہ روی اپنالی ہے۔ پھر وہ میرے چند کاغذ کے ٹکڑوں اور تھوڑی سی چرس کو کیا خاطر میں لاتے۔ جو حقیقت تھی اس نے صاف بتادی۔ جبکہ اس انداز میں ہمارے ہاں کی طوائفیں بھی گفتگو نہیں کرتیں۔ وہ اپنے گاہکوں سے کبھی یہ نہیں کہتیں کہ وہ صرف دولت کی پرستار ہیں اور جب ان کی جیب خالی ہو جائے گی تو انہیں ان سے کوئی سروکار نہیں رہے گا۔ بلکہ وہ بے باکی سے اظہار عشق کرتی ہیں۔ جیب کی گرمی کے ساتھ ان کی محبت بھی گرم جوش ہوتی ہے اور جب جیب خالی ہوتی ہے تو ان کا دل بھی خالی ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے ذہین ان کے جال میں پھنستے ہیں' ان کی محبت کو حقیقت سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے سامنے طوائفوں کی پوری تاریخ ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ خود کو دھوکہ دینا پسند کرتے ہیں۔ گیلتھ میں وہ بات نہیں تھی' اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں نے اس پر احسان کیا۔ اسے کچھ دیا اس کے عوض اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے مجھے دے دیا۔ پھر احسان اور محبت کی کیا بات ہے۔ زندگی کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ صورتوں کو یاد رکھے۔ اس کے لیے ہر وہ انسان نواز ہے جو اس کی ضرورت پوری کردے۔ اس نے اپنی قیمت بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اپنی جھوٹی لگاوٹ کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں عجیب کیفیات لئے مسہری پر دراز ہوگیا۔ البتہ لیٹے لیٹے میں نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ وہ یہ کہ ان ہپی جوڑوں سے کسی بات کا اظہار کوئی بری بات نہیں ہے۔ جو لڑکی پسند آجائے اس پر ہاتھ رکھ دو۔ اس کی قیمت چکادو اور اسے بھول جاؤ۔ بس۔ باقی تکلفات بیکار ہیں۔ بالکل حماقت ایک میٹھی میٹھی تھکن بدن پر طاری تھی۔ جس نے نیند لانے میں سہارا دیا اور میں سو گیا۔

دوسرے دن عالم گل میرے پاس آگیا۔ میں تیار تھا۔ ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ہال میں چند ہپی موجود تھے۔ کیستاں اور گیلتھ بھی تھے۔ کیستاں نے میری طرف ہاتھ ہلایا۔ لیکن میں اسے جواب دیئے بغیر باہر نکل آیا۔ باہر ایک جیپ موجود تھی۔ یہ اعتماد کا ایک اور ثبوت تھا۔ گویا اب

میرے لئے بند گاڑی کی ضرورت نہیں تھی۔ عالم گل نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور ہم چل پڑے۔ باڑہ تک ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر ہم نے بازار میں خریداری کی۔ میں نے بہت سے سوٹوں کے کپڑے خریدے۔ شیو کا سامان' اور دوسری ضروری چیزیں۔ غیر ملکی مال تھا۔ انتہائی نفیس۔ وہاں سے ہم واپس پشاور چل پڑے۔ اور پھر پشاور شہر میں ایک ٹیلرنگ ہاؤس میں' میں نے اپنے کپڑوں کا ناپ دیا۔ اس کے بعد ہم وہاں سے بھی چل پڑے۔ لیکن اس بار شہر سے باہر کا رخ نہیں کیا گیا تھا۔

شہر میں ایک خوبصورت علاقے کی خوبصورت عمارت میں جیپ موڑ لی گئی اور پھر عالم گل مجھے لئے ہوئے عمارت کے ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جہاں شاہ زورین اور دو اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تنومند شخص گہرا سیاہ چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ عالم گل مجھے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اور شاہ زورین نے دروازہ بند کرلیا۔ پھر وہ میری طرف رخ کرکے بولا۔

"بیٹھو نواز۔" اور میں ایک گہری سانس لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب سیاہ چشمے والے نے مجھے مخاطب کرکے کہا۔

"پورا نام کیا ہے؟"

"راجہ نواز اصغر۔" میں نے جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"سرائے عالمگیر کا۔"

"تعلیم؟"

"بی۔ اے۔"

"کون کون سی زبانیں جانتے ہو؟"

"مقامی زبانوں کے علاوہ صرف انگلش۔"

"شاہ زورین نے تمہیں تفصیل بتادی تھی؟"

"ہاں۔"

"کیا خیال ہے؟"

"میں بالکل تیار ہوں۔"

"سوچ لو۔ ہماری دوستی تمہاری زندگی میں خوشیاں بکھیر دے گی اور ہماری دشمنی۔ تمہیں تحت الثریٰ میں سکون نہ لینے دے گی۔"

"دشمنی کا کوئی سوال نہیں ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"پیدا ابھی نہیں ہونے دیا جائے گا۔"

"مجھے پابندیوں کی فہرست مہیا کردی جائے۔ اس کے بعد غور کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"صرف ایک پابندی۔ وفاداری۔ ہمارے مفادات کو نقصان نہ پہنچے اور کوئی ایسی حرکت نہ

جس سے ہم پر روشنی پڑسکے۔"

"قابلِ قبول ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ خود کو ہمارے ساتھیوں میں سمجھو۔ تمہارے سپرد ایک اہم کام کیا جائے گا۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"دراصل تمہیں ایک سروے کرنا ہوگا۔ یہاں سے لے کر امریکہ کی ان ریاستوں تک، جہاں جہاں چرس اور دوسری نشہ آور اشیاء کی کھپت ہے۔ تعلیم یافتہ آدمی ہو۔ آسانی سے کام کرسکو گے۔ بہت سی پارٹیاں اس سلسلے میں کام کر رہی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری پارٹی اس کاروبار کو لیڈ کرے دوسرے لوگ ہمارے تحت کام کرکے زندہ رہ سکیں۔ تم یہ تمام اندازے لگا کر ہمیں ان کی تفصیلات بھیجتے رہو گے۔ یہ کام کس انداز میں ہوگا اس کے بارے میں تمہیں ہدایات ملتی رہیں گی اور رہا معاوضے کا سوال۔ تو اس کے لئے تم خود سوچ لینا۔ شہنشاہوں کی طرح زندگی گزارنے کے لیے جتنی رقم درکار ہو خود تعین کرلینا۔ لیکن بس وفاداری۔ اور ہوشیاری! دوسرے لوگ بھی تمہارے آڑے آسکتے ہیں۔ ان حالات سے تم خود نپٹو گے۔"

میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ چند لمحات میں سوچتا رہا۔ کام بے حد دلچسپ تھا۔ وہی ہو رہا تھا جو میں چاہتا تھا۔ لیکن کیا میں اس قدر مضبوط ہوں کہ ان کی مرضی کے مطابق کام کرسکوں۔ میں نے خود کو تولا اور پھر میرے ذہن میں وہی بیزاری ابھر آئی۔ مضبوط نہیں ہوں تو بن جاؤں گا۔ زندہ رہنا ہے۔ کسی بھی طور۔ دنیا جو کچھ بنا رہی ہے' بن رہا ہوں۔ میرا کیا قصور ہے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"تمہاری تصویریں لے لی گئیں ہیں۔ پاسپورٹ ایک آدھ دن میں مل جائے گا۔ تم ان ہپیوں کے ساتھ سفر کرو گے۔ انہیں کے انداز میں جس انداز میں تمہارے کام میں یہ تمہاری مدد کرسکتے ہیں کوئی اور نہیں لیکن انہیں کوئی احساس نہ ہونے دینا۔ یہ تمہارا فن ہے۔ خشکی کے راستے سفر کرو گے اور تمہاری پہلی منزل کابل ہوگی۔ کھٹمنڈو سے امریکہ تک کام کرنے والی جتنی پارٹیاں ہیں ان کے بارے میں تفصیلات تمہیں مل جائیں گی۔ ہر جگہ۔ ہر شہر میں تمہارے ساتھی موجود ہوں گے جو تمہاری کٹھن حالات میں مدد کریں گے کوئی اور سوال؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

"تب پھر اس فارم پر دستخط کردو۔" سیاہ چشمے والے نے ایک کاغذ میری طرف بڑھادیا۔!

☆ ☆ ☆

میں فیصلہ کرچکا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ کام کروں گا۔ میرے لیے اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میری رگوں میں شریف خون تھا کوئی ایسا کام کرکے میرا ضمیر خوش نہیں ہوتا تھا جو معیارِ انسانیت سے گر کر ہو۔ لیکن ایک غیور باپ کے غیرت مند بیٹے نے تو کراچی کے نیٹی جیٹی کے پل پر پہنچ کر خودکشی کرلی تھی۔ راجہ نواز اصغر تو سمندر کی لہروں میں گم ہوگیا تھا۔ اب تو صرف نواز تھا جو حالات کے ہاتھوں کا کھلونا تھا۔ اس رات نے اصغر نواز کی خودکشی کے بعد ایک اسمگلر کو جنم دیا تھا۔ میں تو اس رات کا بیٹا تھا۔ مجھے اس فارم پر دستخط کرنے میں کیا عار ہوسکتا تھا۔ میں نے سیاہ چشمے والے سے فارم لے کر اس کی بتائی ہوئی جگہ پر دستخط کردیئے۔ سیاہ چشمے والے نے فارم تہہ کرکے جیب میں رکھ لیا اور پھر زورین خان کی طرف دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے غلام سیٹھ۔ ہم کو اطمینان ہے یہ کام کا آدمی ثابت ہوگا۔ ہم نے ہمیشہ تمہیں ہیرے تلاش کرکے دیئے ہیں۔" زورین خان بولا۔

"اور میں نے ان ہیروں کو تراش کر کچھ سے کچھ بنادیا ہے۔ کیا تم اس بات سے انکار کرو گے زورین خان۔"

"نہیں غلام سیٹھ۔ ہم جانتا ہے کہ تمہیں ہیروں کو تراشنا خوب آتا ہے۔"

"آؤ نواز------ چلیں------ تمہارا سامان پہنچ جائے گا۔" سیاہ چشمے والے نے کہا اور میں اس سے کچھ پوچھے بغیر اٹھ گیا۔ ہم عمارت سے باہر نکل آئے۔ عمارت کے عقب میں ایک خوبصورت امپالا کھڑی ہوئی تھی۔ غلام سیٹھ نے جیب سے چابی نکال کر اس کا دروازہ کھولا اور پھر اسٹیرنگ پر بیٹھ کر اندر سے دوسرے دروازے کا لاک کھول دیا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا تو اس نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔ راستہ خاموشی سے طے ہونے لگا۔ میں خالی خالی نگاہوں سے ونڈاسکرین کے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اب میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

کچھ سوچنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا!

تھوڑی دیر کے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں پشاور کی حدود ختم ہوتی ہے۔ ایک چھوٹے سے بدنما پتھر پر علاقہ غیر لکھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ایک فوجی رائفل لئے کھڑا تھا۔ برابر میں رکاوٹ لگی ہوئی تھی۔ دو آدمیوں نے جلدی سے رکاوٹ ہٹادی اور امپالا پشاور کی سرحد سے نکل کر علاقہ غیر میں داخل ہوگئی ناہموار سڑک پر قیمتی گاڑی دوڑتی رہی۔ باڑہ نکل گیا۔ ہم آگے بڑھتے رہے۔ غلام سیٹھ بھی خاموش تھا۔ میں بھی کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا اس کی ضرورت بھی نہیں تھی' بس جو ہونا تھا۔ ہوچکا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ اور اب اس کے بارے میں کچھ غور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پشاور سے پینتس میل دور لنڈی کوتل کا علاقہ بھی نکل گیا۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے' اور پھر سربفلک پہاڑوں کے درمیان قدرتی مناظر سے مالا مال ایک خوبصورت بستی نظر آئی۔ امپالا کا رخ اسی بستی کی طرف تھا۔ بستی میں بے شمار مکانات چھوٹے پہاڑی پتھروں سے بنے ہوئے تھے جن کے سامنے پھلوں کے درخت جھوم رہے تھے۔ انتہائی حسین اور پرفضا مقام تھا۔ پھلوں کی مہک میں بسی ہوئی ہوائیں' میٹھی میٹھی خوشبوئیں تقسیم کررہی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کے سیاہ ٹکڑے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایک بڑی عمارت کے کمپاؤنڈ میں امپالا داخل ہوگئی۔ اس عمارت میں بھی چاروں طرف درخت جھوم رہے تھے۔ کمپاؤنڈ کے مختلف گوشوں میں' میں نے ہپیوں کو دیکھا۔ وہی منظر تھا حسبِ معمول چرس اور دوسری منشیات کے نشے میں مست اوندھے پڑے ہوئے تھے۔

دو لمبے لمبے قد اور سرخ و سفید جوانوں نے آگے بڑھ کر کار کے دونوں

دروازے کھول دیئے۔ ان کی کمر سے بندھی ہوئی پیٹیوں میں پستول لٹکے ہوئے تھے۔ غلام سیٹھ نے دوستانہ انداز میں میرے ہاتھ میں انگلیاں پھنسائیں اور اندر داخل ہو گیا۔ حسب توقع عمارت اندر سے بہت خوبصورت تھی۔ لوازمات زندگی سے آراستہ۔ غلام سیٹھ مجھے لئے ہوئے ایک کمرے میں پہنچ گیا۔ اور پھر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"فی الحال یہ تمہاری رہائش گاہ ہے نواز۔ تمہیں کچھ عرصہ تربیت دی جائے گی اور ضروری امور سے آگاہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد تمہارا کام شروع ہو جائے گا۔ یہاں بے تکلفی سے رہو۔ کوئی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ زندگی کی ہر ضرورت طلب کر سکتے ہیں۔ جن میں شراب' دوسری نشہ آور اشیاء اور عورت شامل ہے۔ زندگی یہی ہے پیارے۔ عیش کرو عیش سے گزارو!" وہ مسکرانے لگا' پھر اس نے ایک دیوار میں لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا اور ایک نو عمر لڑکا اندر داخل ہو گیا۔

"دولہے۔ یہ نیا صاب ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ تمہارا ڈیوٹی اس کے پاس ہے۔"

"سلام صاب!" دولہے نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

"او کے نواز۔ مجھے اجازت دو۔ ممکن ہے آج ملاقات نہ ہو کل کا دن تمہارے ساتھ گزاروں گا۔" اس نے کہا اور میری طرف ہاتھ بڑھا دیا اور پھر وہ مجھ سے مصافحہ کر کے باہر نکل گیا۔

دولہے خان میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بڑا خوبصورت اور صاف ستھرا لڑکا تھا' سوائے اس کے کہ اس کے دانت نسوار سے پیلے ہو رہے تھے۔ نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ اب بھی ابھرا ہوا تھا' جس میں شاید نسوار دبی تھی۔

"کیا خدمت کرے صاحب۔" اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ نہ جانے دولہے خان کے چہرے پر مجھے کیا نظر آیا کہ مجھے اس پر غصہ آگیا۔ تاہم میں نے کرخت آواز میں کہا۔

"بھاگ جاؤ۔ جب ضرورت ہو گی بلا لوں گا۔" اور وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذہن خالی خالی معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھوں پر ایک عجیب سے وزن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس احساس سے چھٹکارا پانے کی کافی کوشش کی لیکن نہ پا سکا تب میں نے سوچا تھوڑی دیر سو جاؤں۔ اور میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کپڑے اتارے اور صرف انڈرویئر پہن کر مسہری پر لیٹ گیا جس پر صاف اور بے داغ چادر بچھی ہوئی تھی۔

نیند بھی فوراً" آگئی۔ اور جب جاگا تو طبیعت بشاش تھی۔ لباس پہن کر دروازہ کھول دیا۔ گھنٹی بجائی تو دولہے خان فوراً" آگیا۔ اس وقت وہ سنجیدہ تھا۔ "نہانے کا بندوبست کہاں ہے۔؟ میں نے پوچھا۔

"آؤ صاب۔" اس نے کہا۔ اور میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ صرف ایک پتلی سی راہداری طے کرنا پڑی۔ سرے پر باتھ روم تھا۔ دولہے خان نے دروازہ کھول دیا۔ اندر تمام سامان موجود تھا۔ لیکن دولہے خان دروازے پر کھڑا تھا۔

"چائے کا انتظام کرو۔" میں نے کہا اور وہ گردن جھکا کر چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور

ٹھنڈے پانی کی پھواروں سے ذہن کی کسل دھونے لگا۔ بڑا سکون بخش غسل تھا اور اس غسل کے دوران میں نے کچھ فیصلے کئے۔ مجھے یہ بجھا بجھا انداز بدلنا ہو گا! میں نے اپنی خوشی سے یہ سب کچھ قبول کیا ہے پھر یہ اضمحلال کیوں۔ میں جانتا تھا کہ اس قسم کا کاروبار کرنے والے بے حد خطرناک ہوتے ہیں۔ میں اتفاقیہ طور پر ان کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔ اور انہوں نے میرے اوپر اعتبار بھی کر لیا ہے۔ اگر میں ان کے اعتبار پر پورا نہ اترا تو بے دریغ قتل کر دیا جاؤں گا اور میری لاش کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔ اب جب زندگی کو ایک راستہ مل گیا ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور پھر کام بھی دلچسپ تھا۔ دراصل میری خاندانی شرافت اندرونی طور پر مجھے مضمحل کئے ہوئے تھی اور مجھے اس شرافت سے نفرت تھی۔ مجھے اس احساس پر طیش آ رہا تھا۔ آخر اس شرافت نے مجھے اب تک کیا دیا ہے۔ میں اس بیکار شے کو سینے سے لپٹائے ہوئے کیوں ہوں!

"لعنت ہے۔" میں نے زمین پر تھوک دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس وقت کے بعد اپنے آپ کو یکسر تبدیل کر لوں گا! دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ سب بیکار باتیں ہیں۔ اخلاقیات کے ڈھکوسلے صرف زبانی ہیں۔ عملی زندگی میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے اور جو انسان ان سے چمٹا رہتا ہے' ایک دن میری طرح خود کشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر میں ان بہلاووں میں کیوں پڑوں۔ میں نیا انسان ہوں۔ میں اب سرائے عالمگیر کا ایک بے وقوف کسان نہیں ہوں۔ میں اسمگلر ہوں۔ منشیات کا اسمگلر۔ ایک خطرناک انسان' جو ضرورت پڑنے پر ہر وہ کام کر سکتا ہے جس کا اس کے بزرگوں نے تصور بھی نہ کیا ہو۔ میں اس پورے ماحول سے اجنبی ہوں' اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ مجھے کسی سے دلچسپی نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ غسل خانے سے ایک نیا انسان برآمد ہوا ہے۔ بے شک میں نے خود کو بدل لیا۔ قطعی طور پر بدل لیا۔

"دولہے خان۔!" میں نے زور سے آواز لگائی! اور دولہے خان دوڑتا ہوا میرے پاس آگیا۔

"میرا سامان آگیا؟"

"ابھی نہیں صاحب!" اس نے جواب دیا۔

"چائے تیار ہو گئی۔؟"

"ہاں۔؟" دولہے خان نے جواب دیا۔

"لے آؤ!" میں نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اندر پہنچ کر میں نے بال سنوارے۔ اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر چائے کا انتظار کرنے لگا۔ رات ہو گئی تھی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی' لیکن ابھی کھانا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ چائے آگئی اور میں نے اپنے لئے کم دودھ کی تیز چائے بنائی۔ چائے کی دو پیالیاں پی کر میں باہر نکل آیا۔

میں نے اس عمارت کے کمپاؤنڈ میں ہیپی دیکھے تھے۔ چنانچہ میں کمپاؤنڈ میں پہنچ گیا۔ یہاں شاید روشنی کے لیے جنریٹر استعمال کیا جاتا تھا۔ بہرحال درختوں میں روشنیاں لٹک رہی تھیں۔ ماحول بے حد حسین تھا۔ کھلی فضا تھی اس لیے چرس کی بو بھی منتشر ہو جاتی تھی۔ کش لگ رہے تھے' لگ رہے تھے۔ بدمست لوگ خرمستیاں کر رہے تھے' ایک کونے میں ایک نوجوان آلتی پالتی

مارے بیٹھا تھا اور ایک لمبے بالوں والی خوبصورت لڑکی چٹکیاں بجاتے ہوئے اس کے سامنے تھرک رہی تھی۔ اس نے چست پتلون پہنی ہوئی تھی۔ جس سے اس کے بڑے بڑے سڈول کولہے نمایاں ہو گئے تھے۔ کمر پتلی تھی۔ جسمانی طور پر وہ خاصی حسین تھی۔ البتہ چہرہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا!

میں صدر گیٹ کی سیڑھیوں پر کھڑا چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا۔ دلچسپ مناظر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ابھی رات بھیگی تھی۔ بدمستیاں عروج پر نہیں پہنچی تھیں۔ میں انتظار کرنے لگا۔ کسی کونے سے کوئی بدمست سی سسکاری ابھرتی تو میری نگاہ اس طرف اٹھ جاتی۔ مختلف زبانیں بولی جا رہی تھیں۔ مختلف حرکات کی جا رہی تھیں۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دولہے خان مجھ سے زیادہ دور نہ تھا! میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ جلدی سے میرے قریب پہنچ گیا۔ "ایک کرسی اٹھا لاؤ" میں نے کہا اور وہ دوڑ کر اندر چلا گیا۔ پھر وہ کرسی لے آیا۔ اور میں نے ایک درخت کے نیچے کرسی ڈال دی! وہاں بیٹھ کر میں نظارے کرنے لگا۔ تب میری نگاہ ایک اداس لڑکی پر پڑی۔ اس نے ایک پھٹا ہوا سایہ پہنا ہوا تھا' اوپری لباس بھی بوسیدہ تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ بڑی جاذب نگاہ تھی۔ اخروٹی رنگت کے بال پیلا چہرہ' دبلی پتلی' لیکن نقوش جاذب نگاہ۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے دولہے خان کو اشارہ کیا۔ اور وہ میرے نزدیک آ گیا۔

"وہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چہ ہپن ہے صاب" دولہے خان نے دانت نکالتے ہوئے کہا اور میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس "ہپن" نے مجھے خاصا محظوظ کیا تھا۔

"اکیلی ہے شاید؟"

"بلاؤں صاحب۔!" دولہے خان مسکرا کر بولا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ نوعمر لڑکا بھی خاصا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ تب میں نے ایک آنکھ دبا کر اسے اشارہ کیا۔

"بلاؤ۔!"

اور دولہے خان لڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس کے پاس پہنچ کر جھکا اور اس سے کچھ کہنے لگا! ظاہر ہے نہ وہ لڑکی کی زبان سمجھتا تھا اور نہ لڑکی اس کی۔ لیکن اشاروں کی زبان پوری دنیا میں یکساں ہوتی ہے۔ لڑکی نے میری طرف دیکھا! اور پھر وہ مضمحل سے انداز میں اٹھ کر میری طرف بڑھی۔ میری نگاہیں اس کے بوسیدہ لباس کے پیچھے جھانک رہی تھیں۔ اب میں ناتجربے کار نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس لباس کے اندر بہت کچھ ہے چنانچہ اس لڑکی کے ساتھ جو سلوک بھی کیا جائے منافع بخش ہو گا! چند لمحات میں وہ میرے قریب پہنچ گئی۔

"ہیلو۔!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔!" وہ بھی ایک مضمحل سی مسکراہٹ سے بولی۔

"کیا تم تنہا ہو۔؟"

"ہاں۔!" اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا۔

"تب یہاں بیٹھو۔ میں تمہاری اس رات کا ساتھی بن سکتا ہوں۔" میں نے بلا جھجک اسے پیش کش کر دی اور اپنی بے باکی پر اپنے ذہن میں سنسنی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا! لیکن دوسروں کا کہا ہوا ہی درست تھا۔ یہ لوگ ان باتوں سے اجنبی نہیں ہیں۔ اس نے سہارا لینے کے لیے میری ران پر ہاتھ رکھا اور میرے نزدیک ہی زمین پر بیٹھ گئی۔

میں نے اس کے خدوخال بغور دیکھے اور پھر پوچھا۔ "کیا تم برٹش ہو"

"ہاں۔!" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"کرسٹی۔!"

"میرا نام نواز ہے۔ تم اداس کیوں ہو کرسٹی؟" میں نے پوچھا اور جواب میں اس نے عجیب سے انداز میں مجھے دیکھا۔ پھر گردن جھکا لی۔

"ان میں کوئی تمہارا دوست نہیں ہے؟" میں نے پھر پوچھا اور اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"چرس پیو گی۔؟" میں نے پوچھا۔ اور وہ چونک پڑی۔ اس نے پھر میری آنکھوں میں دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی تھی ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کپکپائے تھے۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی۔!

"دولہے خان۔!" میں نے سر پر مسلط جن سے کہا اور وہ جھک گیا۔ "چرس اور پائپ لے آؤ۔!" میں نے اسے حکم دیا اور وہ گردن جھکا کر چلا گیا۔ لڑکی اردو تو نہیں سمجھی تھی لیکن شاید اس نے اندازہ لگا لیا تھا اس کی مراد پوری ہونے والی ہے۔ چنانچہ وہ میری طرف کھسک آئی۔ اس نے اپنی کہنی میرے گھٹنے پر رکھی اور اس پر ٹھوڑی ٹکا دی۔

یہ بے تکلفی کا انداز خاصا دلکش تھا۔ میں اس سے حظ اٹھائے بغیر نہ رہ سکا۔ میری انگلیاں اس کے اخروٹی بالوں میں الجھ گئیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس کے خوبصورت بال دھول اور پسینے سے چکٹ گئے ہیں میں نے آہستہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ تب دولہے خان میری مطلوبہ چیزیں لے آیا۔ جنہیں دیکھ کر اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ کسی ایسے کتے کی طرح مجھے دیکھنے لگی' جس کا مالک کھانا کھا رہا ہو اور کتے کو احساس ہو جائے کہ بس اب وہ ہڈی پھینکنے والا ہے۔!

میں نے چرس کا پیکٹ اور پائپ اس کی طرف بڑھایا اور وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اوہ۔ تھینکیو ڈیر۔ تھینکیو۔ کیا یہ میرے لئے ہے؟"

"ہاں۔ صرف تمہارے لئے۔" میں نے جواب دیا اور وہ بے ساختہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"اوہ۔ تھینکو۔ تھینکو ویری مچ۔" اس نے میرے گالوں کے کئی بوسے لے ڈالے

اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا! گویا یہ اداسی صرف چرس نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ اسے اور کوئی غم نہیں تھا۔ اس نے اپنے بوسیدہ سائے سے ایک مڑا تڑا سگریٹ نکالا۔ گھٹیا قسم کے سگریٹ کو اس نے احتیاط سے ہتھیلی پر رکھا اور پھر اس کا تمباکو نکالنے لگی۔

"دولیے خان۔" میں نے دولیے خان کو آواز دی۔ اور وہ پھر جھک آیا "سگریٹ کا ایک پیکٹ۔!" میں نے کہا۔ اور وہ چلا گیا۔ لڑکی نے سگریٹ کا تمباکو نکال لیا تھا اور پھر وہ چرس کا پیکٹ پھاڑنے لگی مجھے شرارت سوجھی میں جھکا اور ---- اس کی ہتھیلی پر پھونک مار دی۔! وہ اچھل پڑی۔ تمباکو بکھر گیا۔ پہلے اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر زمین پر پڑے تمباکو کو۔ اور پھر اس نے معصومانہ انداز میں ہاتھوں میں پکڑا ہوا پاپ سینے سے بھینچ لیا۔ میری اس حرکت کو وہ نہ سمجھ سکی تھی۔

پھر جب دولیے خان نے سگریٹ کا پیکٹ مجھے دیا اور میں نے اسے تو اس کی آنکھوں کی چمک پھر لوٹ آئی۔ اوہ۔ تھینکیو۔ تھینکیو۔" ایک بار پھر وہ اٹھی اور میرے گالوں کے کئی بوسے لے ڈالے۔

عورت۔ دنیا کی سب سے قیمتی شے۔ جس کا حصول سب سے مشکل ہے جس کے لیے شہنشاہوں نے سلطنتیں چھوڑ دیں۔ جس کے لیے ہوشمندوں نے صحراؤں کی خاک چھانی، جس کے لیے ناتواں انسان نے پہاڑوں کے جگر چیر کر نہر نکال دی جس کے لیے قدم قدم پر زندگی داؤ پر لگا دی گئی۔ جسے خوش رکھنے کے لیے کائنات کا نقشہ بدل دیا گیا یہاں کس قدر ارزاں تھی۔ اس کے نازک لبوں کے لمس پر تو زندگی قربان کی جا سکتی تھی، اس والہانہ انداز کے لیے تو سب کچھ مٹایا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ سگریٹ کے ایک پیکٹ اور چرس کی تھوڑی مقدار کے عوض مل گیا تھا۔!

اس نے پھر ایک سگریٹ خالی کیا۔ اس کے تمباکو میں چرس کی تھوڑی سی مقدار ملائی اور اسے ہتھیلی پر رگڑنے لگی۔ نہایت جانفشانی سے اس نے سگریٹ تیار کیا اور جب وہ بھر گیا تو اسے بڑے پیار سے دیکھا۔ ہونٹوں سے چوما اور پھر ہونٹوں میں دبا لیا۔ میں اس کی والہیت دیکھ رہا تھا۔ جونہی اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا، میں نے ماچس کی تیلی جلا کر اسے سلگایا اور اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔ دو تین کش اس نے بڑی بے قراری سے لئے اور پھر سگریٹ میری طرف بڑھا دیا۔

"نو تھینکس۔" میں نے گردن ہلائی۔ میرے اس انکار پر اسے شاید خوشی ہی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی تکلف نہیں کیا۔ میں نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسی کے انداز میں ایک سگریٹ میں چرس بھرنے لگا۔

اسی وقت کسی تان سین کی رگ موسیقی پھڑک اٹھی اور اس کے حلق سے ایک بے ہنگم نغمہ پھوٹ پڑا۔ میری نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک جرمن نوجوان تھا، بالوں سے ڈھکا ہوا۔ اس کے جسم میں صرف دو چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ بال اور پسلیاں۔ نچلے حصے میں ایک پتلون چپکی ہوئی تھی اوپری لباس زمانے کی نذر ہو گیا تھا، ہاں گلے میں موٹے موٹے دانوں کی ایک مالا پڑی ہوئی تھی، جسے شاید اس نے اوپری لباس تسلیم کر لیا تھا اور مطمئن ہو گیا تھا۔

ہڈیوں، پسلیوں کا یہ نقارہ جھوم جھوم کر گاتا رہا۔ چند نوجوان اور لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو کر تھرکنے لگے۔ وہ سب بھی خوب نشے میں تھے ان کے قدم ٹھیک سے نہ اٹھ رہے تھے۔

کرسٹی کا سگریٹ ختم ہو گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا، اور میں نے اپنا تیار کیا ہوا دوسرا سگریٹ اسے پیش کر دیا۔ "اوہ۔ تھینکیو۔ تھینکو۔" اس نے گلابی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سگریٹ لے لیا۔ پھر اس نے وہ سگریٹ بھی سلگا لیا اور اس کے گہرے گہرے کش لینے لگی! اظہار ممنونیت کے طور پر اس نے اپنا نازک، لمبی انگلیوں والا سفید ہاتھ میری گود میں رکھ دیا۔ اپنا سر میرے گھٹنے سے ٹکا دیا اور نیم باز آنکھوں سے گاتے ہوئے نوجوان کو دیکھنے لگی۔ لیکن اس کے مرمریں ہاتھ سے میرے جذبات بھٹکنے لگے۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ میں خود میں ہیجان محسوس کرنے لگا۔ کرسٹی کو احساس بھی نہ تھا کہ بے خیالی میں اس نے کتنے فتنے جگا دیئے ہیں۔ میرے جسم میں نشہ آور انگڑائیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ اور جب میں خود پر قابو نہ پا سکا تو میں نے جھک کر کرسٹی کی گردن چوم لی۔! اس نے اپنا ہاتھ میری گود سے ہٹا کر میری گردن میں حمائل کر دیا اور گویا میرے بوسے کی پذیرائی کی۔

"کرسٹی ڈارلنگ۔ کیا تم یہ رات میرے ساتھ گزارنا پسند کروں گی؟" میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

"تم۔ تم محبت کے خدا ہو ڈارلنگ۔ میرا انگ انگ تمہارا ہے۔" اس نے گردن جھٹک کر اپنے تمام بال ایک طرف گراتے ہوئے کہا اور میں خوشی سے سرشار ہو گیا۔ میں نے کرسی چھوڑ دی۔ اسے ہاتھ کا سہارا پیش کیا۔ اس نے دوسری سگریٹ کا آخری کش لیا اور میرا سہارا لے کر اٹھ گئی۔ اب اس کے چہرے پر اداسی کا نام بھی نہیں تھا۔ زرد رنگ کے نیچے خون دوڑنے لگا تھا جس سے اس کے حسن میں اضافہ ہو گیا تھا۔

میں خوش تھا۔ نئی زندگی کا فیصلہ کرنے کے بعد یہ میرا پہلا جرات مندانہ قدم تھا، اور مجھے ناکامی نہیں ہوئی تھی، میں اسے ساتھ لئے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ سگریٹ کا پیکٹ اور چرس کی گولیاں گویا مقناطیس کا کام دے رہی تھیں سب کچھ انہی کے لیے تھا۔ لیکن اب میں جذباتی نہیں تھا۔ میں نے ہر چیز کی اہمیت تسلیم کر لی تھی۔ گیلتھ نے صاف گوئی سے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ یہ رات گزارنے کے بعد وہ مجھے بھول جائے گی۔ میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اگر میں اس لڑکی سے بھی یہ سوال کرتا تو شاید وہ بھی مجھے یہی جواب دیتی لیکن اب میں ایسے احمقانہ سوالات کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ بے کار۔ بے وقوفی۔ رات گزارو اور بھول جاؤ۔ پوری دنیا تنہا ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے۔ ضرورت سب کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ ضرورت پوری کرو اور سب کچھ بھول جاؤ۔ یہی دستور دنیا ہے اور اس دستور سے انحراف تکالیف اور الجھنیں پیدا کرتا ہے۔ کرسٹی نے میرے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھ کر چاروں طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے۔ بذات خود وہ نہ جانے کیا ہو گی۔ ممکن ہے ایسے کمرے اس کے ملازموں کے ہوں۔ وہ دنیا تج چکی تھی۔

"کیا تم کھانا کھاؤ گی کرسٹی۔؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کھانا۔؟" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ہاں۔ میں نے صبح کو ایک سوکھی ڈبل روٹی پانی میں بھگو کر کھائی تھی۔ اس کے بعد سے کچھ نہیں کھایا" اس نے جواب دیا۔

"اوہ۔ میں کھانا منگواتا ہوں۔ لیکن میرے خیال میں اس سے پہلے تم غسل کر لو۔"

وہ ہنسی۔ اور پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "جیسی تمہاری مرضی ڈارلنگ۔" گویا اس کے نزدیک غسل وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی' لیکن میں اس رات کو اسے اپنے قابل بنانا چاہتا تھا' میں جو کچھ خرچ کر رہا تھا اسے اپنی مرضی کے مطابق وصول کرنا چاہتا تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی اور دولہے خان اندر آگیا۔ اس مردود کے دانت اب بھی نکلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں وہی عجیب سی چمک تھی' جو مجھے غصہ دلاتی تھی!

"تمہارے پاس کوئی شلوار قمیض ہو تو لے آؤ۔ صاف اور دھلی ہوئی۔" میں نے کہا اور دولہے خان ہنستا ہوا چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد اس نے گہرے نیلے رنگ کی ایک شلوار اور قمیض لا دی۔ میں نے کرسٹی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر کمرے سے نکل آیا۔ باتھ روم میں پہنچ کر میں نے اس سے غسل کرنے کو کہا۔

"یہ کپڑے پہن کر میرے کمرے میں آجاؤ۔ میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور کرسٹی نے گردن ہلا دی۔ اس نے سنجیدگی سے کپڑے ہاتھ میں لے لیے۔ اور میں واپس اپنے کمرے کی طرف چل پڑا' راستے میں' میں نے دولہے خان سے کھانے کے لیے کہہ دیا تھا! تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد کرسٹی واپس آئی تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

چاند گہن ۔۔ نکل آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے غسل کرنے سے اس کے خدوخال بھی نکھر گئے ہوں۔ بھیگے ہوئے بال بڑے شاعرانہ انداز میں الجھ گئے تھے۔ سرخ ہونٹوں کی تازگی ابھر آئی تھی۔ چہرے کی پیلاہٹ بھی دھل گئی تھی جو شاید غبار کی تہہ کی وجہ سے گہری نظر آتی تھی۔ غرض وہ ہر طرح قابل قبول ہو گئی تھی۔ نیلے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی قمیص اور شلوار بھی اس کے جسم پر کھل گئی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئے میرے پاس آگئی۔ میں اسے دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ غسل کرنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں گلابی ہو گئی تھیں۔ میں نے بے ساختہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب وہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھی اتنے میں دولہے خان کھانا لے آیا اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ پھر ہم دونوں نے کھانا شروع کر دیا' پاکستانی کھانا تھا۔ گوشت میں سالم ہری مرچیں پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ خوب مزے لے لے کر کھاتی رہی' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ناک سرخ ہو رہی تھی لیکن وہ چٹخارے لے لے کر کھا رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر کافی پی گئی۔ اور پھر جب دولہے خان برتن وغیرہ لے کر چلا گیا تو اس نے وہ دروازہ اندر سے بند کر لیا!

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ڈھیلے ڈھالے نیلے رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس یہ غیر ملکی دوشیزہ بالکل بے وقوف نہیں تھی۔ وہ میری عنایات کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ سودا ہو چکا

اور وہ ایک ایماندار دوکاندار کی طرح گاہک کی خدمت کے لیے تیار تھی۔ لیکن غسل نے اس کا نشہ اکھاڑ دیا تھا۔ اور یہ صورت حال اسے کسی طرح گوارہ نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے مجھ سے اجازت طلب کی۔

"اگر اجازت ہو ڈارلنگ تو ایک۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں۔ ضرور۔" میں اس کی ضروریات سے واقف تھا۔ چنانچہ اس نے مسہری کے قریب میرے قدموں میں بیٹھ کر سگریٹ بھرنا شروع کر دیا۔ اس دوران وہ مسکراتے ہوئے میری طرف بھی دیکھ رہی تھی۔

"ڈارلنگ۔!" اس نے تمباکو میں چرس کی گولی ملاتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے۔؟"

"یہاں پر پیتھیڈین نہیں مل سکتی۔؟"

"شاید مل جائے۔"

"صرف ایک انجکشن۔ میں پوری زندگی دعائیں دیتی رہوں گی۔ ایک ماہ ہو گیا۔ میں نے انجکشن نہیں لیا۔؟"

"آج مشکل ہے۔ کل میں کوشش کروں گا۔!" میں نے کہا۔

"اوہ۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔ جب سے جیمسن مجھ سے جدا ہوا' میں نے کوئی انجکشن نہیں لیا۔"

"جیمسن کون تھا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اوہ۔ سوئٹ جیمسن۔" اس نے تمباکو سگریٹ میں بھرتے ہوئے کہا۔ "میری ماں کہتی تھی کہ جیمسن نے بھی اسی کے پیٹ سے جنم لیا ہے۔ لیکن سوئٹ جیمسن حقیقت پسند تھا۔ اس نے ہر احتجاج مسترد کر دیا اور جب انکل میڈرے کی کاک ٹیل پارٹی میں اس نے میری قمیص کے گریبان کے بٹن کھول کر میرے سینے کا بوسہ لیا تو ایک بے وقوف انسان نے اپنا پستول اس پر خالی کر دیا۔ گولیاں بھٹک گئیں' تاہم جیمسن کا بازو زخمی ہو گیا۔ یہ بے وقوف انسان ہم دونوں کا باپ تھا لیکن "ترلوکا" کی تعلیم ہے کہ سب رشتے انسان نے بنائے ہیں اس نے خواہ مخواہ شخصیتوں پر تہذیب کے خول چڑھا دیئے ہیں۔ حوا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں اور وہ آدم کی ضرورت تھی۔ ہر عورت مرد کی ضرورت ہے' تہذیب کے خول بے معنی ہیں اور میں نے اور میرے بھائی نے ترلوکا کی تعلیمات اپنالی تھیں۔ چنانچہ میں اپنے زخمی بھائی کو لے کر آندرے کے پاس چلی گئی' آندرے جو حقیقت کا علمبردار تھا' ہم نے بھری محفل میں ایک دوسرے کو اپنا جسم پیش کر کے دقیانوسی گدھوں کا مذاق اڑایا۔ اور دقیانوسی گدھے ہماری جان کے لاگو ہو گئے تب موسیو آندرے کے ایماء پر ہم نے وطن چھوڑ دیا۔ اور دنیا کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ میری ہر رات جیمسن کی رات تھی۔ ہم لوگ ارض مقدس کی زیارت کے لئے آئے تھے۔ لیکن۔ ایران کی سرحد میں' جیمسن نے میرا ساتھ چھوڑ وہ سخت بخار میں مبتلا ہو کر چل دیا۔ اور میں تنہا رہ گئی۔ آہ جیمسن۔!" اس نے ایک گہری

سانس لے کر سگریٹ ہونٹوں میں دبالیا۔ پھر اس نے ماچس لیکر سگریٹ سلگایا اور اس کے گہرے گہرے کش لے کر جیمسن کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی۔!

میرے دل میں نفرت و کراہت کا ایک طوفان اٹھا تھا۔ مجھے اس لڑکی سے گھن آنے لگی تھی جس کی زندگی کا پہلا مرد اس کا بھائی تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دوں۔ میں نے ایک جلتی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ بڑے سکون سے سگریٹ کے کش لے رہی تھی اور چرس کے بھکے اس کے منہ سے خارج ہو رہے تھے۔ تب میرے ذہن نے کروٹ بدلی۔! جیمسن اس کا بھائی تھا۔ لیکن وہ میری کون ہے۔ میں کوئی تہذیب کا علمبردار ہوں۔ مجھے شرافت و انسانیت کی یہ تڑپ اپنے دل سے کھرچ پھینکنی چاہیے۔ وہ عورت ہے۔ اور میں نے اس حقیر عورت کی قیمت چکا دی ہے۔ بس۔ اس کے بارے میں اور کچھ سوچنا حماقت ہے۔ قیمت وصول کرو۔ اور اسے دھکے دے کر باہر نکال دو۔ میں ایک وحشی درندے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا' میں نے اسے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ اور وہ کسی قدر حیرت کسی قدر خوف سے مجھے دیکھنے لگی! سگریٹ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ جسے میں نے جوتے سے مسل دیا۔ اسے اٹھا کر مسہری پر پھینک دیا۔ اور گدے دار مسہری پر وہ کئی بار اچھلی۔ تب میں نے نیلے رنگ کی قمیص نیچے تک پھاڑ دی۔ اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ پھر میں نے شلوار بھی ایک جھٹکے سے اتار کر دور پھینک دی۔ میری وحشت عروج پر تھی۔ اس کا مرمریں جسم میری نگاہوں کے سامنے تھا! مجھے اس جسم پر طیش آ رہا تھا۔ میں اس سے انسانیت کی تہذیب کی توہین کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ چرس اس نے پی لی تھی' نشہ مجھے ہو گیا تھا۔ لیکن چند لمحات کے بعد اس کا خوف مسرت میں بدل گیا۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ جاگ اٹھی۔ ہونٹوں سے سسکاریاں ابل پڑیں۔

"مجھے۔ مشرق۔ کی۔ یہی وحشت پسند ہے۔" اس نے کہا اور ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے دن وہ مجھے عمارت کے لان میں نظر آئی۔ وہ کسی سے سوئی دھاگہ ادھار مانگ کر پھٹی ہوئی نیلی قمیص سی رہی تھی۔ میرے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ "ہیلو۔!" اس نے بڑی دلکش آواز میں مجھے پکارا۔ لیکن میں گردن پھیر کر اس کے قریب سے نکلا چلا گیا۔ کافی دور جا کر میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ اطمینان سے اپنی قمیص سینے میں مصروف تھی۔ اس سے قبل کہ میں کچھ سوچتا۔ مجھے اپنے قریب غلام سیٹھ کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو نواز۔!" اور میں چونک پڑا۔

"ہیلو سر۔" میں نے غلام سیٹھ کو دیکھ کر کہا۔

"کہو۔ رات کیسی گزری؟"

"مناسب۔" میں نے جواب دیا۔

"آؤ۔" اندر آؤ۔!" اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم

ایک سجے سجائے کمرے میں بیٹھے تھے۔ غلام سیٹھ کے طلب کرنے پر کافی آگئی تھی اور اس نے بے تکلفی سے ایک پیالی بنا کر میرے سامنے رکھ دی تھی۔

"جو کام ہم نے تمہارے سپرد کیا ہے' وہ بے حد اہم ہے۔ حالانکہ تم ہم میں ایک اجنبی کی طرح آئے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں۔ اجنبیت کے تمام پردے چاک ہوتے گئے۔ اور اب ہم تم پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ شاید تمہاری پر اثر شخصیت کا کرشمہ ہے۔ کیا تم اب بھی ہمارے درمیان خود کو اجنبی سمجھتے ہو؟"

"نہیں غلام سیٹھ۔ میں دنیا کے اسرار و رموز سے آگاہ ہوتا جا رہا ہوں۔ تھوڑی سی کمی ہے' وہ بھی پوری ہو جائے گی!" میں نے جواب دیا۔

یقیناً۔ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بڑی خوش فہمیاں لے کر آتے ہیں۔ سوچتے ہیں دنیا کسی تصوراتی دیوی کی طرح سفید پر پھیلائے ان کے استقبال کے لیے کھڑی ہوگی۔ لیکن بہت بعد میں ان کی خوش فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ تصوراتی دیوی کا کوئی وجود نہیں ملتا' ہاں کالی دیوی اپنی لمبی سرخ زبان نکالے' جس سے خون ٹپکتا ہے۔ تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ہر جگہ مل جاتی ہے۔ اور وہ اس کے خوف سے سہم جاتے ہیں۔ کچھ کالی دیوی کے خوف سے خود کشی کر لیتے ہیں۔ کچھ اس کے مقابلے پر ڈٹ جاتے ہیں' اور ڈٹ جانے والوں کو دیکھ کر کالی دیوی زبان اندر کر لیتی ہے۔ اس کے ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہ منہ لٹکائے پیچھے ہٹتی چلی جاتی ہے۔ پھر مایوسیوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ کامرانیاں قدموں پر سر رگڑتی ہیں اور زندگی کے مقصد حاصل ہونے لگتے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نواز۔ کوئی انسان فطرتاً" برا نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی کے بہت سے ادوار ہوتے ہیں۔ ابتداء معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ معصومیت وزنی بوٹوں تلے کچلی چلی جاتی ہے اور پھر ہم بھی ویسے ہی جوتے خرید لیتے ہیں تاکہ کچلنے والوں میں شامل ہو جائیں' اگر ہم یہ جوتے خریدنے کی استطاعت نہ پیدا کر سکے تو۔ پھر ان جوتوں کے شکار بن جاتے ہیں۔!"

سیاہ چشمے والے غلام سیٹھ کی یہ باتیں بے حد عجیب تھیں۔ بظاہر یہ صرف ایک جرائم پیشہ شخص نظر آتا ہے لیکن اس کے پس منظر میں بھی کچھ تھا یقیناً اس سیاہ چشمے کے عقب میں پوشیدہ آنکھوں میں عمیق گہرائیاں ہوں گی نہ جانے ان آنکھوں نے کون کون سے رنگ دیکھے ہوں۔! میں نے ایک گہری سانس لے کر غلام سیٹھ کو دیکھا۔ کبھی کا بیروزگار نوجوان' امنگیں لئے سڑکوں پر نکلا ہو گا۔ ٹھوکریں ملی ہوں گی۔ لیکن اب وہ ایک مضبوط چٹان تھا۔ ایک مکمل انسان تھا۔ میں بھی اس طرح مکمل ہو سکتا تھا۔ میں بھی خود میں اعتماد پیدا کر سکتا تھا۔ یقیناً۔ یقیناً۔

"میں تم سے اتفاق کرتا ہوں غلام سیٹھ۔"

"کسی بھی کچلی ہوئی شخصیت سے نفرت نہ کرو۔ انسان فطرتاً" برا نہیں ہوتا۔ حالات اس کی شخصیت کو روپ دیتے ہیں۔" غلام سیٹھ نے کہا پھر بولا۔ "چھوڑ ان باتوں کو۔ میں تم سے کام کی باتیں کرنے آیا ہوں' اس نے کہا اور میں نے ذہن جھٹک دیا۔

"تمہیں تمہارا کام بتایا جا چکا ہے۔ منشیات کے اسمگلروں کے گروہوں کا سراغ لگا کر ان کے

کاروبار کا جائزہ لینا ہے۔ اور اس کی تفصیل ہمیں بھیجنا ہے۔ اس سلسلے میں تمہارا واسطہ خطرناک لوگوں سے پڑے گا! تمہیں ان سے نپٹنے کے لیے تربیت دی جائے گی۔ پستول چلانا جانتے ہو۔؟"

"نہیں۔!" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہیں یہاں تقریباً" دو ماہ رہنا ہو گا۔ اس دوران تمہیں تمام رموز سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ اسی دوران اپنی شخصیت بھی بدل لو۔ اپنے اندر ایسی خوبیاں پیدا کرو کہ تمہارے مداح پیدا ہو جائیں۔ تمہیں ہر صورت میں ناقابلِ تسخیر ہونا چاہیے۔"

"میں تیار ہوں۔ میرے لیے جو بھی فیصلہ کیا جائے گا مجھے منظور ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم تمہیں ایک مضبوط ترین انسان بنا دینا چاہتے ہیں۔ تم ہمارے لیے ایک قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہو۔ کل سے تمہاری تربیت شروع ہو جائے گی۔"

"بہت بہتر۔ میں نے جواب دیا۔ اس کے بعد غلام سیٹھ مجھے کچھ ضروری ہدایات دیتا رہا۔ اور میں گردن ہلاتا رہا۔ پھر وہ اٹھا اور مجھ سے مصافحہ کر کے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک بیٹھا رہا' اس نے جو کچھ کہا تھا' وہ میرے دل میں اتر گیا۔ حقیقت میرے سامنے ننگی ہوئی تھی۔ دنیا کے تمام اقدار جھوٹے ہیں۔ ہر انسان صرف خود سے محبت کرتا ہے۔ اپنے لیے جیتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے اسے جو کچھ بھی کرنا پڑے جائز ہے۔ اس کے خیالات' تصورات اسے جہاں بھی لے جائیں' وہیں اس کی ضرورت ہوتی ہے میں ایک نیا انسان بن گیا تھا۔ اب میں غلام سیٹھ کے منصوبے میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ میں ہر کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ پھر میں اس کمرے سے نکل آیا۔ فی الحال کوئی کام نہیں تھا۔ میرا شیو بڑھ گیا تھا۔ میں اسے بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن غلام سیٹھ سے گفتگو کے بعد اس کا سوال ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے چند چیزیں چھوڑنا تھیں۔ چند اپنانا تھیں۔ میں لان میں نکل آیا۔ تب میری نگاہ کرسٹی پر پڑی۔ کرسٹی اپنی قمیص سی کر پہن چکی تھی' اور اب وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے بڑے مزے سے بیٹھی چرس بھرا ہوا سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک امریکن نوجوان موجود تھا۔ پتلا لمبا چہرہ' ویران آنکھیں' وہ بھوکے کتے کی طرح کرسٹی کے ہونٹوں سے خارج ہوتے دھویں کو دیکھ رہا تھا۔!

نہ جانے کیوں اس وقت مجھے کرسٹی بری نہ لگی۔ میرے نظریات یکسر بدل گئے تھے۔ میرے قدم اس کی طرف بڑھ گئے۔ امریکن نوجوان نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ لیکن میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

"ہیلو کرسٹی۔!" میں نے اسے پکارا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی! چند ساعت دیکھتی رہی۔ خالی خالی آنکھوں سے۔ اور پھر ان آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"ہیلو ڈیر۔!" اس نے پھیلی ہوئی ٹانگیں سکیڑ لیں۔

"آؤ۔!" میں نے اس سے کہا اور اس نے جلدی سے چرس بھرا ہوا سگریٹ اوپر اچھال دیا۔ امریکن نوجوان نے سگریٹ ہاتھوں میں لپک لیا تھا۔ کرسٹی میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ میں کافی تیز چل رہا تھا اس لیے کرسٹی کو تقریباً" دوڑنا پڑ رہا تھا۔ پھر وہ چھلانگ لگا کر اس طرح میرے سامنے آ گئی

کہ مجھے رک جانا پڑا۔

"کل تم نے ایک وعدہ کیا تھا ڈارلنگ۔؟" اس نے میری قمیص کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے یاد ہے۔!"

"اوہ۔ تھینکو۔ تھینکو۔!" اس نے مخصوص انداز میں کہا اور پھر وہ میرے ساتھ میرے کمرے میں آ گئی۔ دولہے خان میرے کمرے کے دروازے پر موجود تھا۔ اس نے کرسٹی کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے اس کی نگاہوں پر غور نہیں کیا تھا۔!

"سنو۔!" میں نے اس سے کہا اور وہ میری طرف جھک آیا۔ "پتیھڈین کا ایک انجکشن اور سرنج لے آؤ۔!" میں نے اس سے کہا اور وہ گردن ہلاتا ہوا چل دیا۔ کرسٹی میرا بازو پکڑے اندر آ گئی۔ اندر آتے ہی وہ اچھلی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سنبھال لیا تھا۔!

چرس کی بو میں ڈوبے ہوئے ہونٹ میرے ہونٹوں سے چپک گئے۔ لیکن اب اس خوشبو سے نفرت کرنا بے معنی تھا۔ یہ تو میری زندگی میں رچ گئی تھی۔ میں نے اس کے بوسے کی بھرپور پذیرائی کی۔ کرسٹی کے ہاتھ بھی چل رہے تھے۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ خوش کرنا چاہتی تھی۔ میری آنکھیں جلنے لگی۔ لیکن ابھی دولہے خان آنے والا تھا۔ میں نے خود پر قابو رکھا تھوڑی دیر کے بعد دولہے خان ایک ٹرے میں انجکشن اور سرنج وغیرہ لے آیا۔ اس نے ٹرے ایک تپائی پر رکھ دی۔ اور ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم واپس جاؤ۔!" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور وہ گردن جھٹک کر باہر نکل گیا۔ اس دوران کرسٹی لپک کر ٹرے کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ اس نے بے صبری سے سرنج بھری اور پھر بازو میں جھونک لی۔ سرنج کا سیال اس کے بازو میں اترتا جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی! سرنج خالی کر کے اس نے رکھ دی اور پھر گردن ہلاتے ہوئے بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

"اوہ۔ سوئٹ جیمسن۔ سوئٹ نو۔ واز۔ اوہ۔ سوئٹ۔" اس نے آگے بڑھ کر میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ پتیھڈین کے صرف ایک انجکشن نے اسے ہوش و حواس سے عاری کر دیا تھا۔ یا پھر یہ انجکشن اس کے حواس واپس لے آیا تھا۔ اسے اپنا وطن یاد آنے لگا۔ بیتے ہوئے لمحات یاد آنے لگے اس نے بہت سے لوگوں کا نام لیا۔ یہ سب نہ جانے اس کے کون تھے۔ اور پھر اس نے مجھے اپنا سب سے بڑا ہمدرد گردانا اور محبت سے مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کی بانہیں اب بھی میرے ذہن کے گوشوں کو ٹٹول رہی تھیں۔ لیکن میں ہر اس رخنے کو بند کرنے پر تلا ہوا تھا' جس سے انسانیت جھانکنے لگتی تھی اور جب ہر دراڑ بند ہو گئی۔ کوئی سوراخ باقی نہ رہا تو میں نے کرسٹی کو اٹھا کر مسہری پر لٹا دیا۔!

بلا کا نشانہ باز تھا یہ زردار خان بھی۔ اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے ایک عمدہ نشانہ باز

بنا دیا تھا۔ ہم دونوں پہاڑیوں میں نکل جاتے اور بچوں کی طرح پستول سے کھیلتے۔ اب میں ایک لمحے کے آٹھویں حصے میں اپنے بغلی ہولسٹر سے پستول نکال کر سامنے والے پر فائر کر سکتا تھا اور زردار خان نے اتنی جلدی اتنی مہارت حاصل کرنے پر مجھے مبارکباد دی تھی میرے گالوں پر اب بھورے روئیں خاصے نیچے لٹک آئے تھے۔ بالوں میں تیل ڈالنے کا تو پہلے بھی عادی نہیں تھا۔ اب بالکل ہی خشک اور جھنکاڑ کی شکل کے رہنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ غلام سیٹھ کے ایک خاص آدمی نے مجھے ایک اور خاص کام سکھانا شروع کر دیا تھا۔ یہ تھا تاش کا کھیل۔!

میں اس شخص کو حکم کا بادشاہ کہتا تھا۔ بے شک باون تاش اس کے اشارے پر ناچتے تھے۔ کیا مجال ہے جو کوئی تاش اس کی مرضی کے خلاف ہو جائے۔ اس سلسلے میں اس نے مجھے پہلا سبق دیا تھا۔ داہنے ہاتھ کی کلمہ شہادت کی انگلی کا۔ اس نے بتایا تھا کہ تاش کا پورا کھیل اس انگلی کے گرد گھومتا ہے اور قسمت بدلنے میں، قسمتیں بگاڑنے میں، قسمتیں سنوارنے میں یہ انگلی مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اور میری یہ انگلی بڑی تیزی سے مہارت حاصل کرنے لگی۔

"دراصل۔" غلام سیٹھ نے کہا۔ "ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر جگہ تمہیں دولت مہیا کر سکیں، اس لیے تمہیں خود بھی اس کے لیے کوشش کرنی ہوگی۔ اور اس کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں چلے جاؤ۔ تمہیں جوئے خانے ضرور مل جائیں گے اور تمہارا کھیل ہر خطے میں تمہاری ضرورت پوری کرتا رہے گا۔"

بہرحال۔ مجرمانہ زندگی کے جتنے بھی لوازمات تھے، میں ان میں طاق ہوتا جا رہا تھا۔ دن بھر انہیں تفریحات میں گزرتا اور رات کسی گدائی ہوئی لڑکی کی آغوش ہیں۔ چرس، کوکین، افیون، ہیروئن، مارفیا، پتیھڈین راکٹ اور دوسری منشیات کے عوض ہر رات مجھے کوئی لڑکی مل جاتی تھی۔

شرافت و انسانیت کا ہر رخنہ بند ہو گیا تھا۔ سوچنے کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔ اب میں دن بھر میں چرس کے دس بارہ سگریٹ پی ڈالتا تھا۔ دوسری نشہ آور اشیاء بھی استعمال کر سکتا تھا لیکن عادتاً نہیں۔ ضرورتاً۔ ان لوگوں میں ضم رہنے کے لئے۔ مجھے ان کی طرح خود کو بھلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں اس کا اظہار کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ غلام سیٹھ نے مجھے ہر قسم کا نشہ اتارنے کی ادویات بتا دی تھیں جو انتہائی معمولی قیمت پر ہر جگہ مل جاتی تھیں۔

اور پھر ایک شام، میں ایک خوبصورت گٹار لئے۔ مناسب لباس میں اسی لان میں پڑا تھا، جہاں دوسرے ہی پڑے رہتے تھے۔ میرا لباس دوسرے لوگوں سے قدرے بہتر تھا، میرا گٹار بھی قیمتی تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے پاس چرس کی کافی مقدار موجود تھی۔ میں ایک درخت سے ٹیک لگائے ایک خوبصورت پائپ سے چرس کے کش لے رہا تھا۔ میری زبان کے نیچے Pyridin کی ننھی سی سرخ گولی دبی ہوئی تھی جو چرس کے ہر گہرے سے گہرے کش کو ناکام بنا رہی تھی کہ ایک جوڑا میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ بظاہر وہ مجھ سے بے نیاز تھا لیکن میں نے لڑکی کی للچائی ہوئی نگاہیں خود پر پڑتے دیکھیں۔ اس نے کئی بار مجھے چور نگاہوں سے دیکھا تھا اور میں نے یہ بات بخوبی محسوس کی تھی۔!

مرد نے اپنی پھٹی ہوئی پتلون سے غیر ملکی کرنسی کے چند نوٹ نکالے اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ فوراً" ہی ایک اٹینڈنٹ اس کے پاس پہنچ گیا۔ اور مرد نے نوٹ اس کے حوالے کر کے چرس اور سگریٹ طلب کی جو تھوڑی دیر کے بعد اسے مہیا ہو گئی۔ چرس کی گولیوں کا پیکٹ اس نے احتیاط سے لڑکی کی گداز ران پر رکھ دیا اور پھر سگریٹ خالی کرنے لگا۔!

لڑکی نے اس دوران کئی بار مجھے گھورا تھا۔ ایک بار مجھ سے نگاہ ملنے پر وہ مسکرائی تھی اور میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا پھر وہ بار بار مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ اور پھر چرس بھرے سگریٹ کا ایک کش لیتے ہوئے اس نے مرد کو میری طرف متوجہ کیا۔ طویل القامت اور مضبوط بدن کے نوجوان نے میری طرف دیکھا اور اس کے پیلے دانت نکل پڑے۔

"ہیلو۔" اس نے میری طرف ہاتھ ہلایا اور میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ تب وہ دونوں کھسک کر میرے پاس آ بیٹھے۔ لڑکی نے میرے گٹار کے تار انگلیوں سے چھیڑنا شروع کر دیئے۔ اور موسیقی کی آواز پر دوسرے ہپیوں کی گردنیں میری طرف اٹھ گئیں۔ وہ سب آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے پھر غول بیابانی ہر جگہ سے اٹھا اور میرے گرد جمع ہونے لگا! لڑکی مسکرا رہی تھی۔ اس کا ساتھی مسکرا رہا تھا۔! وہ سب خاموش تھے۔ ہاں نگاہیں مجھ سے فرمائش کر رہی تھیں۔

اور ان لوگوں سے گھلنے ملنے کے لیے ان کی فرمائش پوری کرنا ضروری تھا۔ میں نے گٹار اٹھا لیا اور بوجھل تالیوں سے فضا گونج اٹھی۔ دھوئیں کے مرغولوں میں اضافہ ہو گیا اور کھلی ہوئی فضا غبار آلود ہو گئی۔ تب میری گٹار کے تاروں سے ایک نغمہ ابل پڑا۔ وہ نغمہ جو ان لوگوں کے لیے اجنبی تھا۔ لیکن جس کی دلکشی مسلم تھی۔ جس کی دھن روحوں کو جذب کر لیتی تھی!

لال میری پت رکھیو بھلا۔ جھولے لالن!

ایک لمحے کے لیے وہ سب مبہوت ہو گئے۔ یہ انوکھا نغمہ ان کے لیے اجنبی تھا۔ لیکن اس کی مست کن آواز نے ان کے جسموں کو پھونک دیا۔ کسی کونے سے ایک تیز کوک سنائی دی اور ایک بدمست لڑکی اپنے سنہری بال بکھیرے میدان میں کود پڑی۔ اس کے جسم میں رعشہ آ گیا تھا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ میرے گرد جمع پاؤں بھی تھرکنے لگے! اور لال میری پت نے سب کو بے خود کر دیا۔ وہ ہیجان خیز انداز میں رقص کرنے لگے! میرے قریب آ بیٹھنے والا جوڑا بھی اٹھ کر رقص کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔

وہ رقص کرتے رہے۔ بہت سے مقامی لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ سب کے سب دلچسپ نگاہوں سے ناچنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ جن کے قدم تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ بکھرے ہوئے بال، ہل رہے تھے۔ چیخیں گونج رہی تھیں اور نہ جانے کیوں میرے ذہن میں بھی اس نغمے کا سرور رچ گیا تھا۔ میں بھی جھوم جھوم کر گٹار بجا رہا تھا۔ ناچنے والے تھک تھک کر زمین پر گرنے لگے۔ ان کی رفتار سست ہوتی جا رہی تھی، بہت سے لوگ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے بہت سے اب صرف جھوم رہے تھے اور جب سب کی حالت دگرگوں ہو گئی تو میں نے آہستہ آہستہ نغمہ بند کر دیا۔ نغمہ بند ہوتے ہی ایک عجیب سا سکوت چھا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بے جان لاشے چاروں طرف

بکھرے پڑے ہوں۔ کوئی زوردار معرکہ ہوا ہو اور ایک بھی زندہ نہ بچا ہو۔!

کئی منٹ تک یہ سکوت چھایا رہا۔ پھر میرے نزدیک پڑی ہوئی ایک بے جان لڑکی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے گردن اٹھائی۔ اس کے لمبے بالوں سے اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا اس لیے میں اس کے خدوخال نہیں دیکھ سکا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا۔ سفید انگلی سے آنکھوں کے نزدیک بالوں میں ایک رخنہ پیدا کیا اور اس کی آنکھیں ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پڑی۔ اور وہ ساکت ہو کر مجھے گھورتی رہی۔ اس کے بعد اس نے زمین پر دونوں کہنیاں ٹکائیں اور ان کے بل گھسٹتی ہوئی میری طرف بڑھنے لگی۔!

میں اس کی حرکت نہ سمجھ سکا' اس کے کھلے ہوئے گریبان سے سفید گولائیاں جھانک رہی تھیں' ان میں تھلتھلاہٹ نہیں تھی' جس سے اس کی نوعمری کا اندازہ ہوتا تھا۔ پتلی کمر کے عقب میں کولہوں کا ابھار خاصا ہیجان خیز تھا۔ اس نے کسی گرم کپڑے کا اسکرٹ پہنا ہوا تھا جس کا اصل رنگ کہنہ سالی کی وجہ سے غائب ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ میرے نزدیک پہنچ گئی۔ اور پھر اس نے میرے جوتے کی نوک پکڑلی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہو۔ چند ساعت کے بعد اس کے ہاتھ میری پنڈلیوں سے گزر کر رانوں پر پہنچ گئے۔ پھر اس نے اپنے جسم کو ابھارا اور میں گھبرائے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ اب اس کے بال چہرے سے ہٹ گئے تھے بھدے نقوش کی ایک نوخیز لڑکی تھی۔ اس نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ میری ٹھوڑی پر رکھ دیئے اور اس مقدس فریضے کی ادائیگی کے بعد میرے جسم سے اتر گئی!

یہ اظہار عقیدت تھا میرے نغمے کی پسندیدگی کے سلسلے میں' اور پھر سب اس رسم کا اعادہ کرنے دوڑ پڑے۔ میرے چہرے پر گندے غلیظ سانسوں کی بھرمار ہو گئی اور بمشکل میں اپنی جگہ سے اٹھ سکا۔ سب کے سب بکھر گئے تھے۔ صرف میرا ساتھی جوڑا میرے پاس موجود تھا۔ لڑکی اور نوجوان مسکرا رہے تھے۔ تب نوجوان آگے بڑھا اور اس نے بگڑی ہوئی انگلش میں کہا۔

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تمہارے نغمے نے سوئے ہوئے جسموں میں زندگی کی روح پھونک دی تھی۔ کہاں سے لائے ہو یہ نغمہ۔؟"

"آسمان سے۔ یقیناً یہ آسمان کا باشندہ ہے۔" اس کی ساتھی لڑکی جھوم کر آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

"آسمان سے اترنے والے تمہارا نام کیا ہے؟" نوجوان میرے پیروں کے قریب بیٹھ گیا۔

"نواز۔!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں خود بھی بیٹھ گیا۔ نوجوان کی ساتھی لڑکی میرے جسم سے لگ کر بیٹھی تھی اور اس کے جسم کی حرارت میرے جسم میں منتقل ہوتی جا رہی تھی۔

"میرا نام اوہوتے ہے اور یہ میری دوست میگاں ہے۔ سارترے میگاں۔!" نوجوان نے کہا۔

"تم دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔ کہاں جا رہے ہو۔؟"

"کابل۔" دونوں نے بیک وقت جواب دیا۔

"اوہ۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔"

"ساتھ رہے گا۔ ہم تمہارے نغمے سن کر جھومتے رہیں گے۔"

گاتے رہیں گے۔ ہری اوم۔ ہری کرشنا۔!" نوجوان نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا اور اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لیے۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر اٹھے گا لیکن وہ اسی طرح سجدے کی پوزیشن میں پڑے پڑے سو گیا۔ البتہ اس کی ساتھی میگاں جاگ رہی تھی۔ اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اور میرے نتھنوں میں اس کے جسم کی بو چڑھنے لگی۔ لیکن اس رات مجھے سنبھلنا تھا کیونکہ میرے مشن کی ابتدا ہو گئی تھی۔ کل صبح مجھے دوسرے ہپی جوڑوں کے ساتھ افغانستان روانہ ہو جانا تھا۔

میگاں کے گہرے گہرے سانس میری گردن کے نچلے حصے سے ٹکراتے رہے اور پھر اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں۔ سانسیں گہری ہوتی گئیں وہ سو گئی تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کا سر اپنے کندھے سے ہٹا دیا اور اسے زمین پر لٹا دیا پھر میں خود بھی تھوڑا سا نیچے کھسکا درخت کے تنے کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ کسی تکلیف دہ جگہ لیٹنے کی پہلی رات تھی۔ کافی دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ لیکن پھر میں سو گیا۔ سوتے میں مجھے کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ روشنی میرے پپوٹوں میں چبھنے لگی تو میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے پر میں نے کسی وزن کا احساس کیا جو میرے بازو پر تھا۔ میں نے کسی کی سانسوں کو اپنے چہرے سے ٹکراتے محسوس کیا اور آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

میگاں تھی' جو میرے جسم سے لپٹی ہوئی سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو میری گردن میں حمائل تھا' سر میرے بازو پر رکھا تھا۔ ایک ٹانگ میری کمر پر رکھی ہوئی تھی اور آرام سے سو رہی تھی۔ میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ بہت سے ہپی جاگ گئے تھے اور اپنے کاموں میں مشغول تھے' کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ پھر مجھے اوہوتے کا خیال آیا۔ وہ لڑکی کا ساتھی تھا۔ میں نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ لیکن اوہوتے موجود نہیں تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ سے لڑکی کا سر اپنے بازو سے ہٹایا تو وہ جاگ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ دیکھتی رہی۔ پھر ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ اور پھر وہ آہستہ سے مجھ سے جدا ہو گئی۔ میں ایک گہری سانس لے کر اٹھ گیا تھا۔

"ہیلو۔!" میں نے اخلاقاً اس سے کہا اور وہ مسکرا دی۔ "تمہارا ساتھی کہاں ہے۔؟"

"اوہوتے۔!" اس نے گردن گھمائی اور میں نے سرہانے رکھے ہوئے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن درخت کی جڑ سے تھیلا غائب تھا۔ میرا گٹار بھی غائب تھا۔ تھیلے میں خاصا سامان تھا' کھانے پینے کا سامان چرس اور دوسری چیزیں۔! کچھ موجود نہیں تھا۔ میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔

"میگاں۔؟" میں نے اسے آواز دی۔

"ہوں۔!" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"میرا گٹار۔ اور دوسرا سامان غائب ہے۔!"

"اوہ۔" اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا!

"اور اوہوتے بھی غائب ہے۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس تھوک نگلتے ہوئے چاروں طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں پریشانی اور خوف کے آثار تھے۔ میں معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔! "کیا وہ تمہیں بھی چھوڑ گیا۔؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کمینہ تھا۔ وہ ذلیل تھا۔! وہ میرا کوئی نہیں تھا۔ کھٹمنڈو میں ملا تھا۔ وہاں سے میرے ساتھ تھا' چور کہیں کا۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے!

"کوئی بات نہیں ہے میگاں۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب کچھ دوبارہ خرید لیں گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ لوگ جو کچھ بھی کر لیتے کم تھا۔ اتنے عرصے میں' میں ان کی سرشت خوب سمجھ چکا تھا۔ دانت گندے ہو رہے تھے لیکن ان کے رنگ میں ڈھلنے کے لیے ایسی باتوں کی پرواہ کسے تھی۔! میں نے ایک گزرتے ہوئے مقامی آدمی کو اشارہ کیا اور چند نوٹ اس کے حوالے کر کے چائے اور بسکٹ لانے کے لیے کہا۔

میگاں اب بھی رو رہی تھی۔ پھر روتے ہوئے اس نے کہا کہ اس کا سب کچھ بھی اوہوتے کے پاس ہی تھا۔!

"میں نے کہا نا کہ تم فکر مت کرو۔ تم میرے ساتھ کابل چلو گی۔!" اور اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ پھر اس نے میرے ساتھ ناشتہ کیا۔ میری جیب میں خاصی کرنسی موجود تھی اور لباس کے بالکل نیچے چمڑے کے ہولسٹر میں پستول بھی موجود تھا۔ میں نے میگاں کو تسلی دی اور کہا کہ وہ انتظار کرے میں ضرورت کی چیزیں خرید لوں۔ میں اندرونی عمارت میں پہنچا۔ غلام سیٹھ موجود تھا۔ میری کہانی سنکر وہ ہنس پڑا۔

"ایسے بے شمار دلچسپ واقعات تمہیں پیش آئیں گے۔ بہرحال میں ابھی تھیلا بھجوائے دیتا ہوں۔ ویسے کیا تمہاری ساتھی کابل جا رہی ہے۔؟"

"ہاں۔!" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ساتھ رہے گا۔ کب روانہ ہو رہے ہو۔؟"

"بس تھوڑی دیر کے بعد۔"

"اور کوئی خاص بات؟"

"نہیں۔!" میں نے جواب دیا اور وہاں سے نکل کر پھر میگاں کے پاس واپس آگیا۔ میگاں میری منتظر تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دولہے خان ایک تھیلا لیے ہوئے آگیا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ بسکٹ' خشک گوشت چرس کے پیکٹ' پائپ اور دیا سلائی کے بکس وغیرہ۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ افغانی کرنسی میرے لباس میں موجود تھی۔ لان ہپیوں سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ میں بھی میگاں کے ساتھ چل پڑا۔ میگاں نے میرا تھیلا کندھے پر ڈال لیا تھا۔ وہ بدستور افسردہ نظر آ رہی تھی۔ ہم لوگ پیدل سفر کرتے رہے۔ میگاں کے جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کا لباس بھی بوسیدہ

تھا' لیکن اسے ان چیزوں کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ راستے میں' میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم اوہوتے کے لیے اداس ہو۔؟"

"نہیں۔ میں اداس نہیں ہوں۔ ہم تو مسافر ہیں۔ کوئی منزل نہیں ہے۔ کوئی ساتھی نہیں ہے۔ راہ میں بہت سے پتھر ملتے ہیں۔ کچھ پاؤں زخمی کرتے ہیں۔ کچھ نکل جانے کو راستہ دے دیتے ہیں۔ پتھروں سے محبت کیا معنی رکھتی ہے۔ چار ماہ سے اس کا ساتھ تھا اور بس۔ انسانی فطرت میں محبت رچی ہوئی ہے۔ بچھڑ جانے والے غمزدہ تو کرتے ہی ہیں' اچھے ہوں یا برے۔ لیکن اب تمہارا ساتھ ہے۔ شاید کابل تک۔ اس کے بعد تم بھی بچھڑ جاؤ گے۔ نہ جانے کہاں چلے جاؤ گے۔ ہر شخص چلا جاتا ہے۔" اسنے کہا اور میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔ اس میں بھرے ہوئے سگریٹ تھے!

ایک سگریٹ میں نے اسے پیش کیا اور اس نے سگریٹ میرے ہاتھوں سے لے لیا۔ اسے ہونٹوں میں دبا کر سلگایا اور پھر دو تین کش لے کر بولی۔ "اس کے جواب میں تمہیں کیا دوں۔ بولو۔ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ مگر تم مرد ہو۔ تمہیں میری رفاقت کی ضرورت ہے۔ نشے میں چور ہو کر جب بھی آسودگی کی ضرورت ہو مجھ سے طلب کر لینا۔"

میں خاموش رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اور وہ کیا دے سکتی ہے۔ لیکن وہ مالدار ہے۔ کوئی بھی نوجوان اسے جسم کے بدلے سب کچھ دے سکتا ہے۔ سودا برا نہیں ہے۔ ہم لوگ ایک پتلی سڑک پر نکل آئے! دور ایک تانگہ آتا نظر آ رہا تھا۔ ہم سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ تانگے نے رفتار سست کر لی تھی۔

"چہ کدر جائے گا۔" بھاری جسم کے بڑے مونچھوں والے کوچوان نے ہاتھ نچاتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں مضحکہ خیز تاثرات تھے۔

"کابل جانے والے بس کے اڈے پر۔" میں نے جواب دیا اور کوچوان چونک کر میری شکل دیکھنے لگا۔ تانگے میں دو سواریاں اور بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ سب کے چہروں پر حیرت کے نقوش تھے۔ میرے سرخ و سفید چہرے اور حلئے سے وہ مجھے بھی غیر ملکی ہی سمجھے تھے۔ ظاہر ہے صاف اردو سن کر انہیں حیرت ہوئی ہو گی۔ بہرحال تانگے والا سنبھل کر بولا۔

"تین روپیہ ہو گا! ان سواریوں کو شہر میں چھوڑ کر ہم اڈے پر پہنچا دے گا۔!"

"آؤ۔!" میں نے میگاں کا ہاتھ پکڑ کر تانگے کے عقبی پائیدان پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ اور میگاں میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ ساتھ والی سواریاں سنبھل گئی تھیں۔ جگہ بھی کشادہ کر دی گئی تھی۔ میگاں عورت کا مذاق تھی۔ لیکن بہرحال شریف انسان اس کا احترام کر رہے تھے۔ کسی نے براہ راست اس پر نگاہ نہ ڈالی۔ میں بھی کسی زمانے میں ایسا ہی تھا۔ لیکن اب مجھے وہ بیوقوف نظر آ رہے تھے۔ ناکام لوگ' زندگی کی ناکامیوں کا بوجھ اٹھائے بالآخر ایک دن تھک جائیں گے۔ میں نے سوچا۔ گھوڑا دوڑتا رہا کوچوان راستے بھر گھوڑے سے الٹی سیدھی گفتگو کرتا جا رہا تھا۔ کبھی وہ اس سے کوئی رشتہ جوڑ کر اپنی مرضی کی چال چلنے کی فرمائش کرتا' کبھی دو چار گالیاں سنا دیتا۔ اور کبھی تمام مروت

بھول کر ایک زوردار چابک رسید کر دیتا تھا۔!

پشاور شہر کے ایک حصے میں سواریاں اتر گئیں۔ اب پچھلی سیٹ پر میں اور میگاں ہی رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہماری منزل بھی آ گئی۔ سامنے ہی کابل جانے والی بسیں کھڑی تھیں۔ ان کے نزدیک ہپیوں کا ہجوم تھا سب سے زیادہ سفر کرنے والے وہی تھے۔ مقامی اور افغانی باشندوں میں مسافروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔!

میں نے پرس نکال کر تانگے والے کو پیسے ادا کئے اور پھر میگاں کا ہاتھ پکڑے ہوئے میں بھی کابل والوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا ہمیں دوسری بس میں ایک ڈبل سیٹ مل گئی۔ ٹکٹ دے دیا گیا۔ جس پر سیٹ نمبر لکھے ہوئے تھے۔ پہلی بس بھر گئی تھی اور اس لیے دوسری بس آ کر نمبر پر لگ گئی اور مسافر اس میں سوار ہونے لگے۔! میگاں میرے ساتھ کھڑکی کی سمت بیٹھ گئی۔ بس کی سیٹیں تکلیف دہ نہیں تھیں۔ اس لیے ہم آرام سے بیٹھ گئے۔ میں نے بس میں نگاہ دوڑائی بہت سے ہپی موجود تھے۔ اداس اداس۔ ویران چہرے لیے ہوئے۔ کھلی آنکھوں سے سوتے ہوئے۔ بس والوں کو ان لوگوں کا خاصا تجربہ تھا' اس لیے غلط اسپیلنگ میں انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ "چرس پینا منع ہے۔ سگریٹ پینا منع ہے۔ کوئی نشہ کر کے بس میں بیٹھنا منع ہے۔ اگر کسی نے نشے میں ہنگامہ کیا تو اسے بس سے اتار دیا جائے گا وغیرہ۔ سامنے ہی پانی کا کولر رکھا ہوا تھا جس میں زنجیروں سے سلور کے گلاس بندھے ہوئے تھے۔ پوری بس کا جائزہ لینے کے بعد میں نے میگاں کا چہرہ دیکھا۔

وہی اداس چہرہ۔ لیکن۔ وہ اوہوتے کے لئے اداس نہیں تھی۔ وہ کسی کے لیے اداس نہیں تھی۔ یا پھر اس بس میں جتنے لوگ بیٹھے ہوئے تھے' سب کے سب اداس تھے' کسی نہ کسی کے لیے۔ یہ اداسی تو ان کے چہروں پر رچی ہوئی تھی۔ وہ صرف اس وقت مسکراتے تھے جب چرس کی محفل گرم ہوتی انجکشن کے نشے جاگ رہے ہوتے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں تھی۔

میرا دل الٹنے لگا! ان قبرستان زدہ لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ مجھے ان سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ میری شخصیت ان میں نہ کھپ سکے گی۔ اور میں نے بھی چہرے پر سوگواری طاری کر لی۔! اس سوگواری کو حقیقی رنگ دینے کے لیے میں نے اپنے ماضی پر نگاہ دوڑائی۔ لیکن ماضی یاد کرتے ہی ذہن کو ایسے شدید جھٹکے لگے کہ میں ناچ کر رہ گیا۔

بڑا بھیانک تجربہ تھا۔ ماضی کی یادیں تو بجلی کے کرنٹ کی طرح تھیں اس دور کے بارے میں سوچنے سے تو دماغ پھٹ جاتا ہے۔ میں نے جلدی سے ذہن خالی کرنے کی کوشش۔ اور پھر بس اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو مجھے میری کوشش میں مدد مل گئی۔ میرا ذہن ان پٹھانوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو دیوہیکل تھے جن کی کمر سے پیٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور ان پیٹیوں میں پستول لٹکے ہوئے تھے۔!

یہ بس کے محافظ تھے۔ سنا تھا کہ افغانستان جانے والے ہپی بعض اوقات شرارت پر اتر آتے تھے۔ وہ بس لوٹ لیتے تھے اور قتل و غارت گری سے بھی باز نہیں آتے تھے اس لیے اب ہر بس کے ساتھ چند مسلح محافظ بھی سفر کرتے تھے جو ان غیر ملکی بدمعاشوں کا دماغ درست کرنا خوب

جانتے تھے۔ ان لوگوں کی الگ نشست تھی اور ان کی موجودگی سے کسی کو تکلیف نہیں ہوتی تھی۔

درہ خیبر کی پرپیچ سڑک تاحد نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ خوفناک موڑ آتے تھے جن کے دوسری طرف دیکھنے سے ہی ہول آتا تھا۔ سڑک زیادہ محفوظ نہیں تھی اور اس غیر محفوظ سڑک پر بس چلانے کے لیے بھی غیر معمولی کلیجے کی ضرورت تھی' جبکہ بس کی رفتار کافی تیز تھی' لیکن ڈرائیور کے چہرے پر لاپرواہی تھی۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے عقب میں بھی دیکھ لیتا تھا۔ پوری بس پر ایک سوگوار سی کیفیت طاری تھی۔ سب اسی طرح خاموش تھے جیسے اپنے کسی عزیز کی میت لے کر قبرستان جا رہے ہوں۔!

پھر یہ پراسرار خاموشی تیز سیٹی کی آواز سے ٹوٹی۔ سب چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سرخ و سفید چہرے اور تنومند جسم والا جرمن۔ آنکھیں بند کئے پشت سے ٹیک لگائے کوئی جرمن دھن بجا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر لاپرواہی تھی جیسے اپنے مکان کے ڈرائنگ روم میں ہو۔ اس کا ایک پاؤں ہل رہا تھا لیکن اس کی تھاپ ایک افغانی کے پاؤں پر پڑ رہی تھی جس کا اسے احساس نہیں تھا۔

بس میں بیٹھے محافظوں کے ہاتھ پستول پر پہنچ گئے۔ انہوں نے ہولسٹروں کے بٹن کھول لئے۔ یہ دھن بس میں بیٹھے ہوئے ہپی لٹیروں کے لئے کوئی اشارہ بھی ہو سکتی تھی' اس لیے وہ سب ہوشیار ہو گئے تھے! پھر طویل القامت افغانی نے دانت پیس کر اپنے لمبے صافے کا سرا سیاح کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اور وہ اپنی سیٹ پر اچھل پڑا۔!

"پیر ہٹاؤ خدائی خوار۔ ہم اسے توڑ کر باہر پھینک دے گا" اس نے غراتے ہوئے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ سیاح نے اسی انداز میں لیٹے لیٹے پاؤں کی طرف دیکھا اور پھر اس نے پاؤں پیچھے سرکا لیا۔ اور تمسخرانہ انداز میں منہ میں ٹھنسے ہوئے صافے کے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے خود پلو منہ سے نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔!

افغانی پگڑی کا پلو ایک جھٹکے سے کھینچ کر اسے گردن میں لپیٹنے لگا جرمن سیاح نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ سکڑ گئے اور ان سے سیٹی کی آواز پھر بلند ہونے لگی۔ البتہ اب وہ پاؤں نہیں ہلا رہا تھا۔ مجھے اس کی لاپرواہی پر ہنسی آ گئی۔ لیکن یہ ہنسی بھی اجنبی سی لگی تھی۔ دوسرے لوگ مسکرائے تک نہیں تھے اور میں جھینپے ہوئے انداز میں کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا! پھر میری نگاہ میگاں کی طرف اٹھ گئی اور مجھے غصہ آنے لگا! منحوس اونگھ رہی تھی۔ ماحول سے بے خبر۔! کئی منٹ تک میں غصے سے ہونٹ چباتا رہا۔ پھر کھڑکی سے نگاہ ہٹالی۔ میری نگاہ میگاں کے اسکرٹ پر پڑ گئی جو اس کی بائیں ران سے اس طرح سرک گیا تھا کہ اس کی سفید ران عریاں ہو گئی تھی!

پھر سفر کو دلچسپ بنانے کی ایک ترکیب مجھے سوجھ گئی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میگاں کی کھلی ہوئی ران پر رکھ دیا۔ میگاں کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ سو نہیں رہی لیکن ہاتھ کے وزن پر کوئی اعتراض نہ پا کر میں نے آہستہ سے ہاتھ کو اوپر کی طرف گردش دی۔ اور میرے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔!

لیکن میگاں کسی مردے کی طرح بیٹھی رہی۔ اسے میرے ہاتھ کی حرکت کا احساس ہی نہیں تھا۔ میں نے چور نگاہوں سے دوسروں کی طرف دیکھا لیکن کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا! بہرحال۔ میگاں کی ران کالمس دلکش تھا اور پھر اسے کوئی عذر نہیں تھا' اس لیے میرے ہاتھ کی کوششیں بڑھتی گئیں۔ اسکرٹ آہستہ آہستہ کھسکتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ران کے جوڑ تک پہنچ گیا۔ لیکن کب تک۔ جب میری کوشش قابل اعتراض ہو گئی تو میگاں آنکھیں کھول کر کسمسائی۔ میں نے اس کی نگاہوں سے نگاہیں ملائیں اور مسکرا دیا میگاں چند لمحات سنجیدگی سے میری شکل دیکھتی رہی' جیسے فیصلہ کر رہی ہو کہ میری اس مسکراہٹ کے جواب میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس کا ذہن کسی فیصلے پر پہنچ گیا۔ اور جواب میں وہ بھی مسکرا دی۔ اور اس کے ساتھ اس نے اپنے جسم کو اس طرح پیچھے دھکیلا۔ جیسے مجھے پوری پوری سہولت فراہم کر رہی ہو۔!

لیکن اسی وقت سیٹوں پر بیٹھے محافظ اٹھ کھڑے ہوئے اور میں نے گھبرا کر جلدی سے میگاں کی ران پر اسکرٹ برابر کر دیا۔ میں ان لوگوں کے کھڑے ہونے کی وجہ جاننے کی کوشش کرنے لگا! پتہ چلا کہ بس طور خم پہنچ گئی ہے۔ اس کی رفتار ہلکی ہو رہی تھی۔ اور پھر طور خم کی سرحدی چوکی پر بس رک گئی۔!

سرخ و سفید قد آور جوانوں نے جو مسلح تھے مسافروں سے نیچے اترنے کے لیے کہا اور پوری بس کے لوگ نیچے اتر آئے۔ پہلے بس کی تلاشی لی گئی۔ اس کے بعد مسافروں کی سرسری تلاشی لی گئی۔ میں پستول کی طرف سے خوفزدہ تھا لیکن تلاشی لینے والے بھی بیزار سے تھے جیسے انہیں یقین ہو کہ ان لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہو گا۔ اس کے بعد ہمیں بس میں سوار ہونے کی اجازت دیدی گئی اور بس آگے بڑھ گئی۔ لیکن اب اس کی رفتار سست تھی۔ خطرناک سڑکیں شروع ہو گئیں تھیں۔ ڈرائیور بھی کسی قدر محتاط نظر آ رہا تھا' سڑکوں پر جا بجا قافلے مل جاتے تھے خچروں کی لمبی قطاریں جن پر بچے اور لڑکیاں لدی ہوتیں' مرد اور بوڑھے ان خچروں کے ساتھ ساتھ ڈھیلے ڈھالے لبادوں میں ملبوس چلتے نظر آتے تھے۔ یہ کوچی خانہ بدوش تھے جو موسم بہار کا سفر طے کر رہے تھے۔ ڈرائیور کو مسلسل ہارن بجانا پڑ رہا تھا۔ بعض اوقات بس کی رفتار بالکل ختم کر دینا پڑتی تھی۔ عجیب سست رو قافلے تھے۔ مسلسل ہارن کی آواز پر خچر ہی سہم کر کنارے ہو جاتے تھے' ورنہ انہیں ہانکنے والے تو جیسے بہرے تھے ان کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔

بس کے مسافر بھی اب کسی قدر ہوشیار ہو گئے تھے۔ وہ گردنیں کھڑکیوں سے نکالے باہر دیکھ رہے تھے' خود میگاں بھی جیسے جاگ گئی تھی اب اس کی ران کھلی نہیں تھی' آنکھوں میں بھی غنودگی کی وہ کیفیت نہیں تھی' ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب کسی میکانکی عمل کے تابع ہوں۔ سب کی کیفیات ایک جیسی ہوتی تھیں' جیسے ان کے جسموں کے تار ایک دوسرے سے منسلک ہوں۔ اب پتہ نہیں یہ میرا تصور تھا کہ حقیقت' حالانکہ میں بہت عرصے سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن ابھی بہت سی باتیں ایسی تھیں جو میرے علم میں نہیں تھی بہرحال مجھے کسی بھی طور ان سے مختلف نہیں ہونا چاہیے تھا۔!

میں بھی ان کی طرح چوکنا ہو گیا۔ ہماری دوسری منزل جلال آباد تھی۔ اب اسٹیشن سے ہی ہم نے جلال آباد کی رونق دیکھی۔ چاروں طرف کس کر بندھی ہوئی پگڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ سکھ تھے۔ شاید افغانوں کی بہ نسبت یہاں سکھوں کی تعداد زیادہ تھی جلال آباد میں بس کے چند مسافر اتر گئے اور ان کی جگہ چند افغانوں اور سکھوں نے لے لی۔ بس جلال آباد سے آگے بڑھ گئی۔ جلال آباد سے اصلی افغانستان کا راستہ انتہائی خطرناک تھا' قدم قدم پر خوفناک گھاٹیاں منہ کھولے گرسنہ نگاہوں سے بس کو تکتی نظر آتی تھیں۔ ایک ذرا سی لغزش' پھر نہ بس کا وجود ہو گا اور نہ اس کے مسافروں کا! میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اگر سچ مچ یہ بس کسی گھاٹی میں پھسل جائے نیچے گرتے ہوئے ان لوگوں کے چہروں پر کیسے اثرات ہوں۔ کیا ان سب کے چہروں سے اجنبی لبادے اتر نہ جائیں گے۔ کیا یہ اشخاص اصلیت کے جامے میں نہ آ جائیں گے' زندگی کو کسی رنگ میں ڈھال لو۔ کسی نہ کسی وقت تمام پردے چاک ہو جاتے ہیں اور اصلیت جھانکنے لگتی ہے۔

لیکن بس کا ڈرائیور بے حد محتاط تھا۔ اس نے بس کو کہیں نہ پھسلنے دیا اور انتہائی مہارت سے اسے آگے بڑھاتا رہا۔!

"ہاؤ سوئٹ۔ نواز۔ ڈرالنگ۔ ان برف پوش پہاڑیوں کو دیکھو۔ کیا زندگی کا تمام حسن ان میں نہیں جمع ہو گیا۔" دفعتاً" مجھے اپنے کان کے قریب میگاں کی سرگوشی سنائی دی۔

"شکر ہے۔ تمہیں زندگی کا احساس تو ہوا۔؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"زندگی۔ ہا۔" میگاں نے ایک گہری سانس لی۔ "زندگی حسن کا دوسرا نام ہے۔ اپنی اپنی نظر ہے۔ کسی کو زندگی کہیں ملتی ہے۔ کسی کو کہیں۔ میں جب پہلی بار ادھر سے گزری تھی۔ تو میرا دل چاہا تھا کہ میں۔ میں ایک بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو جاؤں۔ پھر برف بنکر ان پہاڑوں پر اتروں اور پھر پانی بن کر دریائے کابل کی لہروں میں شامل ہو جاؤں۔ آہستہ آہستہ بہتی رہوں۔ بہتی رہوں اور کہیں سے کہیں نکل جاؤں۔ مگر۔ یہاں اس بس میں چرس نوشی کی اجازت نہیں ہے۔ یہ بہت بری بات ہے۔ کیوں ہے نا۔ دیکھو۔ زندگی کس قدر بجھی سی ہے۔ بالکل سرد راکھ کی طرح۔" اس کے ہونٹ سکڑ گئے اور وہ پھر اداس ہو گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے کچھ بیزاری کا سا احساس ہوا۔ اس غیر متوازن لڑکی کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا جا سکتا۔ اور پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے' بقول اس کے اوہو تے تین ماہ سے اس کے ساتھ تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ اس سے جدا ہو گیا۔ نہ جانے یہ تین ماہ ہی اس نے کیسے گزارے ہوں گے۔ بس کا سفر ختم ہو گیا۔ ہم کابل پہنچ گئے تھے۔ مسافر بس سے اترنے لگے تھے۔ میں نے بھی ایک گہری سانس لے کر اپنا سفری تھیلا کندھے پر لادا اور نیچے اتر گیا۔ میگاں میرے ساتھ تھی۔ وہ کہاں جاتی کسی نے اسے منہ نہیں لگایا تھا۔ حالانکہ ان آوارہ گردوں میں اس کے ہم وطنوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ ہم چل پڑے۔ کوئی منزل نہیں تھی' کوئی راستہ نہیں تھا۔ بس جدھر منہ اٹھا تھا چلے جا رہے تھے۔ تنگ گلی' کوچے' بازار۔ لیکن ہم یہاں اجنبی نہیں تھے۔ ہمارے جیسے بہت سے آوارہ گرد موجود تھے۔ بھٹکتے پھر رہے تھے۔ بھٹکتے ہوئے ہم دونوں نہ جانے کہاں آ نکلے شاید کوئی محلہ تھا' کچی آبادی کے مکانات بکھرے ہوئے تھے۔ سامنے ہی چند دوکانیں نظر آ رہی

تھیں۔ دوکانوں کے اس طرف ایک ٹوٹی پھوٹی کچی مٹی کی عمارت تھی جس میں کوئی رہائش نہیں نظر آ رہی تھی۔ ہم دوسرے لوگوں سے بچھڑ چکے تھے۔ اس علاقے سے بھی واقف نہیں تھا۔ بہرحال ایک رات کی بات تھی۔ میں نے وہ رات اس بوسیدہ عمارت میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

ہم دوکانوں کی طرف بڑھ گئے۔ کسی طرف سے گوشت بھننے کی خوشبو آ رہی تھی۔ ہمارے قدم اس خوشبو کے سہارے سہارے کھنچے چلے گئے۔ مٹی کا تودہ تندور کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔ اوپر لوہے کی ایک سلاخ میں بھیڑوں اور دنبوں کے گوشت کے ٹکڑے لٹکے ہوئے تھے۔ پیٹرومیکس روشن تھا۔ سیاہ رنگ کی کڑھائیوں میں گوشت فرائی ہو رہا تھا۔ یہ گوشت میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ پشاور اور پنجاب کے بہت سے علاقوں میں یہ کڑھائی گوشت کے نام سے مشہور ہے۔ ایک تروتازہ افغانی تندور کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اور میں نے گوشت کی طرف اشارہ کر دیا۔

افغانی نے کڑھائی سے گوشت کی ایک بڑی مقدار نکال کر تام چینی کے ایک تسلے میں ڈال دی۔ اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے گردن ہلا دی۔ تب اس نے سفید آٹے کے گول گول کلچے نکالے اور اشارے سے ان کی تعداد پوچھی۔ اور میں نے پھر گردن ہلا دی۔

"چالیس افغانی۔!" دوکاندار نے مجھے قیمت بتائی۔ اور میں نے خاموشی سے ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ہم یہیں بیٹھ کر کھائیں گے اور اس کے بعد قہوہ بھی پئیں گے" میں نے اردو میں کہا۔ اور دوکاندار اچھل پڑا۔ ظاہر ہے وہ بھی مجھے غیر ملکی سمجھا تھا اور شستہ اردو سن کر اس کا اچھل پڑنا لازمی تھا۔

بہرحال اس نے گردن ہلا دی۔ ہم کلچے اور گوشت کھانے لگے۔ حسب معمول میگاں بہت خوش تھی۔ اسے یہ کھانے پسند تھے۔ تھوڑی دیر میں ہم شکم سیر ہو گئے۔ پھر ہم نے قہوہ پیا اور افغانی نے میرے نوٹ کی بقیہ رقم واپس کر دی۔! اس کے بعد ہم عمارت کی طرف چل پڑے۔ مجھے تردد تھا جو بعد میں حقیقت ثابت ہوا۔ کیونکہ غیر ملکی باشندوں پر ہر ملک میں نگاہ رکھی جاتی ہے انہیں کونوں کھدروں میں پڑے رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم نے اس کھنڈر میں قیام کر کے جرم کیا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے بات بن گئی تھی اور کسی کی ہم پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔!

کچی عمارت شاید عرصہ دراز سے ویران پڑی تھی۔ اس کے اندرونی حصوں میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ بعض کمرے ٹھیک تھے۔ لیکن کسی کی آدھی چھت گری ہوئی تھی اور کسی کی چھت ہی نہیں تھی۔ ہم نے ایک ایسے کمرے کو پسند کیا تھا' جس کی چھت ہی نہیں تھی۔ نیچے سپاٹ زمین تھی۔ اسی زمین پر ہم نے بستر لگا دیا۔ اور پھر میگاں نے اپنا محبوب مشغلہ شروع کر دیا۔ اس نے میرے تھیلے سے چرس اور سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔ اور پھر وہ سگریٹ بھرنے لگی! تھوڑی دیر کے بعد چرس کی بو کمرے میں منتشر تھی۔ میں بھی کش لے رہا تھا۔ لیکن نشہ اتارنے والی گولی حسب معمول میری زبان کے نیچے موجود تھی۔

میگاں نے کئی سگریٹ پئے اور آؤٹ ہو گئی۔ اس نے دھیمے سروں میں سیٹی بجانا شروع کر دی تھی اور پھر کئی بار اس نے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے رقص کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس نے میر اگٹار بھی یاد کیا اور اس کی گمشدگی پر افسوس کرتی رہی' او ہوتے کو گالیاں دیتی رہی۔ پھر اپنا لباس اتار کر میری آغوش میں آ گری۔ اس کی یہی حرکت میرے لیے سب سے زیادہ پسندیدہ تھی' چنانچہ افغانستان کے اس گمنام علاقے میں' اس گمنام کھنڈر میں میگاں کے دلکش جسم کے ساتھ میں نے ایک دلکش رات گزاری۔ میگاں ایک پرجوش لڑکی تھی۔ اس نے میرے تمام احسانات کا بدلہ ایک رات میں چکا دیا۔ باقی دو راتیں جو اس نے میرے ساتھ گزاریں' وہ اس کا احسان تھا۔

صبح ہوتے ہی ہم نے کھنڈر چھوڑ دیا۔ بازار بند تھے۔ ہمیں کھنڈر سے نکلتے ہوئے بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ جو سب سے پہلا تانگہ ہمیں نظر آیا ہم نے اسے پکڑ لیا۔ میری زبان سب کو حیران کر دیتی تھی۔ تانگے والے کے مشورے سے ہم شاہ پر ہوٹل اینڈ ریستوران پر اتر گئے۔ باہر آنے والے یہی ریستوران پسند کرتے تھے۔ اور یہاں ہم نے بہت سے اجنبی چہرے دیکھے' جو ہماری طرح تھے۔ ریستوان میں ہم نے ناشتہ کیا۔ کھنڈر میں اچھی طرح نیند نہیں آئی تھی۔ اس لیے ناشتہ کرنے کے بعد ہم نے اپنے حاصل کردہ کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ کمرے میں ایک ہی بستر تھا۔ میں نے اس کا گدا اتار کر نیچے ڈال لیا اور میگاں نے چارپائی سنبھال لی۔!

نہ جانے کتنی دیر ہم سوتے رہے۔ پھر پہلے میں ہی جاگا تھا' بے وقت سونے سے طبیعت مکدر سی ہو گئی تھی۔ ذہن بھی قابو میں نہیں تھا۔ میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیا تھا۔ کیا بن گیا تھا۔ اب بھی ضمیر کے کسی گوشے میں دبی ہوئی کوئی چنگاری کبھی کبھی بھڑک کر بے چین کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی بے چینی ذہن پر مسلط ہو گئی۔ ڈاڑھی اور سر کے بال خاصا پریشان کر رہے تھے۔ نہانے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن اس سے شخصیت کا وہ خول اتر جاتا جسے چڑھانے کی مجھے تربیت دی گئی تھی۔ مجھے شاہ زورین یاد آ گیا۔ عالم گل یاد آ گیا اور پھر غلام سیٹھ یاد آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کام یاد آیا' جو مجھے انجام دینا تھا۔

بہت سی یادیں ذہن کے پردے پر خلط ملط ہو گئیں۔ تب میں نے گردن جھٹک دی۔ جو کچھ بن گیا ہوں' وہی رہنا ہو گا۔ اس دائرے سے نکلا تو بربادی کے وہی راستے میرے ہم سفر ہوں گے۔ اس مضبوط ارادے کے تحت سنبھل گیا۔ کمرے سے باتھ روم اٹیچ تھا۔ اس میں جا کر ٹھنڈے یخ پانی سے ہاتھ منہ دھویا' طبیعت سنبھل گئی۔ وقت کا پتہ نہیں تھا' کیونکہ ہم جیسے بوریہ نشینوں کے پاس گھڑی وغیرہ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

ہاتھ منہ دھو کر پھر گدے پر آ بیٹھا اور سوچنے لگا' کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ابھی تک کوئی کام کی بات نہیں ہوتی تھی۔ کام کی بات ہوتی کہاں ہے۔ ضروت کی ہر چیز موجود تھی۔ ایک ہی ترکیب سمجھ میں آئی چرس اور سگریٹ کا پیکٹ مع پائپ کے باتھ روم کے فلیش میں ڈالا اور زنجیر کھینچ دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر باہر نکل آیا۔!

میگاں اسی طرح سو رہی تھی۔ پچھلی رات میں محسوس کر چکا تھا' اسے اوندھا سونے کی عادت

تھی' اس وقت بھی وہ حسب عادت اوندھی سو رہی تھی۔ گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی جس سے رال کی ایک لکیر نیچے بہہ آئی تھی میں نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹالیں۔ وہ جس قدر معصوم نظر آ رہی تھی در حقیقت نہ تھی۔ وہی مسئلہ تھا' اس وقت اس کے خیالات آزاد تھے اور اصل صورت جھلک آئی تھی اور یہ اصل صورت زمین پر ٹھوکر مارتی تھی۔ میں نے اس کے شانوں پر نگاہ دوڑائی' وہاں سے کمر کے خم پر اور پھر ابھرے ہوئے کولھوں پر' رات کو میں اس جسم کو پردے سے بے نیاز دیکھ چکا تھا۔ اس کولھوں کی سفیدی اور ان کے پیچ و خم کا مجھے بخوبی اندازہ تھا' ان کی نرماہٹ اور تھلتھلاہٹ سے بخوبی واقف تھا۔ میرے ہاتھ بے ساختہ کمر کے خم سے پھسل گئے۔ اور میرے ہاتھوں کے لمس سے میگاں جاگ اٹھی۔ اس نے اجنبی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور نگاہوں کی اجنبیت نے میرے جذبات سرد کر دیئے۔!

پھر وہ چونک پڑی۔ اس نے اپنا جسم سیدھا کیا اور میری طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "اوہ۔ نواز ڈارلنگ۔!"

"اٹھو۔ کافی وقت گزر چکا ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ لیکن اس نے اس لہجے پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور میری آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتی رہی۔ لیکن میں اس کی مسکراہٹ کے جواب میں نہ مسکرا سکا۔ اس کی نگاہوں کی اجنبیت میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی ٹھیک ہی تو ہے چند روز کا ساتھ' کوئی جذباتی حیثیت نہیں رکھتا' بس ایک ضرورت تھی جو وہ مجھ سے پوری کر رہی تھی۔ اور میں اس سے۔ پھر ان جذباتی حماقتوں کو ذہن میں جگہ کیوں دی جائے۔ میں واپس پلٹ گیا۔ شاید اس نے میری سرد مہری محسوس کر لی تھی۔ بہر حال میں اس کی آسامی تھا اس لیے مجھے خوش رکھنا بھی ضروری تھا۔ باقی بہت سا وقت اس نے مجھے خوش کرنے میں گزارا۔ ہم نے ہوٹل ہی سے کھانا منگا کر کھایا اور کھانے کے بعد میگاں نے مجھ سے چرس طلب کی!

میں نے تھوڑی سی اداکاری کرتے ہوئے اپنے تھیلے کی تلاشی لی اور پھر تعجب سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ میں نے اسے بتایا کہ چرس وغیرہ غائب ہے۔ اس نے خود بھی تھیلے کو اس طرح ٹٹولا جیسے سوئی تلاش کر رہی ہو۔ اور پھر جب چرس نہ ملی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔!

"چلو نواز ڈارلنگ۔ باہر تلاش کریں۔"

"او کے۔ چلو۔!" میں نے کہا۔ اور پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ سورج ڈھل رہا تھا' موسم خوشگوار تھا۔ میگاں کی عقابی نگاہیں اپنے مطلب کی جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ اور پھر اچانک وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف لپکی۔ ایک ہپی جوڑا جا رہا تھا۔ میں رک کر میگاں کو دیکھنے لگا۔ وہ ہپی جوڑے کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے ان دنوں سے ہاتھ ملایا۔ اور پھر کئی منٹ تک گفتگو کرتی رہی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ان ہپیوں نے ایک میلا سا کاغذ نکال کر میگاں کو دیا اور میگاں پھر ان سے ہاتھ ملا کر میری طرف آ گئی۔! اس نے کاغذ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے۔؟" میں نے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ان لکیروں کے

سروں پر کچھ نام بھی لکھے ہوئے تھے۔

"یہاں چار اڈے ہیں جن میں سے دو شہر کے اندر ہیں اور دو باہر۔ اندر کے اڈے بہت مہنگے ہیں۔ اور شہر سے باہر کے ایک اڈے کی برانچیں ہیں۔ البتہ شہر سے باہر کے دونوں اڈے بہت سستے اور اچھے ہیں۔"

"چلو۔ پہلے شہر کے اندر کے اڈے دیکھ لیتے ہیں۔ مگر یہ کاغذ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"میں سمجھتی ہوں۔ ہم یہ نقشے خوب سمجھ لیتے ہیں۔ آؤ میں راستہ بتاؤں گی۔" میگاں نے کہا اور پھر پرچے کو غور سے دیکھنے لگی۔ میں بھی اس کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ تب میگاں ایک طرف چل پڑی۔ ہم دونوں پیدل چل رہے تھے۔ ہمارے قرب و جوار میں بہت سے لوگ چل پھر رہے تھے۔ نئے افغانستان کے نئے لوگ' پتلون' بشرٹ' اسکرٹ' عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ جدید اور فیشن ایبل تھیں۔ زیادہ تر اسکرٹ اور منی اسکرٹ تھے۔ اور پھر حسن مشرق' روایتی جسم۔ میگاں اور دوسری لڑکیاں ان کے سامنے سوکھی ہوئی ہڈیاں لگ رہی تھیں۔ ہم چلتے رہے۔ میں بازاروں کی رونق دیکھ رہا تھا۔!

نہ جانے اس نقشے کی زبان کیا تھی۔ میگاں ایک عمارت کے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔ لیکن اس نے دروازے پر دستک دی تھی۔ لکڑی کے عظیم الشان دروازے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی نمودار ہوئی اور کسی نے جھانکا۔ پھر دروازہ کھل گیا اور ہم دونوں کے داخل ہوتے ہی بند ہو گیا۔ ایک لمبی راہداری تھی جو شفاف پڑی تھی۔ راہداری کا اختتام ایک دروازے پر ہوتا تھا۔ یہ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔

اندر قدم رکھتے ہی آنکھیں کھل گئیں بہت وسیع ہال تھا۔ جس میں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ نیم تاریکی کی سی کیفیت تھی۔ چاروں طرف ہپی نوجوان اور لڑکیاں دیواروں سے ٹیک لگائے پڑے تھے' چرس' کوکین' افیون کی گولیاں' انجکشن چاروں طرف سپلائی ہو رہے تھے۔ دیواروں میں گندی ہوا باہر پھینکنے والے پنکھے لگے ہوئے تھے۔ میگاں ہال کے وسط میں کھڑی ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میری فطرت جاگ اٹھی تھی جو کام میرے سپرد کیا گیا تھا' اب میں اسے کرنے کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ میں نے ایک اٹنڈنٹ کو بلا کر اسکے ہاتھ میں افغان کرنسی کا ایک نوٹ تھمایا اور اسے کچھ آرڈر دیئے۔ اٹنڈنٹ چلا گیا۔ پھر وہ ایک ٹرے میں ہمارا مطلوبہ سامان لے کر آ گیا۔ ٹرے میں بقایا رقم رکھی ہوئی تھی جو اچھی خاصی تھی۔ میں نے اسے بخشش کر دی اور پھر اس کا کوٹ پکڑتے ہوئے بولا۔

"اس اڈے کا مالک کون ہے؟" میں نے ٹوٹی پھوٹی انگلش استعمال کی تھی۔

"ہربنس سنگھ۔ سیٹھ ہربنس سنگھ۔" اس نے جواب دیا۔

"یہاں اس سے اچھی جگہ اور کوئی ہے۔؟"

"دریا کے دوسری سمیت کوہ بابا کے دامن میں ہمارا ہیڈ کوارٹر ہے۔ پورے افغانستان میں اس سے بڑا اور کوئی ساقی خانہ نہیں ہے۔"

"شکریہ۔ شکریہ۔ کیا ہم وہاں جا سکتے ہیں۔؟"

"میں پہنچا دوں گا۔ کل شام پانچ بجے میرے پاس آ جانا۔" اس نے جواب دیا اور میں نے گردن ہلا دی۔ پھر میں نے اسے ایک اور نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"کل تم کہاں ملو گے؟"

"اسی عمارت کے سامنے۔ کل پانچ بجے میری چھٹی ہو جائے گی۔"

"میں پہنچ جاؤں گا! میرا انتظار کرنا۔"

"ضرور صاب۔ وہاں ٹھہرنے کا بھی انتظام ہے۔ باقاعدہ انتظام' اٹنڈنٹ نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ اٹنڈنٹ چلا گیا۔ میگاں ہماری طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ پھرتی سے چرس کے سگریٹ بھر رہی تھی۔ اس نے دو سگریٹ تیار کئے۔ پھر ایک میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کا سگریٹ سلگایا اور پھر احتیاط سے Pyridin کی ننھی سی سرخ گولی اپنی خفیہ جیب سے نکال کر زبان کے نیچے رکھ لی۔ پھر میں نے اپنا سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لیتے ہوئے ہال کا جائزہ لینے لگا۔

ماحول وہی تھا۔ لیکن کافی سلیقہ تھا۔ بڑی باقاعدگی سے کام ہو رہا تھا۔ بہت سے ملازم ہال میں گردش کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھیں جن میں سرنج۔ پیالیاں اور نہ جانے کیا کیا رکھا ہوا تھا۔ ایک بہت بڑا کاؤنٹر لگا ہوا تھا۔ جن کے پیچھے ایک پگڑی بردار سردار جی بیٹھے تھے۔ ان کی عقابی نگاہیں ہال کا جائزہ لے رہی تھیں۔

میرا پہلا سگریٹ ختم نہیں ہوا تھا۔ میگاں دوسرا سگریٹ تیار کر رہی تھی۔ پھر اس نے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کہا۔ "ڈارلنگ!" اور میرے بازو پر گال رکھ دیا۔

"ہوں۔!" میں نے چونک کر کہا۔

"اگر تم اجازت دو تو۔ میں انجکشن لے لوں۔"

میں نے گردن ہلا دی۔ اور وہ خوش ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے گالوں اور آنکھوں کے کئی بوسے لینے کے بعد اس نے اٹنڈنٹ کو اشارہ کیا اور اپنا بازو کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔ اٹنڈنٹ نے ایک شخص کو اشارہ کیا اور وہ ٹرے لے کر میگاں کے پاس پہنچ گیا۔ میگاں نے انجکشن لیا۔ میں نے بل ادا کیا اور اس کے بعد ہم کافی دیر تک وہاں رکے رہے۔ میگاں اب بے خود ہو گئی تھی۔ اس کے حواس قائم نہیں تھے۔ تب میں نے اس کا بازو پکڑا۔ اور ساقی خانے سے نکل آیا۔ تھوڑے فاصلے پر گزرتے ہوئے تانگے کو روکا اور اس میں میگاں کو لے کر چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم شاہ پر میں داخل ہو رہے تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے میگاں کو چارپائی پر دھکیل دیا اور اوندھی سیدھی گر پڑی۔ نہ جانے کیوں اس وقت سے میگاں سے کچھ کوفت ہو رہی تھی' جب میں نے اس کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھی تھی۔ اس وقت بھی اسے جگا کر کھانا کھلانے کو دل نہیں چاہا۔ جہنم میں جائے۔ میں نے باہر نکل کر کھانا طلب کیا۔ میگاں سوتی رہی۔ میں نے کھانا کھایا اور پھر حسب معمول گدے پر لیٹ گیا۔ کئی بار دل چاہا کہ میگاں کے پاس پہنچ جاؤں۔ اسے ہوشیار کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں کی اجنبیت یاد آ جاتی اور اسی الجھن میں نیند آ گئی۔!

بڑی گہری نیند تھی۔ صبح کو دیر سے آنکھ کھلی۔ سب سے پہلے کمرے کے کھلے ہوئے

دروازے پر نگاہ پڑی' اور میں ایک گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔ میگاں ہوش میں آ گئی تھی۔ یقیناً وہ بھوکی ہو گی اور کھانے کی تلاش میں نکل گئی ہو گی۔ طبیعت پر کچھ بے چینی سوار تھی۔ باتھ روم میں چلا گیا۔ لباس اتارا اور خوب بدن مل مل کر نہایا۔ نہانے سے ایسا لگا جیسے طبیعت سے تمام کسل اتر گئی ہو۔ پھر باہر نکل آیا۔ میگاں واپس نہیں آئی تھی۔ میں خود بھی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر میگاں کو تلاش کیا۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہ تھی۔!

کہاں چلی گئی؟ میں نے سوچا اور کمرے میں واپس آ گیا۔ چارپائی پر کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ لیکن میگاں نہ آئی۔ تب میں نے ایک اور انداز میں سوچا ممکن ہے میگاں مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ ظاہر ہے وہ میری کون تھی۔ اور اب اسے معلوم تھا کہ میرے پاس چرس بھی نہیں ہے۔ ہاں میں اسے خرید ضرور سکتا ہوں۔ لیکن۔ دفعتاً ایک اور خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ میں نے چونک کر اپنے تھیلے کی طرف دیکھا۔ تھیلا موجود تھا۔ میں جلدی سے اٹھ گیا۔ جس جگہ سویا تھا' وہاں پرس بھی نیچے رکھ دیا تھا۔ میں نے گدے کا کونا اٹھایا' پرس تلاش کیا۔ لیکن پرس موجود نہیں تھا۔

"خوب۔!" میں نے ایک گہری سانس لی۔ میگاں کی آنکھوں کی اجنبیت مجھے یاد آ گئی۔ اس نے کوئی نیا کام نہیں کیا تھا۔ اس کا ساتھی بھی یہی سب کچھ کر چکا تھا۔ لیکن اب کچھ الجھنیں پیش آ گئی تھیں۔ پیسے نہیں تھے ہوٹل کے لوگ صبح ہی صبح ہر گاہک سے پیسے وصول کر لیتے تھے مجھے یقین تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد میرے کمرے پر بھی کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔ اور اس کے بعد کیا ہو گا۔ جو ہونے والا تھا' وہ میں نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن جونہی دروازے سے باہر قدم رکھا۔ سامنے ہی ایک قوی الجثہ بیرا نظر آیا' میرے کمرے کی طرف ہی آ رہا تھا۔

"سنو۔!" میں نے اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی اسے پکارا اور پھر اسے ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ "جلدی سے آؤ۔ اور بل بھی ساتھ لیتے آنا۔" میرے آخری الفاظ سن کر اس نے گردن ہلائی۔ یقیناً وہ بل وصول کرنے آ رہا تھا لیکن اس نے سوچا ناشتے کے بعد ہی سہی مجھے فرار ہونے کے لیے چند منٹ مل گئے تھے چنانچہ جوں ہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا۔ میں پھرتی سے بائیں سمت مڑ گیا۔ ابھی جب میگاں کو تلاش کرنے گیا تھا تو ادھر میدان صاف پایا تھا۔ اس وقت بھی کوئی نہیں تھا۔ میں برق رفتاری سے نکل آیا۔ اور پھر سڑک پر تھوڑی دور تک دوڑنا پڑا تھا!

زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ ابھی بازار ٹھیک سے کھلے بھی نہ ہوں گے چنانچہ میں پیدل چلتا رہا۔ ایک طویل فاصلے طے کر کے میں جدید کابل میں نکل آیا۔ جدید کابل واقعی جدید تھا۔ افغانستان نے اپنی جغرافیائی حیثیت کی آڑ میں پوری دنیا سے بے پناہ امداد حاصل کی ہے۔ جس کا اظہار شہر کابل کی حسین عمارتوں اور اعلیٰ سڑکوں سے ہوتا ہے۔ ان سڑکوں پر قیمتی کاریں دوڑتی ہیں بلند و بالا عمارتوں میں غیر ملکی کمپنیوں کے بڑے بڑے دفاتر ہیں۔ ہر قسم کی ترقی ہو رہی ہے اور جدید افغانستان جدید سے جدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی بڑھ گیا ہے۔ ہاں بھوری پہاڑیوں کے اس طرف آباد افغانستان آج بھی صدیوں پرانی یادیں تازہ کرتا ہے۔ ہندو کش کا عظیم سلسلہ جس سے بے شمار

روایات وابستہ ہیں جس کی بلند و بالا برف پوش چوٹیاں قدرتی صناعی کا بے مثال نمونہ ہیں' سکندر کا آباد کیا ہوا شہر جس کے کھنڈرات آج بھی سیاحوں کی جنت ہیں۔ اس شہر کی تاریخی حیثیت ذہنی پردوں پر ٹھوکریں مارتی ہے۔ قرب و جوار کے باشندے آج بھی قدیم روایات کو سینے سے لپٹائے وقت کا منہ چڑا رہے ہیں۔ وقت کی گرم ہواؤں نے انہیں متاثر نہیں کیا ہے۔

سورج اچھی طرح چڑھ گیا تو میں نے ایک ٹیکسی روکی اور اس کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ''افغان اسٹریٹ۔'' میں نے ڈرائیور سے کہا اور ڈرائیور نے لمبی کار آگے بڑھا دی۔ زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا۔ اور ڈرائیور نے کار کی رفتار سست کر کے میری طرف دیکھا۔

''چلتے رہو۔! ایک دوکان تلاش کرنی ہے۔'' میں نے اردو میں کہا۔ تو اس نے چونک کر میری شکل دیکھی۔ یہاں اردو اچھی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ خاص طور سے ایسے لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں جن کا واسطہ باہر سے آنے والوں سے پڑتا رہتا ہے۔ بلکہ سکھوں کی بہتات نے انہیں پنجابی بھی سکھا دی ہے۔ میں سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے بورڈ اور نیون سائن پڑھتا جا رہا تھا۔ ذہن میں تھوڑی الجھن بھی تھی۔ اگر آئرن سٹور بند ملا۔ تو ڈرائیور کو پیسے کہاں سے ادا کروں گا۔ لیکن بیشتر دوکانیں کھل گئی تھیں۔ پھر ایک بڑے سے بورڈ پر آئرن اسٹور کے الفاظ نظر آئے! اور میں نے سکون کی ایک سانس لی۔!

آئرن اسٹور بہت بڑا اسٹور تھا۔ دس بارہ سیلز مین کام کرتے تھے' یہاں موٹروں کے پرزے فروخت ہوتے تھے۔ میں ٹیکسی سے اتر کر اندر داخل ہو گیا ایک سیلز مین میری طرف بڑھا تھا۔

''زیار خان سے ملنا ہے۔!''

''صاحب ابھی نہیں آیا۔'' سیلزمین نے جواب دیا۔

''سنو۔ میں ان کا مہمان ہوں۔ ٹیکسی کا بل ادا کر دو۔ میں انتظار کروں گا۔!'' میں نے کہا اور سیلز مین گہری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ بہرحال پھر وہ جا کر ٹیکسی کا بل ادا کر آیا۔ لیکن اس کا انداز ایسا تھا کہ اگر میں ہلنے کی کوشش بھی کروں تو وہ لپک کر مجھے پکڑ لے۔ مجھے سخت ذہنی کوفت ہو رہی تھی لیکن یہ کوفت طویل نہ رہی۔ ایک سرخ رنگ کی لمبی کار اسٹور کے سامنے آ کر رکی اور اس سے لمبے قد کا ایک خطرناک شکل آدمی سوٹ پہنے اتر آیا۔

سیلز مین مستعد ہو گئے تھے' جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ زیار خان ہے۔ چنانچہ میں کھڑا ہو گیا۔ زیار خان دوکان میں داخل ہو کر اپنے کیبن کی طرف بڑھ گیا جسے ایک پارٹیشن کے ذریعے دوکان سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اس نے کیبن کی طرف بڑھتے ہوئے سرسری نگاہ مجھ پر بھی ڈالی تھی۔ ظاہر ہے وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا۔! بہرحال اس کے کیبن میں داخل ہونے کے بعد سیلز مین نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔

''وہ میں اسی کو بتاؤں گا! تم کہہ دو کہ پشاور سے مہمان آیا ہے'' میں نے کہا اور سیلز مین اندر چلا گیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے واپس آ کر مجھ سے اندر چلنے کے لیے کہا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ زیار خان دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں لاپرواہی سے اس کے سامنے پڑی ہوئی کرسی

گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سیلز مین سے واپس چلے جانے کے لیے کہا تھا۔

''میرا نام اصغر نواز ہے۔ کیا غلام سیٹھ نے تمہیں میرے بارے میں اطلاع نہیں دی۔؟''

''اوہ۔ ہاں۔ اطلاع مل گئی ہے۔ میں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔'' زیار خان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے کرسی سے کھڑے ہو کر مجھ سے مصافحہ کیا۔

''میرا حلیہ وغیرہ بھیج دیا گیا ہو گا۔''

''ہاں۔ مل گیا ہے۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ نے کام شروع کر دیا۔؟''

''ہاں۔ کام شروع ہو چکا ہے۔ آپ سے چند باتیں معلوم کرنا ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ضرور فرمایئے؟'' زیار خان نے کہا۔

''کیا آپ کو ان اڈوں کے بارے میں معلومات نہیں ہے۔''

''کسی حد تک ہے۔ لیکن مقامی باشندے ان کے بارے میں زیادہ چھان بین نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ بھی اردگرد کے ماحول سے باخبر رہتے ہیں۔ باہر سے جو لوگ آتے ہیں وہ اس حد تک آلہ کار نہیں بن سکتے کہ وہاں سے معلومات فراہم کر کے ہمیں دیں۔ اس کے علاوہ ہمارا کاروبار زیادہ پرانا نہیں ہے۔ تاہم ہم نے ابتداء اعلیٰ پیمانے سے کی ہے۔ ابھی بہت سے شہروں میں جہاں جہاں سے ان آوارہ گردوں کا گزر ہے' ہمارے آدمی بھی موجود نہیں ہیں۔ ہم اس پٹی پر اپنا جال بچھانا چاہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کام ہو رہا ہے۔ لیکن بہت جلد آپ دیکھیں گے کہ شاہراہ حشیش پر ہمارا مکمل قبضہ ہو گا اور دوسرے لوگ صرف ہمارے نمائندے بن کر کام کر سکیں گے۔''

''بہت خوب۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کام مجھ جیسے ناتواں انسان سے پورا نہ ہو سکے گا۔ اس میں تو زیادہ لوگوں کی ضرورت ہے۔''

''آپ تنہا نہیں ہیں مسٹر نواز۔ بے شمار لوگ کام کر رہے ہیں اور بہت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ سروے تو ایک معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت اس وقت ہو گی جب ہمارے اسٹور کام شروع کر دیں گے۔''

''ہوں۔!'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہاں چار اڈے کام کر رہے ہیں۔ جن میں دو شہر میں اور دو شہر کے باہر۔ ان میں تین اڈے ہربنس سنگھ کے ہیں۔''

''جی ہاں۔ باقی شہر سے ہٹ کر ایک اڈہ فوجی خان کا ہے۔ لیکن وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ چند مقامی غنڈے مل کر کام کر رہے ہیں۔ ان کے پاس زیادہ مال بھی نہیں ہوتا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم فوجی خان کو اٹھا کر ہربنس کا کاروبار فیل کریں گے۔ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ ہربنس سنگھ مال کہاں سے لیتا ہے۔ ویسے اس کے کاروبار کی اصل جگہ گرشک کے قریب لشکری بازار اور قلعہ بست کے کھنڈرات ہیں۔ ان کھنڈرات کے قریب زیادہ آبادی نہیں ہے۔ اس لیے اونٹوں پر مال آتا ہے اور وہیں سے افغانستان کے مختلف حصوں میں پھیل جاتا ہے۔ ہربنس کا کاروبار غزنی' قندھار اور ہرات میں پھیلا ہوا ہے۔ ان تمام جگہوں پر اس کے اڈے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا آج شام کو میں

اس کے ہیڈ کوارٹر جا رہا ہوں۔"

"اوہ۔ کیا کوئی بندوبست ہو گیا ہے۔؟" زیار خان نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔!"

"بہت اچھی بات ہے۔ ویسے اگر ضرورت پڑے تو اس کے ہاں ہمارا ایک آدمی گلزار خان موجود ہے۔ مارفیا سیکشن کا انچارج ہے۔ ضرورت پڑنے پر میرے حوالے سے اس سے مدد لے سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے وہ نام نوٹ کر لیا۔

"رقم کی ضرورت ہو گی۔ سیلز مین نے بتایا ہے کہ ٹیکسی کا بل اسے ادا کرنا پڑا تھا۔" زیار خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ پرس اڑا لیا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی حرج نہیں ہے۔ جیبیں بھر کر جائیے تاکہ پذیرائی ہو۔!" اس نے کہا اور پھر گھنٹی بجا کر کسی کو بلایا۔ ایک لمبے قد کا دبلا پتلا افغانی اندر داخل ہوا اور زیار خان نے اس سے ایک بڑی رقم لانے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ بڑی رقم میری جیب میں منتقل ہو گئی تھی۔

"اور کوئی خدمت؟" زیار خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ بس اجازت۔!" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ زیار خان نے مصافحہ کیا اور میں آئرن اسٹور سے باہر نکل آیا۔ تھوڑے فاصلے پر ٹیکسی مل گئی اور میں اس میں بیٹھ گیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے شاہ پر ہوٹل چلنے کے لیے کہا اور اس نے منہ بنا کر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ نئی ٹیکسیوں والے پرانے کابل کی طرف جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس طرف کی سڑکیں ناہموار تھیں۔ بہرحال تھوڑی دیر کے بعد میں شاہ پر کے سامنے اتر گیا۔ میں نے ایک اچھا خاصا نوٹ دے کر ڈرائیور کی پیشانی کے بل نکال دیئے اور وہ مجھے سلام کر کے چلا گیا۔ شاہ پر کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا۔ اتفاق سے وہی بیرا نظر آیا تھا جس سے ناشتہ منگوایا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ اور اس طرح میری طرف لپکا جیسے آتے ہی گردن دبوچ لے گا! لیکن میں نے فوراً پرس نکال لیا تھا۔ اور پھر میں کاؤنٹر پہنچ گیا۔ بیرے کے قدم بھی سست پڑ گئے۔ میں نے کلرک سے بل کی رقم پوچھی اور اسے ایک نوٹ ادا کر دیا۔

بیرے کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات پیدا ہو گئے تھے۔ "کھانا لے کر آ جاؤ۔!" میں نے اس سے کہا۔ اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"سنئے جناب۔!" اچانک کلرک نے لجاجت سے مجھے مخاطب کیا۔ اور میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "ایک غلطی ہو گئی ہے۔ دراصل یہاں بہت خراب لوگ بھی آتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کون شریف ہے اور کون بدمعاش، آپ اچانک چلے گئے تھے۔ اس لیے۔ اس لیے ہمیں غلط فہمی ہو گئی۔ آپ کا تھیلا ہمارے پاس محفوظ ہے۔"

"ہوں۔!" میں نے غراتے ہوئے کہا۔ "تھیلا اور کھانا بھیج دو اور یہ کل کے لیے رکھو۔!"

میں نے ایک اور نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر پھینک دیا۔ اور پھر میں واپس اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ بیرا چابی لیے ہوئے میرے پیچھے دوڑا ہوا آ رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے ایک اور شخص میرا تھیلا لئے ہوئے تھا میں نے دونوں میں سے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ گرد آلود جوتے اتار کر باتھ روم میں گیا۔ پیر دھوئے۔ جس سے کافی سکون ملا۔ اور پھر میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔!

چند منٹ کے بعد بیرا کھانے کی ٹرے سجائے ہوئے اندر آ گیا۔ اس میں بھنے ہوئے مرغ پنیر لگے سلائس اور دہی کے دو پیالے رکھے تھے۔ خوب بھوک لگ رہی تھی، اس لئے ڈٹ کر کھایا۔ بیرا برتن لے گیا تو میں لباس اتار کر آرام کرنے لیٹ گیا۔ میگاں کا خیال ذہن میں آیا۔ لیکن کوئی کوفت نہ ہوئی ان لوگوں سے پہلے ہی آگاہ ہو چکا تھا، اب اور احتیاط رکھوں گا۔ بہرحال غلام سیٹھ کا معاملہ کسی حد تک سلجھ گیا تھا۔ بہرحال جس حد تک بھی وہ مجھ سے چاہتا تھا اس کے لیے خاصی محنت کی ضرورت تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کافی دن تک افغانستان میں قیام کرنا ہو گا۔ میں دل سے ان لوگوں کے لیے کام کرنے پر آمادہ تھا کیونکہ زندگی کو بہت بڑا سہارا مل گیا تھا۔ اس آوارہ گردی کے بارے میں، میں نے بھی سوچا تھا، لیکن اس وقت کے اور اب کے انداز میں کافی فرق تھا۔ اب مجھے ہر سہولت مہیا تھی۔ میگاں سے پیچھا چھوٹ گیا تھا اس لیے افغانستان دیکھنے کے مواقع بھی فراہم ہو گئے تھے۔ لیکن بہرحال کسی حسین ساتھی کی ضرورت تو قدم قدم پر پیش آتی ہے۔ اور اس کی کمی نہیں تھی۔ کسی بھی ہپی لڑکی کو کچھ لے دے کر ساتھی بنا لو۔ بہرحال میں نے ان پر رحم کھانے سے توبہ کر لی تھی۔ بس خرچ کرو، عیش کرو۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔! کافی دیر تک میں آئندہ اقدامات پر غور کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔

چار بجے آنکھ کھلی۔ منہ ہاتھ دھویا، بال وغیرہ سنوارنا چھوڑ دیا تھا اس سے شخصیت ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن اندازہ ضرور لگا سکتا تھا۔ اتفاق سے جن لوگوں سے ٹکراؤ ہوا تھا وہ سب کے سب بھیک منگے تھے۔ بہت سے ایسے بھی نظر آئے تھے جو اچھے لباس میں ہوتے تھے۔ اور خوب خرچ کرتے تھے۔ گویا اس انداز میں بھی ان کے لیے اجنبی نہ ہوں گا! پھر فقیروں کی طرح مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن آج کے بعد سہی۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد بیرے سے وقت پوچھا اور باہر نکل آیا۔ اس طرف ٹیکسی کا وجود نہیں تھا۔ تانگے البتہ نظر آ جاتے تھے۔ ایک تانگے میں بیٹھ کر چل پڑا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد مطلوبہ جگہ موجود تھا۔! ٹھیک پانچ بجے اٹنڈنٹ مجھے نظر آیا۔ اس کی نگاہیں بھی شاید مجھے ہی تلاش کر رہی تھیں۔ چنانچہ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے قریب پہنچ گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بولا۔

"وہاں جانے کے لیے کارڈ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرح سے یہ ضمانتی کارڈ ہوتا ہے۔ میں نے تمہارا کارڈ بنوا لیا تھا۔ اس پر سو افغانی خرچ ہوئے۔ اگر تم نہ آتے تو میں مارا جاتا۔ غریب آدمی ہوں۔" اس نے کہا اور میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر اسے تھما دیا اور اس نے سفید رنگ کا ایک کارڈ میرے حوالے کر دیا۔ پھر بولا۔ "آؤ۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دوں۔ لیکن، تمہارا سامان کہاں ہے؟"

"میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اپنا تھیلا میں نے شاہ پر میں ہی چھوڑ دیا تھا' کیونکہ اس میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ مسجد والے پل سے دریائے کابل کو عبور کر کے ہم بلندی کی طرف چل پڑے۔ مغرب کی طرف کوہ بابا کی برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں۔ سبزبازار سے ٹیکسی لی اور کوہ بابا چل پڑے۔ یہاں سیاحوں کے لیے ایک سڑک بنا دی گئی ہے۔ انتہائی شفاف اور سیدھی سڑک جو روسیوں نے تعمیر کی ہے۔ یہ سڑک سیدھی کوہ بابا لے جاتی ہے۔ دور سے یہ چوٹیاں بالکل نزدیک نظر آتی ہیں۔ لیکن فاصلہ کافی ہے۔ ٹیکسی نے ہمیں القمر چھوڑ دیا۔ پہاڑیوں کے دامن میں گھرا ہوا سفید رنگ کا یہ ہوٹل دور سے بہت خوبصورت نظر آتا ہے۔ سیاح قرب و جوار میں گھومنے کے بعد یہیں قیام کرتے ہیں۔ یا پھر "ضرورت مند" ایک طویل ناہموار فاصلہ طے کر کے ان پہاڑوں میں جا نکلتے ہیں جہاں منشیات کی جنت ہے۔! یہ عظیم الشان غار ہر قسم کے مجرمانہ مقاصد کیلئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ یقیناً حکومت افغانستان ان سے ناواقف نہ ہوگی۔ لیکن ایک معقول رقم کے عوض اگر کوئی ان غاروں میں اپنا کاروبار شروع کر دے تو حکومت کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے!

میرا گائیڈ مجھے لئے ہوئے ناہموار راستوں پر چلتا رہا۔ ہم بے خبر چلے جا رہے تھے کہ ایک چٹان کے عقب سے دو ہٹے کٹے افغانی ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں باندھے نکل آئے۔ ان کے تنومند جسموں کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا پستول لٹکے ہوئے تھے اور کارتوس کی پیٹی نمایاں تھی۔!

"کارڈ دکھاؤ صاب۔!" میرے گائڈ نے کہا۔ اور میں نے کارڈ نکال کر ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے کارڈ دیکھ کر گردن ہلائی اور میرے ساتھی نے مجھ سے اجازت مانگی۔ میں نے پرس سے کچھ نوٹ نکال کر اوپری جیب میں رکھ لیے تھے۔ ان میں سے دس افغانی نکالکر میں نے گائڈ کو دیئے اور وہ سلام کر کے واپس چلا گیا۔

"آؤ۔!" ان دونوں میں سے ایک نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اشارہ کر دیا تھا۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ عجیب پراسرار ماحول تھا۔ غار کے دوسری طرف ایک نیم تاریک ہال تھا۔ جس میں صرف ایک کاؤنٹر لگا ہوا تھا۔ کاؤنٹر پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ آنے والے نے کارڈ ان میں سے ایک کو دے دیا جسے لاپرواہی سے جمع کر لیا گیا۔ اور مجھے ایک اور دروازے سے دوسری طرف جانے کا اشارہ کیا گیا۔ میں اس طرف چل پڑا۔

غار کے دوسری طرف قدم رکھتے ہی ایک ٹھنڈک کا احساس ہوا یوں بھی ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی اسٹینڈرڈ کے ہوٹل میں آ گیا ہوں اس عظیم الشان غار کو ایر کولر لگا کر ٹھنڈا کیا گیا تھا۔ اس سے یہاں کی گھٹن ختم ہو گئی تھی۔ اور خاصی خنکی محسوس ہوتی تھی۔ پورے ہال میں بدمست آوارہ گرد پڑے ہوئے تھے۔ ان میں لڑکیاں تھیں اور مرد بھی۔ سب ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔ دم لگ رہے تھے۔ غم مٹ رہے تھے' لمبی لمبی نلکیاں' جن میں افیون پی جاتی تھی۔ میں نے لباس میں نشہ ختم کرنے والی گولی تلاش کی۔ یہ ضروری تھیں اور خاصی مقدار میں مجھے فراہم کر دی گئی تھیں

کیونکہ بہرحال مجھے ہر قسم کا نشہ کرنا تھا۔ اس کے بغیر میرا حلیہ بے معنی ہو جاتا تھا۔!

ہال میں چلتے ہوئے میں نے اپنے قدموں کے نیچے نرم قالین محسوس کیا۔ اپنی طرف سے ان لوگوں نے ہر آسائش کا بندوبست کر رکھا تھا یہ دوسری بات ہے کہ یہاں آنے والے وحشی اور جانور تھے۔ انہیں نشہ آور اشیاء کے علاوہ کسی دوسری چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایک کونے سے انگریزی موسیقی کی دھنیں نشر ہو رہی تھیں۔ مجموعی حیثیت سے دلچسپ ماحول تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ اور پھر ایک کونے میں جا بیٹھا۔ فوراً" ایک سفید لباس والا افغانی لڑکا میرے پاس پہنچ گیا۔

"یس پلیز۔!" اس نے شستہ انداز میں کہا۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر آرڈر دے دیا۔ وہ چلا گیا۔! چند منٹ کے بعد وہ ایک پلیٹ میں افیون کی گولیاں' پائپ' دیا سلائی اور ایک شیشی میں آتش گیر سیال لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی پلیٹ میں بل بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے بل دیکھا اور ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"باقی تم رکھو۔!" میں نے بھاری آواز میں کہا اور وہ ادب سے گردن جھکا کر چلا گیا۔ میں نے افیون کی گولی پائپ میں رکھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سرخ گولی زبان کے نیچے رکھ لی تھی۔ پھر میں نے ایک تیلی سے آتش گیر سیال گولی پر لگایا اور ماچس کی تیلی کھینچ کر اس میں آگ لگا دی۔ گولی سلگ اٹھی اور میں نے پائپ دانتوں میں دبا لیا۔!

ننھی سی چنگاری بلند ہوئی اور میرا منہ کڑوا ہو گیا۔ مجھے ابکائی آنے لگی۔ شکر ہے نیم تاریک ماحول تھا ورنہ میری بگڑی ہوئی شکل بہت سے دیکھتے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔ تھوکنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ بڑا سخت وقت آ پڑا تھا۔ دماغ کی خرابی پر خود کو کوستا رہا۔ چرس سے بھی کام چل سکتا تھا خواہ مخواہ یہ مصیبت گلے لگالی۔ بہرحال برداشت کرتا تھا۔ دماغ گھوم کر رہ گیا تھا کڑواہٹ تھی کہ الامان الحفیظ۔ حلق کے راستے پیٹ تک کڑوا ہو گیا تھا۔

دھواں خارج کر کے چاروں طرف دیکھا۔ حسب توقع کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا' بہرحال دوسرے کش کی ہمت نہ ہوئی۔ گولی سلگتی رہی اور پھر راکھ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے تک آٹھ گولیاں راکھ کر دیں۔ پلیٹ میں ابھی چند گولیاں اور باقی تھیں۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ انہیں بھی راکھ کر کے دم لیا جاتا۔!

ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگا کر میں نیم تاریک ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ اور چند منٹ کے بعد میں نے ایک خاص بات محسوس کی۔ یہاں جتنے بھی آوارہ گرد تھے ان میں ایک بھی بوسیدہ لباس والا نہیں تھا۔ شکلیں اور چہرے تو سب کے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن یہ کم از کم ان فقیروں میں سے نہیں تھے' جو صرف بھیک مانگ کر گزارہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہاں کے اخراجات ہوں۔ ایسے ایسے لوگوں کو یہ اجازت ہی نہ دیتے ہوں گے۔ اسی لیے شاید کارڈ سسٹم رکھا گیا ہے۔ تاکہ ان کے ایجنٹ غلط لوگوں کو اس طرف نہ آنے دیں۔

لیکن میرے بارے میں یہ اندازہ کیسے لگا لیا گیا کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔! اور اس

سلسلے میں صرف ایک ہی بات سوچی جاسکتی ہے۔ میرے گائڈ نے میری حیثیت کے بارے میں اندازہ لگالیا تھا۔! ورنہ وہ مجھے یہاں تک نہ آنے دیتا۔!

رات ہو چکی تھی۔ سونے والے جاگ رہے تھے۔ ہال کی روشنیاں تیز ہوتی گئیں۔ تاریکی چھٹ گئی تھی۔ یہ بھی دلچسپ بات تھی۔ یہاں دن کو اندھیرا ہوتا تھا اور رات کو روشنی۔ چرس' افیون اور دوسری منشیات کی خوشبو ہال میں چکرا رہی تھیں' ایلوس پریسلے کا ایک ریکارڈ بج رہا تھا۔ پژمردہ چہرے روشن ہوتے جا رہے تھے۔ میں بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔! ہال میں کچھ اور ہپی داخل ہوئے تھے۔ ریکارڈ ختم ہو گیا۔ اور اس کے بعد۔ اچانک ایک مقامی دھن بجنے لگی۔! اس کے ساتھ ہی پورے ہال میں تیز روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ یہ روشنیاں دیواروں سے پھوٹی تھیں اور پھر ایک افغانی رقاصہ روایتی لباس میں ملبوس ایک سوراخ سے نکل آئی۔! اس نے رقص شروع کر دیا۔ اور تمام ہپی دلچسپی سے اس کے رقص کو دیکھنے لگے! میں نے ایک گہری سانس لی اور خود بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ رقاصہ کافی تیز رقص کر رہی تھی۔ اور پھر رقص کرتی ہوئی وہ میرے سامنے آگئی۔ میں نے اس کے حسین چہرے کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ بلاشبہ وہ انتہائی موزوں نقش و نگار کی مالک تھی۔ رقاصہ میرے سامنے رک گئی۔ اس نے دلچسپ نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا اور۔!

☆ ☆ ☆

پھر اس نے ناک سکوڑ کر مجھے اشارہ کیا اور بل کھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے جوان جسم کو دیکھ رہا تھا اب مجھے جسموں کی خاصی پہچان ہو گئی تھی۔ میں لباس کی تہوں میں چھپے ہوئے ہیروں کو بخوبی پہچان لیتا تھا۔ بلاشبہ وہ حسین ترین جسم کی مالک تھی۔ لیکن وہ اشارہ کیسا تھا۔ کیا صرف گاہکوں کو خوش کرنے کی ایک ادا؟ یا کچھ اور؟

لیکن اس کچھ اور کے چکر میں پھنس کر میں ذہن کو الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے صرف اس کے رقص سے دلچسپی لی۔ یہاں کا ماحول بھی میرے لیے اجنبی تھا۔ نہ جانے یہاں کے کیا آداب ہوں۔ چوغوں میں ملبوس طویل القامت اور تنومند افغانی بھی خاصی تعداد میں یہاں موجود تھے۔ اور ان کی موجودگی کچھ معنی ہی رکھتی ہوگی۔ یوں بھی یہاں وہ طوفان بدتمیزی نہیں تھا جو ان آوارہ گردوں کی خاصیت ہے۔

افغانی رقاصہ رقص کرتی رہی اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا رقص ختم ہو گیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے تالیاں بجائیں اور رقاصہ نے سرخم کر دیا۔ اس کی بٹی ہوئی باریک چوٹیاں جھولنے لگیں' جنہوں نے اس کے حسن کو کچھ اور جلا بخش دی۔ پھر وہ اسی راستے سے واپس اندر چلی گئی جس سے آئی تھی۔

ہال میں خاموشی پھیل گئی۔ آرکسٹرا بھی خاموش ہو گیا۔ دھیمے دھیمے لہجے میں لوگوں کی گفتگو ابھرنے لگی۔ سروس تیز ہو گئی۔ ٹوٹے ہوئے نشے پورے کیے جانے لگے۔ انجکشن کیپسول تقسیم ہونے لگے۔ پھر ایک دراز قد ہپی اٹھا اور کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر منیجر کے سامنے جھک گیا۔ اس نے منیجر سے کچھ کہا تھا اور منیجر نے اسے اجازت دے دی تھی۔ ایک لمبا مائیک لا کر رکھ دیا گیا اور ہپی

اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس نے ساز بجانے والوں کو ہدایات دیں اور پھر ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ صاف اور شستہ انگریزی میں ایک خوبصورت نغمہ۔ اور جوڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر رقص کرنے لگے۔ دھیما دھیما رقص۔ میں ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ بہت سے انسان بہت سی کہانیاں خود میری بھی ایک کہانی تھی۔ انوکھی کہانی۔ یہ سب مجھ سے جدا کہاں تھے۔ نہ جانے ان میں کون کیا ہو۔ جانے کس کی کہانی سب سے دلچسپ' سب سے پردرد ہو۔ میں ان کی شکلیں دیکھنے لگا۔ ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھے' آنکھیں بند کئے' رقص و نشے سے سرشار' خود کو بھلانے میں کوشاں۔ زندگی ایک سخت امتحان ہے۔ ممتحن نت نئے ہنگامے' نت نئے حادثے بکھیر دیتا ہے اور پھر انسان کی جدوجہد دیکھتا ہے۔ کچھ خود کو ان حادثوں میں گم کر دیتے ہیں۔ کچھ ان سے فرار حاصل کر کے اپنے آپ کو مضحکہ خیز بنا لیتے ہیں۔ میں کیا ہوں۔ نواز اصغر سرائے عالمگیر نامی ایک خوبصورت بستی کے ایک سادہ دل کسان کا بیٹا۔ تنومند قوی۔ مجھے کھیتوں میں ہل چلانا چاہیے تھا۔ میرے لیے غلط پلاننگ کی گئی۔ میری سادگی چھین لی گئی۔ میری شخصیت بدل دی گئی اور میں اس بدلی ہوئی شخصیت کو قبول نہ کر سکا۔ میرے راستے غلط ملط ہو گئے اور میں الٹی سیدھی چھلانگیں لگانے لگا۔ اور اب میں اپنے ہی جیسے انسانوں کا آلہ کار تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میرے ساتھی آخر مجھ سے کونسا کام لینا چاہتے ہیں۔ مجھے نوکری کی ضرورت تھی۔ نوکری نہیں ملی۔ ایک وقت کا کھانا کوئی دینے کو تیار نہ تھا۔ لیکن پھر اپنے مقاصد کے لیے انہوں نے مجھے اپنا لیا۔ میرے اوپر زبردست رقم خرچ کی گئی۔ مجھے ہر سہولت مہیا کی گئی۔ آج مجھے دولت کی کوئی فکر نہیں ہے۔ جس قدر چاہوں ان سے لے لوں۔ لیکن میں نے ابھی تک کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ ان کے نمائندے ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ بھی صورت حال سے باخبر ہیں۔ پھر میرا کیا کام ہے؟

مجھے یہ سب عجیب محسوس ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوگ صرف میری پرورش کر رہے ہوں۔ آخر یہ بھی کوئی کام تھا۔ ان کا ماضی الضمیر بھی واضح نہیں ہوا تھا۔ مجھے صحیح طور سے کچھ معلوم ہو تو میں کام بھی کروں۔ جب ان کے نمائندے ہی تمام معلومات رکھتے ہیں تو پھر میں کس مرض کی دوا ہوں؟ میں کیا کروں؟ لیکن ان تمام باتوں میں ذہن الجھانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دیا جائے۔ میری وفاداریاں ان کے ساتھ رہیں گی جس طرح وہ چاہیں گے ان کے لیے کام کرتا رہوں گا اور جب وہ میری ضرورت محسوس نہیں کریں گے تب پھر وقت کے لحاظ سے خود کو بدل لوں گا۔ انہی خیالات میں غلطاں تھا۔ ہپی جوڑے اب دھیمی موسیقی میں رقص کر رہے تھے۔ مائیک کے پیچھے کھڑا ہوا ہپی اپنا گانا ختم کر چکا تھا اور اب خود بھی ایک لڑکی سے لپٹا ہوا رقص کر رہا تھا۔

دفعتاً مجھے اپنے نزدیک کسی کا احساس ہوا۔ اور میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ گہرے سیاہ بالوں میں چاند نکلا ہوا تھا۔ دودھ کی طرح سفید چہرہ' دلکش نقش و نگار۔ بغیر پلکیں جھپکائے میں اسے دیکھتا رہا۔ بدلے ہوئے لباس میں' میں اسے پہچان نہ سکا تھا۔ لیکن وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ سے میں اسے پہچان گیا۔ یہ افغان رقاصہ تھی جو تھوڑی دیر قبل رقص کر رہی تھی۔

"آر یو برٹش؟" اس نے دونوں کہنیاں میز پر رکھ کر جھکتے ہوئے پوچھا۔ اور میری نگاہیں اس

کے کھلے ہوئے گریبان کی طرف اٹھ گئیں۔ سوکھی سڑی ہیپی لڑکیوں کے برعکس وہ تروتازگی کا منبع تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں۔ پاکستانی!" میں نے جواب دیا۔ اور وہ حیرت سے چونک پڑی۔ میری صاف اردو نے اسے حیران کردیا تھا۔

"اوہ۔ ہم تمہیں برٹش سمجھا۔ اس نے بھی اردو میں کہا۔ "پٹھان ہے؟"

"مگران لوگوں میں تمہارا کیا کام؟"

"نروان کی تلاش۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میری بات شاید وہ نہیں سمجھی تھی۔ چند لمحے میری شکل دیکھتی رہی۔

"میں تم کو پسند کیا۔" اس نے اپنا سفید ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"شکریہ۔" میں نے اس کے ملائم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور وہ مسکرانے لگی۔

"یہ لوگ اچھا نہیں ہے۔ گندا' غلیظ' چھی' تم ان کے ساتھ کیا کرتا ہے۔" اس نے ایک ادا سے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

"میں ان کے ساتھ نہیں ہوں۔ میں سیاح ہوں۔ سفر کرتا ہوں۔ ھسفر جو بھی ہو۔"

"آج رات کو۔ ہمارا مہمان بنو۔" اس کے قدرتی سرخ ہونٹوں پر دعوت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں تمہاری دعوت کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔" میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ اس کے سانس میرے چہرے سے ٹکرانے لگے۔ میں اس کی قربت سے جلنے لگا۔ آگ کی طرح تپنے لگا۔ وہ کافی خوبصورت تھی۔ بحیثیت عورت' ان تمام عورتوں پر بھاری تھی جو مجھے مل چکی تھیں۔ پیشہ ور ہونے کے باوجود وہ مشرقی نسوانیت کا پیکر تھی۔ "کیا پیوگی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"یہاں کچھ نہیں۔ اٹھو۔" اس نے میری کلائی پکڑتے ہوئے کہا اور میں اس کے ساتھ اٹھ گیا۔ وہ پلٹ کر ایک دروازے کی طرف چل دی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک چوڑی راہداری تھی جس کے اختتام پر ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک بھاری جسم والا افغانی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں ایک اور افغانی اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں طرف دد پستول لٹکے ہوئے تھے۔ رقاصہ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ دونوں افغانی میری طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

"ایک ہزار افغانی۔" کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے بھاری اور جذبات سے عاری آواز میں کہا اور میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو نوٹ نکالے اور کاؤنٹر پر ڈال دیئے۔ اس نے ایک رسید کاٹ کر میری طرف بڑھادی۔ اور اس رسید پر میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ رقاصہ بدستور میری کلائی پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے جسم سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی جس کے بارے میں میں اندازہ نہ لگا سکا کہ قدرتی تھی یا مصنوعی۔ اس کی چال میں دلکشی تھی۔ راہداری کے دونوں سمت گول دروازے بنے ہوئے تھے۔ عجیب ماحول تھا۔ قدرتی غاروں کو اس شاندار طریقے سے استعمال کیا

گیا تھا کہ عقل حیران تھی۔ میں اس کے ساتھ ایک دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔

اندر بہت سے شمعدان تھے جن میں سے صرف ایک شمعدان میں شمع روشن تھی۔ شمع کی دھندلی روشنی میں' میں کمرے کے ماحول کو ٹھیک سے نہ دیکھ سکا۔ رقاصہ نے داخلی سوراخ کے اوپر لگا ہوا ڈھکن نیچے کھینچ لیا۔ جیسے سب میرین کے ڈھکن ہوتے ہیں۔ گویا دروازہ بند ہوگیا پھر وہ دوسرے شمعدانوں کی طرف بڑھی اور ایک ایک کرکے اس نے تمام شمعیں روشن کردیں۔

"اوہ۔ تم کھڑا کیوں ہے بیٹھو۔" اس نے لوچدار آواز میں کہا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور ایک طرف پڑے ہوئے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ صوفے پر بیٹھ کر میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ دروازہ بند ہوگیا تھا لیکن گھٹن کا ذرہ برابر احساس نہیں تھا۔ کمرہ بہت بڑا نہیں تھا۔ دیواروں کی تراش قدرتی تھی۔ البتہ مناسب جگہوں پر انہیں خوبصورت انداز میں سجادیا گیا تھا۔ نیچے قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ساگوان کی لکڑی کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ ایک صوفہ سیٹ تھا اور چوڑی دو آدمیوں والی مسہری جس کے پائینتی پر ایک خوبصورت رضائی رکھی ہوئی تھی اور سرہانے دو موٹے تکیے رکھے ہوئے تھے۔ مسہری کے برابر لباس ٹانگنے والا اسٹینڈ تھا۔

رقاصہ تمام شمعیں روشن کرکے پلٹی اور میرے نزدیک آگئی۔ اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر میرے پیروں کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اس نے میرے جوتے کے بند کھولنے شروع کردیئے۔ اور میں چونک پڑا۔

"ارے نہیں۔ میں خود اتارلوں گا۔ تم یہاں آؤ بیٹھو۔" میں نے کہا۔ اور اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھالیا۔ وہ میرے برابر آبیٹھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں شراب برسا رہی تھیں۔ میں جھکا اور اس نے گردن اونچی کردی۔ بڑی خودسپردگی تھی اس انداز میں۔ بڑی دلکشی تھی۔ میں نے بے چینی سے اپنے ہونٹ اس کے شیریں لبوں پر رکھ دیئے اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی ہر ادا سے مشرقیت جھلکتی تھی۔ میں مشرق و مغرب کا موازنہ کرنے لگا۔ میرے چوڑے اور مضبوط بازوؤں نے اس کے گرد حصار قائم کردیا اور مجھے اس کے ریشمی جسم کی ملائمت کا احساس ہوا۔

بلاشبہ یہ رات زندگی کی سب سے حسین رات تھی۔ اس زندگی کی جو میں نے اب تک گذاری تھی۔ میں رقاصہ کے لب لعلیں سے شراب چراتا رہا۔ اس کے سانس گہرے ہوتے گئے اور پھر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم مسہری پر تھے۔ وہ اپنے جسم کو میرے سامنے عریاں نہیں رکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے رضائی اوڑھ لی تھی۔ اس کا سر میرے بازو پر رکھا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے آنکھیں بند کئے ہوئے پوچھا۔

"نواز۔" میں نے کہا۔ "اور تمہارا؟"

"درفشانہ۔" اس نے جواب دیا۔

"بہت خوبصورت نام ہے۔ تم یہاں کب سے کام کرتی ہو درفشانہ؟"

"تین سال سے۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"یہیں رہتی ہو؟"

"نہیں۔ شاہ بابا کے پیچھے گل رخ میں رہتا ہے" اس نے جواب دیا۔

"رات یہاں گذارتی ہو؟"

"ہفتے میں ایک دن چھٹی ہوتا ہے۔

"یہ لوگ تمہیں کیا دیتا ہے؟"

"کمیشن سے کام کرتا ہے۔" وہ ہربات صاف گوئی سے اور بلا جھجک بتا رہی تھی۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ اتنی معصوم لڑکی اور یہ پیشہ کرتی ہے۔ نہ جانے کتنے مرد اس کی زندگی میں آئے ہوں گے۔ میں اس سے بہت سے سوالات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ زیادہ کریدنے سے طبیعت مکدر ہوگی' کچھ حاصل نہ ہوگا میری یہ سوچ خالص مشرقی تھی۔ ورنہ یہ سب حماقت کی باتیں تھیں۔ میں نے ایک ہزار افغانی ادا کر کے اسے ایک رات کے لیے خریدا تھا۔ اس رات کی رنگینیوں سے فائدہ اٹھاؤں اور چلا جاؤں۔ باقی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے گھسیٹ کر خود سے قریب کر لیا۔ تاہم ایک سوال میرے ذہن میں کلبلایا اور میں اسے پوچھنے سے باز نہ رہ سکا۔

"ایک بات بتاؤ گی درفشانہ؟" اور اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ "رقص کرتے کرتے تم میرے پاس رکی تھیں اور بعد میں بھی تم میرے ہی پاس آئیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "تم ایک صاف ستھرا آدمی ہے۔ دوسرا لوگ گندا ہوتا ہے اچھا آدمی ملتا۔ ٹھیک ہوتا۔" میرے ذہن میں پھر ایک چھناکا ہوا۔ بلاوجہ یہ سوال کر ڈالا۔ گویا ہر رات اس کے پاس نیا آدمی ہوتا ہے۔ شاید اسے انتخاب کرنے کی آزادی ہوتی ہے اور اگر وہ خود کسی کو منتخب نہ کرے تو پھر کوئی بھی ہو------ کوئی بھی ہو۔ وہ اس سے بھی اسی طرح پیش آتی ہوگی۔

لیکن۔ کیا فرق پڑتا ہے۔

اور دوسری لڑکیاں۔ سب ایک جیسی تھیں۔ سب ایک جیسی تھیں۔ یہ پھر بھی ان سے بہتر ہے۔ میں نے ذہن سے سب کچھ بھلا دیا اور خود کو اس میں جذب کر دیا۔ وہ میری کیفیات سے بے نیاز مجھے بھرپور مدد دے رہی تھی۔ ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات' اس سے قبل کہ مجھے اس سے متنفر کر دیں' میں اس کے جسمانی زاویوں سے لطف اندوز ہو لینا چاہتا تھا۔ میں پنجابی جوان تھا۔ شیروں کا شیر۔ میں نے اس کا انگ انگ توڑ کر رکھ دیا۔ اس کی لذت آمیز سسکاریاں کراہوں میں بدل گئیں۔ گندا آدمی گندا ضرور ہوتا ہے مگر اتنا بیدرد نہیں ہوتا۔ لیکن کون جانے یہ بیدردی ہی اسے پسند آئی ہو۔

چند منٹ کے بعد نڈھال سانسوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ شمعدانوں میں دھندلاہٹیں پھیل گئیں۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ سماعت جاگ رہی تھی۔ وطن سے دور۔ دیار غیر میں۔ میں کس طرح بے یار و مددگار پڑا تھا۔ جہلم کی سوندھی خوشبوئیں میری ناک میں بسی ہوئی تھیں۔ سرائے عالمگیر کے چنے کے کھیت' ان میں دوڑتے ہوئے معصوم بچے۔ بیلوں کے گلے میں بندھی

ہوئی پیتل کی گھنٹیاں۔ نہ جانے کیا کیا۔ بہت سے سحر میری نگاہوں میں سمائے ہوئے تھے۔ بند پپوٹوں میں رقصاں تھے۔ کہ اس نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں چونک پڑا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

کتنا سکون تھا اس کے چہرے پر۔ کیسا اطمینان تھا۔ حالانکہ صرف لمحات کی شناسائی تھی۔ انسان کس طرح ایک دوسرے کو اپنا لیتے ہیں۔ کیسے خود کو مطمئن کر لیتے ہیں۔

اوہنہ دماغ خراب ہے۔ پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ جذباتیت جب تک دفن نہیں کر دوں گا کام کا آدمی نہیں بن سکوں گا۔ بیکار لغو باتیں سوچنے لگتا ہوں۔ ہر انسان ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے۔ اس جاندار کی خاصیت ہی یہ ہے ملتا ہے۔ بچھڑ جاتا ہے۔ بھول جاتا ہے۔ صورت تک یاد نہیں رکھتا۔ درفشانہ جاگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اس کے چہرے سے جذبات امنڈ رہے تھے۔ اس کا ہاتھ میرے چوڑے سینے پر متحرک تھا۔ وہ میرے جذبات کو بیدار کر رہی تھی۔ شاید اسے اس کی پسند مل گئی تھی۔ شاید وہ مجھ سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔ یا پھر وہ ایک ایماندار دوکاندار تھی' بھرپور قیمت وصول کرتی۔ بھرپور مال سپلائی کرتی۔ اس کا نازک ہاتھ سینے کی چوڑائی سے کچھ پیچھے کھسکا۔ اور پھر کھسکتا ہی رہا۔ میں بھی سب کچھ بھول گیا اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"درفشانہ" میں نے اسے آواز دی۔ اور اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ آنکھوں میں تھوڑی سی درز پیدا کر کے مجھے دیکھا۔ سلگتی ہوئی آنکھوں کی چمک میں' دانتوں میں دبے ہوئے ہونٹ میں۔ ایک انوکھی پکار تھی۔ انوکھی چاہت تھی۔ میں اسے مایوس نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کی طلب کا پورا پورا احترام کیا اور ایک بار پھر اس کے چہرے پر پھول کھل گئے۔ اس کی آنکھوں میں سرور نظر آنے لگا۔

"نواز۔" اس نے لرزتی آواز میں مجھے پکارا۔

"ہوں۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا۔

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔" وہ عجیب انداز میں بولی۔

"اوہ۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "والدین بھی نہیں۔"

"تھے لیکن اب نہیں ہیں۔ وہ مجھے فروخت کر کے کہیں چلے گئے۔ کہاں' مجھے معلوم نہیں۔"

"تین سال پہلے۔"

"نہیں۔ پندرہ سال پہلے۔ جس نے مجھے پالا وہ موجود ہے۔ اسی نے مجھے ہربنس کے ہاں نوکر کرایا ہے۔ وہ اپنی دی ہوئی قیمت منافع کے ساتھ وصول کر رہا ہے۔" وہ جذباتی انداز میں بولی" وصول کرتا رہے گا۔ اس وقت تک جب تک میں بوڑھی نہ ہو جاؤں۔ مر نہ جاؤں۔" آخر میں اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ میں سوچ میں گم ہو گیا۔ درد بھری کہانی ہے۔ لیکن کس کی کہانی میں درد نہیں ہے۔ دنیا ہی درد کی دنیا ہے۔ خود میں میں بھی کیا ہوں۔ لیکن یہ بے کسی۔ بے بسی مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں کیوں بتایا ہے۔

"نواز۔" اس نے مجھے پکارا اور میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ کیا میں صرف لٹوؤں کا دل بہلانے کے لیے پیدا ہوئی ہوں۔ کیا ہر قسم کے لوگوں کے لیے میں صرف عورت ہوں۔ کیا کبھی کوئی مجھے سہارا دینے کے بارے میں نہیں سوچے گا۔ کیا کوئی مجھے نہیں اپنائے گا۔"

اس کے سوال ہتھوڑوں کی طرح میرے ذہن پر پڑ رہے تھے۔ میں ایک بے بس انسان تھا۔ اس قدر بے بس کہ خودکشی کرنے پہنچ گیا تھا۔ لیکن پھر میری بے بسی کو ایک راستہ مل گیا۔ بے بسی کا دور ختم ہو گیا کیا یہ لڑکی کوئی راستہ تلاش کر سکے گی؟ یا پھر۔ اس بے بسی کی زندگی گزارتی رہے گی۔ ضمیر کے خلاف مجبوریوں کے بوجھ تلے۔ یا پھر یہ بھی خودکشی کی کوشش کرے گی۔ شاید کامیاب بھی ہو جائے۔ سب کے ساتھ تو ایسے اتفاقات پیش نہیں آتے۔ جیسے میرے ساتھ آئے تھے۔ پھر یہ جینے کی آرزو مند۔ ایک لڑکی ایک کمزور عورت' زندگی سے مایوس ہو کر موت اپنا لے گی۔ میں خود بھی کونسا زندہ ہوں۔ میں نے موت سے ہمیشہ پنجہ کشی کی ہے۔ آج تک اپنے لیے کی۔ اب اس کے لیے کیوں نہ کروں۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک جذباتی فیصلہ ہے۔ قدم قدم پر ہزاروں افسانے بکھرے ہوئے ہیں۔ کوئی سہارا دینے والا نہیں ہے۔ میں اسے کیا سہارا دوں۔ اور پھر۔ لیکن اسے اس جہنم سے نکالنے کی کوشش' کیا دلچسپ نہ ہوگی۔ کیا زندگی میں ایک خوش گوار ہنگامہ نہ پیدا ہو جائے گا۔ اور کیا مجھ جیسے انسان پر طاری جمود نہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر کیوں۔ نہ یہ تفریح کی جائے کیوں نہ زندگی کو اس نئے موڑ پر ڈالا جائے۔ کیوں نہ سانسوں کا احساس کیا جائے۔ کیوں نہ رگوں میں منجمد خون کو گردش دی جائے۔ کم از کم کوئی نیا پن ہوگا۔ کچھ دلچسپیاں ہاتھ آئیں گی۔

"تم سہارا چاہتی ہو درفشانہ؟"

"ہاں نواز۔ مجھے یہ زندگی پسند نہیں ہے۔ میں اسے چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم مجھے زندگی بھر کے لیے سہارا دو۔ میں تمہارے اوپر بوجھ نہیں بنوں گی بس مجھے یہاں سے نکال لے چلو۔ کہیں اور پہنچا دو۔"

"چلو۔" میں اٹھ گیا۔ اور وہ بھونچکی رہ گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح میری شکل دیکھنے لگی۔ اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے قریب کے اسٹینڈ سے اپنا لباس کھینچا اور اسے پہننے لگا۔ تب وہ بھی اٹھ گئی۔ اس نے اپنا لباس پہن لیا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مجھے دیکھنے لگی۔

"کیوں۔ کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے اسے دیکھا۔

"نواز۔ سچ مچ تم مجھے ادھر سے لے جائے گا؟"

"ہاں۔ ہاں چلو۔ یہاں سے نکل چلو۔ ہم کہاں جائیں گے۔ یہ ہم بعد میں سوچیں گے۔"

"چلو نواز۔" اس نے لرزتے ہاتھوں سے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ اور پھر ہم دونوں دروازے سے نکل آئے میرے جیسا جنونی بھی کوئی اس سے نہیں ٹکرایا ہوگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی اتنی جلد اتنے بڑے کام کو انجام دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ حالانکہ ہم انتظار بھی کر سکتے تھے۔ ہفتے میں ایک بار چھٹی ہوتی تھی۔ وہ اپنے گھر جاتی تھی۔ وہ دن بھی کار آمد ہوتا۔ لیکن اتنا انتظار کون

کرتا۔ میں تو زندگی کی یہ تبدیلی اپنانے پر تل گیا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اس اقدام سے میرے گروہ کے لوگوں کے پروگرام پر کیا اثر پڑے گا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ فکر کس بات کی۔ میں ہال کے دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"ادھر سے نہیں! اس طرف سے آؤ۔" وہ ایک دوسری سرنگ کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ اور میں اس طرف چل پڑا۔ ظاہر ہے وہ یہاں کے راستوں سے بخوبی واقف تھی۔ ہم دونوں باہر نکل آئے۔ اب سر پر کھلا آسمان تھا اور پہاڑوں میں رات بکھری ہوئی تھی۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ شہر کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ کتنی دور ہے۔ کسی سواری کا سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن درفشانہ بھی میری طرح بے جگر تھی۔ اور یہاں سے نکل جانے کے لیے اتنی ہی بے چین تھی۔ بس اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ شاید اپنے پسندیدہ سہارے کی۔ جو بہر حال اسے آج مل گیا تھا۔

"آؤ۔" درفشانہ نے ایک سمت اختیار کرتے ہوئے کہا اور میں بے فکری سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ ہم صرف ایک دوسرے کے وجود کو محسوس کر سکتے تھے۔ دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن ہم چل رہے تھے۔ میرے دل میں خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ درفشانہ کے دل کا حال مجھے معلوم نہیں تھا۔ تاہم میں نے اس سے پوچھا۔

"تاریکی بہت گہری ہے درفشانہ۔ کیا تم ان راستوں سے بخوبی واقف ہو؟"

"ہاں۔ اس نے مختصراً کہا۔

"یہاں درندے تو نہیں ہیں؟"

"پہلے ہوتے تھے۔ لیکن اب اس علاقے کو صاف کر لیا گیا ہے۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ راستے میں خوفناک گڑھے بھی نہیں ہیں۔ آتے ہوئے تو نہیں محسوس ہوا تھا۔"

"ہربنس نے اس پورے علاقے کو قابل استعمال بنا لیا ہے۔" میرا ہاتھ پکڑنے کے بعد اسے بھی سہارا مل گیا تھا۔

"ہم کس طرف جا رہے ہیں؟"

"ان چڑھائیوں کو عبور کرنے کے بعد القمر کی روشنیاں نظر آجائیں گی یہ سفر آسان ہوگا۔ القمر پر ہمیں ٹیکسیاں مل جائیں گی۔ کوئی بھی ڈرائیور ہمیں معقول رقم کے عوض قندھار لے جانے پر تیار ہو جائے گا۔ قندھار پہنچ کر آگے جانے کے بارے میں سوچیں گے۔"

"کیا یہ ٹیکسیاں رات میں بھی سفر کرتی ہیں؟"

"رقم کے عوض سب کچھ ہوتا ہے۔ اور پھر یہ ------ خطرناک لوگوں کا علاقہ ہے۔ یہاں یہ غیر قانونی کام بہت رازداری سے ہوتا ہے۔" درفشانہ نے بتایا۔

میری معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ معصوم سی لڑکی اس قدر بے وقوف بھی نہیں تھی۔ ظاہر ہے ان خطرناک لوگوں کے ساتھ زندگی گذار رہی تھی۔ بہرحال اس کی معیت دلکش تھی۔ ہم

ہوئی تھیں۔ ایک دلچسپ چیز جو نظر آئی وہ مقامی لباس تھے۔ انہیں دیکھ کر فوراً میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اسے عملی شکل دے دی۔ تھرماس' سگریٹ وغیرہ کے ساتھ میں نے مقامی لباس بھی خریدے۔ چند جوڑے درفشانہ کے لیے اور دو تین اپنے لیے۔ یہ چیزیں ایک چمڑے کے سوٹ کیس میں رکھوا کر میں نے سب کی قیمت ادا کردی۔ اس کے باوجود میرے پاس کافی کرنسی موجود تھی۔ درفشانہ سحر کے عالم میں سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے میرے اس قدر "تگڑی آسامی" ہونے کی توقع نہیں تھیں پیک کیا ہوا سامان آگیا اور اسے لے کر ہم اپنے کمرے میں واپس آگئے۔ میں نے درفشانہ کو بھی نیا لباس پہننے کی پیشکش کی اور اس نے سحر کے عالم میں نیا لباس پہن لیا۔ ترکی طرز کا یہ لباس موزوں بدن درفشانہ پر خوب بچ رہا تھا۔ جب اس نے آئینے میں خود کو دیکھا' تو اس کے چہرے پر دھنک بکھر گئی۔ قوس و قزح کے یہ رنگ مجھے بہت بھلے معلوم ہوئے اور میں نے سوچا کہ میری قیمت وصول ہوگئی۔ درفشانہ گھریلو عورت کی طرح شرماتی ہوئی میرے سامنے آئی۔ اس کی نگاہوں میں داد کی طلب تھی اور میں نے گرمجوش بوسے سے وہ طلب پوری کردی۔ پھر میں نے مقامی لوگوں کا لباس پہنا۔ لمبی پگڑی کا ایک سرا لٹکانے کے بعد میں نے خود کو آئینے میں دیکھا اور خود میرے چہرے پر حیرت امنڈ آئی میں سوفیصد مقامی معلوم ہو رہا تھا۔ بس میری ہپی طرز کی داڑھی ان لوگوں سے مختلف تھی۔ بہرحال میں نے فیصلہ کیا کہ کم از کم افغانستان میں یہی حلیہ اختیار کیے رہوں گا۔

درفشانہ نے بھی پسندیدگی کی نگاہوں سے مجھے دیکھا "عجیب انسان ہو تم۔ جب تم ہپی بنے ہوئے تھے تو میں نے تمہیں سفید فام غیر ملکی سمجھا تھا اور اگر اب میں تمہیں پہلی بار اس لباس میں دیکھتی تو افغان ہی سمجھتی۔ تمہارے چہرے اور جسم میں ہر چیز چھپ جاتی ہے۔"

"چلیں۔" میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔ صبح سے پہلے ہمیں یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔" درفشانہ نے اپنا شٹل کاک ٹائپ کا برقعہ اوڑھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس برقعے پر اعتراض نہیں تھا۔ کیونکہ درحقیقت یہ درفشانہ کو چھپانے میں بڑا معاون تھا۔ ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے رات کے پونے چار بجے تھے۔ ہوٹل کے باہر کچھ ٹیکسیاں کھڑی تھیں جن کے ڈرائیور اگلی سیٹوں پر دراز اونگھ رہے تھے۔

"ان لوگوں سے افغانی زبان میں بات چیت تم کروگی۔ میں تو گونگا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" درفشانہ نے جواب دیا۔ پھر اس نے خود ہی آگے بڑھ کر ٹیکسی ڈرائیور کا پاؤں ہلایا۔ ڈرائیور آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ درفشانہ مقامی زبان میں اس سے گفتگو کرتی رہی جس کے کچھ الفاظ میری سمجھ میں آرہے تھے۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد ڈرائیور تیار ہوگیا۔ اس نے ٹیکسی کی ڈکی میں ہمارا سامان رکھا۔ پٹرول وغیرہ چیک کیا۔ اپنا پستول نکال کر اس کے چیمبر بھرے اور اسے نیفے میں اڑس لیا۔ پھر اپنی پگڑی کھول کر کسی اور اس کے بعد وہ اسٹیرنگ پر آبیٹھا۔ اس دوران ہم اندرونی سیٹ پر آگئے تھے۔ تب ٹیکسی اسٹارٹ ہوکر چل پڑی۔ درفشانہ کا چہرہ اب بھی ڈھکا ہوا تھا۔ اور ہم بظاہر کسی باعزت گھرانے کے چشم و چراغ معلوم ہو رہے تھے۔ راستے میں کسی نے کوئی گفتگو نہ کی۔ البتہ درفشانہ کے جسم کا بوجھ زیادہ سے زیادہ میرے اوپر آپڑا تھا۔ شاید وہ سوگئی تھی۔ لیکن میں

پشاور میں اسٹورز ہیں جو بظاہر دوسرا کام کرتے ہیں لیکن ان کا اصل کام یہی ہے جسے وہاں کے مقامی لوگوں نے سنبھالا ہوا ہے۔"

"خوب۔" میں نے دل ہی دل میں یہ نام نوٹ کرلیے۔ اگر ان معلومات کے عوض یہ لڑکی خود زیار خان سے مدد کی درخواست کرتی تو زیار خان پوری قوت سے اس کی مدد کرتا۔ لیکن خوشی کی بات تھی کہ یہ معلومات میرے ذریعہ ان لوگوں تک پہنچیں گی جس سے انہیں اندازہ ہوگا کہ میں بخوبی کام کر رہا ہوں۔

"تمہاری معلومات تو بہت کافی ہیں درفشانہ۔ کیا یہ لوگ اپنا کاروبار خفیہ نہیں رکھتے۔"

"میرے علاوہ صرف چند لوگوں کو ہی یہ معلومات ہوں گی۔ ہربنس کا بیٹا جوگندر سنگھ کبھی کبھی میرے پاس آتا تھا۔ وہی اپنے کاروبار کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔" درفشانہ نے جواب دیا۔

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ کیا کابل سے باہر بھی ان کا کاروبار پھیلا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ صرف کابل میں۔ ہربنس سنگھ بہت چالاک ہے۔ اس نے ابھی باہر ہاتھ پاؤں نہیں مارے۔ وہ پہلے کابل میں اپنا کاروبار مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے مقابلے پر نہ آسکے۔ حکومت کے بااثر لوگ اس کے پشت پناہ ہیں۔ جب وہ یہاں سے اطمینان کرلے گا تب باہر کا کام کرے گا۔"

ہم گفتگو کرتے چلے جارہے تھے۔ القمر کی عمارت اب سامنے ہی نظر آرہی تھی۔ درفشانہ نے اپنے ساتھ لایا ہوا برقعہ سر پر ڈال لیا اور عجیب و غریب نظر آنے لگی۔ اس برقعہ میں کسی کو ساتھ لے کر چلنا بہت عجیب تھا لیکن یہاں معیوب نہیں تھا۔ اکثر اعلیٰ درجے کی کاروں سے میں نے اسی ٹائپ کی عورتوں کو اترتے دیکھا تھا' جن کی پنڈلیاں بہرحال عریاں ہوتی تھیں۔ لیکن اوپر سے وہ برقعے میں ملبوس ہوتی تھیں۔ چنانچہ جب ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تو کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ کاؤنٹر پر موجود جدید افغان نے ہمیں دیکھ کر رجسٹر کھول دیا اور ہم نے "عارضی قیام" کے لیے کمرہ حاصل کرلیا۔ شاید یہاں "عارضی قیام" کے لیے لوگ آتے رہتے تھے۔ یہ قیام پوری رات' آدھی رات اور بعض اوقات ایک آدھ گھنٹہ کا ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم سے پوچھ لیا گیا اور ہم نے صرف دو گھنٹہ کے لیے کمرہ حاصل کرلیا۔

نہایت خوبصورت کمرہ تھا۔ دن رات کام ہوتا تھا۔ اس لیے ہر چیز مل گئی۔ میں نے بیرے کو بلا کر دو بھنے ہوئے مرغ اور بٹر سلائس پیک کرنے کا آرڈر دے دیا اور پھر تھرماس کے بارے میں پوچھا۔

"نیچے اسٹور ہے صاحب ہر چیز ملتا ہے۔" بیرے نے ہم دونوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ایک ہپی اور ایک شٹل کاک' بہرحال حلیے اور شکل سے میں غیر ملکی ہی معلوم ہوتا تھا۔

"اوہ۔ میں نے اسٹور کے بارے میں سن کر دلچسپی سے کہا۔ اور پھر کمرے سے نکل کر اسٹور میں آگئے۔ اسٹور دیکھ کر آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ خود کابل شہر میں اتنی اعلیٰ دوکان نہیں تھی۔ شاید اس علاقے میں حکومت کابل کا کوئی قانون لاگو نہیں تھا۔ تمام مال غیر ملکی تھا۔ دنیا جہاں کی چیزیں بھری

ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ بلندی کا آخری سرا تک ختم ہو گیا۔ اتنی چڑھائی پر چڑھتے ہوئے سانس میں تیزی آگئی تھی۔ درفشانہ تو باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔

"تم تھک گئیں شاید؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ پوری زندگی سوچنے کے بعد پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اگر اتنے سے فاصلے پر تھک گئی تو پھر یہ طویل سفر کیسے طے کروں گی۔ مگر سنو تمہارے پاس کوئی قیمتی چیز ہے؟"

"مثلاً۔" میں تعجب سے پوچھا۔

"کوکین، ہیروئن یا انجکشن جسے تم فروخت کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ کیوں؟"

"ایسے ہی پوچھا۔ ہمیں رقم کی ضرورت ہوگی۔ اکثر سیاح قیمتی چیزیں ساتھ رکھتے ہیں اور بوقت ضرورت انہیں کیش کرا لیتے ہیں۔ کیا تمہارے پاس بڑی رقم موجود ہے؟"

"ہاں۔ کافی رقم ہے' میں نے جواب دیا اور دور سے ہوٹل القمر کی روشنیاں دیکھنے لگا۔ جواب ایک ٹیلے کے پیچھے سے نکل آنے کے بعد صاف نظر آرہی تھیں۔ اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ پھر میں نے پوچھا۔ "کیا ہربنس کے اس ساقی خانے میں بھی ایسی اشیاء خریدی جاتی ہیں؟"

"ہاں شارع حشیش پر تو منشیات ٹریولر چیک ہوتی ہیں۔ چیک کیش کرانے میں وقت بھی لگتا ہے لیکن اگر تمہارے پاس کوئی عمدہ چیز ہے تو فوراً مناسب رقم مل جاتی ہے۔ یہاں صرف فروخت ہی نہیں خرید بھی کی جاتی ہے۔ یہ جتنے لوگ ہال میں موجود تھے۔ سب مالدار لوگ تھے۔ ہربنس کے ساقی خانے میں نایاب چیزوں کا ذخیرہ انہی سیاحوں کے دم سے ہے۔ ہربنس مال کے حساب سے دیانت داری سے قیمت ادا کرتا ہے۔"

"واہ۔" میں نے دلچسپی سے کہا۔ "ہربنس باقی مال کہاں سے خریدتا ہے۔"

"کچا مال کابل کے نواحی علاقوں میں کاشت ہوتا ہے۔ ہربنس پوری کھیپ خرید لیتا ہے۔ بہت سے کاشتکار صرف اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان میں بیشتر اس سے خوش نہیں ہیں۔ لیکن ہربنس کی ٹکر پر دوسرے لوگ موجود نہیں ہیں۔ صرف فوجی خان کا چھوٹا سا اڈہ ہے مگر وہ نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے کاشتکار ہربنس سے بگاڑ بھی نہیں کرتے۔ ہاں اگر کوئی دوسرا سامنے آئے تو ہربنس کو کوئی مال نہ دے۔"

غیر متوقع طور پر یہ قیمتی معلومات حاصل ہوگئی تھیں میرے خیال میں یہ میرے کام کی بات تھی۔ غلام سیٹھ تک یہ رپورٹ ضرور پہنچنی چاہیے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ قندھار پہنچ کر یہ رپورٹ زیار خان کو بذریعہ ڈاک دے دوں گا۔ اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لیے میں نے پوچھا۔

"باقی مال کہاں سے لیتا ہے۔"

"اس کے بہت سے ساتھی کام کرتے ہیں۔ خود تمہارے ہاں سے مال آتا ہے۔ پشاور سے کراچی سے۔ پشاور میں اس کے آدمی موجود ہیں۔ گرین چیک اسٹور کے نام سے اس کے کراچی اور

جاگ رہا تھا۔ مجھے ڈرائیور کا پستول یاد تھا۔ اس کے چوڑے شانے میں عقب سے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ کھلے علاقے میں آنے کے بعد سردی زیادہ محسوس ہونے لگی۔ لیکن بدقسمتی سے ہم نے اس کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے بند کر دیئے گئے تھے لیکن اس کے باوجود سرد ہوا جہاں سے بھی داخل ہو سکتی' داخل ہو رہی تھی۔ ایسے میں درفشانہ کے جسم کی گرمی مجھے بری نہیں لگ رہی تھی اور میں اسے زیادہ سے زیادہ خود میں جذب کرنے میں کوشاں تھا۔ کابل کے نواحی علاقے پیچھے رہ گئے تھے۔ دائیں طرف کوہ بابا کی برف نے وادی پر سفیدی بکھیر دی تھی۔ ڈرائیور خاموشی سے ٹیکسی چلا رہا تھا اور اب ہم سرو کے درختوں کے جھنڈ میں چل رہے تھے۔ رفتار کافی تیز تھی۔ سفر کا کوئی خاص احساس نہیں ہو رہا تھا۔

اس وقت روشنی کی پہلی کرن ہی نیچے آئی تھی کہ ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار کم کرنا شروع کر دی۔ ہم غزنی پہنچ گئے تھے۔ غزنی سلطان محمود کی شان کا مظہر۔ فاتح سومنات کی بستی جسے تاریخ عالم کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ دور سے پٹرومیکس کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ شاید کوئی چائے خانہ تھا۔ میں نے درفشانہ کے شانے کو تھپتھپایا لیکن وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ پھر جب ڈرائیور نے ٹیکسی روشنیوں سے تھوڑی دور روک دی تو میں نے پوری کوشش کر کے درفشانہ کو جگا دیا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹا کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر جب اسے ماحول یاد آگیا تو وہ جلدی سے چونک کر سنبھل گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ لیکن میں نے بیساختگی میں بھی زبان خاموش رکھی۔ اور باہر اشارہ کر دیا۔

"چائے بھیجے صاحب؟" ڈرائیور نے پوچھا اور درفشانہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

"نیند پوری ہو گئی؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔ بھیانک خواب دیکھتے ہوئے۔" اس نے جواب دیا۔

"خواب کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ویسے تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے درفشانہ؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔ لیکن اس سوال پر وہ اداس ہو گئی۔ چند منٹ خاموش رہی۔ پھر بولی۔

"ابھی کچھ نہیں۔ اس وقت تک تمہارے ساتھ رہوں گی جب تک تم پسند کرو گے۔ جب تم چھوڑ دو گے تب کچھ اور سوچوں گی۔" اس کے لہجے کی اداسی نے مجھے متاثر کیا۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے زندگی بھر ساتھ رکھنے کا اعلان کر دوں۔ لیکن پھر عقل نے ٹھوکا دیا۔ ایک انہونی بات کہہ کر کسی کو بہلاوے میں رکھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ چنانچہ خاموشی ہی بہتر تھی۔ بار والا چائے کے دو گلاس لے کر ٹیکسی کے قریب پہنچ گیا۔ گرم گرم قہوے نے سفر کی تھکن دور کر دی۔ دو اور گلاس طلب کئے اور انہیں پینے کے بعد میں نے ڈرائیور کے قہوے کا بل بھی ادا کر دیا۔ ڈرائیور مسکراتا ہوا اپنی گھیردار شلوار سمیٹتا پھر ٹیکسی میں آبیٹھا' ٹیکسی چل پڑی۔

اب صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ مناظر اجاگر ہو رہے تھے۔ لیکن زیادہ دلخوش کن مناظر نہیں تھے۔ موسم بھی ایک دم بدل گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے غزنی اچھے اور خوش گوار موسم

کی سرحد ہو۔ بنجر اور چٹیل پہاڑوں کا اکتا دینے والا سلسلہ تاحد نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں خانہ بدوشوں کے خیمے اور جانور نظر آجاتے تھے۔ ورنہ ویرانی اور سناٹا۔ ہم نے کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ لیکن ہوا گرم اور ریت میں لپٹی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں بند کرتے تو گرمی لگتی اور کھولتے تو گرم ہوا کے ساتھ ریت بھی اندر آنے لگتی۔

خاصا تکلیف دہ سفر تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے ڈرائیور نے "جاندو" میں ٹیکسی روکی کچی مٹی کی دوکانیں اور قہوے خانے بکھرے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے کہا کہ یہاں سے کھانے کا بندوست کرلیا جائے۔ آگے کا فاصلہ طویل ہے۔ لیکن ہمارے پاس کھانے کا انتظام تھا۔ اس لیے درفشانہ نے منع کردیا۔ خود ڈرائیور اپنے لیے موٹی موٹی روٹیاں اور بھنا ہوا گوشت خرید لایا۔ اور اس نے ٹیکسی جلدی سے آگے بڑھادی۔ شاید وہ بھی اب اس طویل سفر کو ختم کردینے کی فکر میں تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان پھیلی ہوئی سڑک پر ٹیکسی خاصی تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ ہوا مزید گرم اور تیز ہوگئی تھی۔ اس لیے کھڑکیاں بند کردینی پڑیں' اسی میں عافیت تھی میں ان میدانوں کو دیکھ رہا تھا جہاں کبھی چنگیز خان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین دہلی تھی۔ چنگیز خان انہی راستوں سے گزر کر خراسان پر حملہ آور ہوا تھا۔

دن کو پونے گیارہ بجے ٹیکسی قندھار میں داخل ہوگئی۔ درفشانہ نے اسے قندھار ہوٹل چلنے کے لیے کہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم قندھار ہوٹل کے سامنے رک گئے۔ ٹیکسی سے اترے۔ بل ادا کیا اور ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ بے حد مہنگا ہوٹل تھا۔ لیکن بہرحال تکلیف دہ نہیں تھا۔ باقی اور دوسری سہولتوں کا معقول بندوبست تھا۔ پہلے میں نے غسل کیا اور پھر درفشانہ نے۔ نیند آرہی تھی۔ اگر سو جاتے تو دوپہر کا کھانا نہ جانے کس وقت کھانا پڑتا۔ نہاتے دھوتے ہوئے بارہ بج گئے۔ اور بارہ بجے ہم دسترخوان بچھا کر بیٹھ گئے۔ کھانا وغیرہ کھا کر کافی پی جو تھرماس میں ساتھ لائی گئی تھی۔ اور پھر ہم نے ایک دوسرے سے لپٹ کر بوسے دیئے اور اپنے اپنے بستر پر جا لیٹے۔ نیند نے کسی اور جذبے کو نہیں ابھرنے دیا تھا۔ لیٹتے ہی بے خبر ہوگئے اور پھر شام کو چھ بجے آنکھ کھل سکی۔ طبیعت پر گرانی تھی۔ جاگ جانے کے باوجود اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر درفشانہ کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے آنکھیں ملتے ہی اس نے نگاہیں جھکالیں۔ لیکن ایک نظر بہت سے افسانے کہہ گئی۔ میں احمق نہیں تھا۔ میں نے ان افسانوں کو پڑھا اور میرے ذہن میں ہلچل مچ گئی۔

سرائے عالمگیر کا حساس دل نوجوان جاگ اٹھا۔ بے سہارا لڑکی کو میری مدد کی ضرورت ہے۔ بھری دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ وہ بے سہارا ہے ان آنکھوں میں سہارے کی طلب ہے۔ کیا اس طلب کو سنگدلی سے ٹھکرا دیا جائے۔ کیا اسے اپنالیا جائے۔ ہمیشہ کے لیے۔ وہ کہاں جائے گی۔ کس طرح زندگی گزارے گی؟ ذہن میں شدید طوفان اٹھا۔ لاوا ابلتا رہا۔ خود مجھے کس نے سہارا دیا تھا۔ پوری دنیا نے میری طرف سے نگاہیں پھیرلی تھیں۔ وہ عورت ہے۔ اس کے پاس اس کے حسین جسم کا سہارا ہے۔ میں تو بے جان پتھر تھا۔ میری زندگی موت سے کسے دلچسپی تھی۔ پھر میں اس دنیا پر

ہوں رحم کھاؤں۔ درفشانہ نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اسے ہربنس کے چنگل سے نکال یہی کیا کم ہے کہ میں نے اس کی یہ خواہش پوری کردی۔ زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا۔ اب تو سوداگر ہوں۔ میں نے اس پر خرچ کیا۔ اس کے عوض مجھے اس کا جسم ملا۔ اس سے ہٹ کر بھی نے کافی خرچ کیا جس کے بدلے میں مجھے قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ یقیناً یہ معلومات ان لوں کے معیار پر پوری اتریں گی جو مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں۔ میں انہیں ان کے اعتماد کا صحیح بدل سکوں گا۔ اور پھر بذات خود میری حیثیت ہی کیا ہے۔ ایک بیکار اور فضول سا انسان' جو صرف ان لوں کی وجہ سے عیش کر رہا ہے اگر ان سے رابطہ ٹوٹ جائے تو پھر جہنم ہی جہنم۔

نہیں۔ نہیں۔ میں یہ جہنم نہیں اپناؤں گا۔ میں دوبارہ اس جہنم میں جانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ درفشانہ اپنے راستے خود تلاش کرے۔ میرا اس کا وقتی ساتھ ہے۔ اس کے بعد میں کچھ نہ کرسکوں گا۔ میں نے دل سخت کرلیا۔

"جاگ گئے؟" بالآخر درفشانہ نے اس طویل خاموشی کو توڑا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا پروگرام ہے؟"

"اٹھو۔ کافی بابا کے ہاں پئیں گے۔" میں نے کہا اور وہ اٹھ گئی۔ چند منٹ مسہری پر پاؤں لٹکائے بیٹھی مجھے دیکھتی رہی۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر باتھ روم کی طرف چل دی۔ چند منٹ کے بعد وہ نکھر کر باہر نکل آئی۔ تب میں باتھ روم میں چلا گیا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

درفشانہ خاموش تھی۔ میں بھی خاموش تھا۔ وہ شاید سوچ رہی تھی کہ کس طرح میرا دل موہ لے۔ تاکہ میں اس سے خود کو جدا کرنے کے معاملے میں بے بس ہو جاؤں۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو۔ میں اس کی محبت اور اس کی اداؤں کو ذہن پر سوار نہیں ہونے دوں گا۔ میں جس قدر جلد ہوسکے گا اس سے چھٹکارا حاصل کرلوں گا۔

"کہیں چلو گے؟" تھوڑی دیر کے بعد پھر درفشانہ نے پوچھا۔

"کل۔ آج آرام کریں گے۔ کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور کرسی کی پشت سے ٹک گئی۔ "تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

"اپنے بارے میں کیا بتاؤں درفشانہ بس ایک سیاح ہوں۔ گھربار چھوڑ کر نکل آیا ہوں۔ دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اس شوق کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔" میں نے کسی قدر خشک انداز میں کہا۔ اس نے میرے انداز کی خشکی کو محسوس کرلیا۔ لیکن اس کے چہرے پر کوئی شکن نمودار نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

"رکاوٹیں تو قدم قدم پر تمہارا راستہ روکیں گی۔ بس ذرا سخت دلی کی ضرورت ہے۔ انہیں ٹھکرانے کا گر سیکھ لو۔ کامیابی سے آگے بڑھتے رہو گے۔" اس کے لہجے میں چھپے ہوئے کرب کو بالآخر

میں نے محسوس کرلیا۔ لیکن میں اس کرب کی طرف توجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آپ مجھے بالکل بے ضمیر انسان نہ سمجھیں۔ بلکہ میرے حالات پر نگاہ دوڑائیں۔ ان حالات میں خود میری اپنی حیثیت تھی کہ میں کسی دوسرے کو سہارا دینے کے بارے میں غور کرتا۔ اور ظاہر ہے اپنی زندگی کے یہ حالات میں ہر کس و ناکس کو بتانے بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس گفتگو کے بعد وہ بھی خاموش ہوگئی۔

رات ہوگئی۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم بستروں پر آگئے۔ میں دوسرے دن کا پروگرام بنا چکا تھا۔ دوسرے دن مجھے یہی کرنا تھا کہ مفصل رپورٹ بنا کر زبیر خان کو بھیج دوں۔ تاکہ اس کے توسط سے وہ غلام سیٹھ کو پہنچ جائے اور غلام سیٹھ یہ جان لے کہ میں اس کی مرضی کے مطابق کام کر رہا ہوں۔

درفشانہ باتھ روم میں گئی۔ اس نے ایک قیمتی لباس پہنا۔ خاص انداز میں بال گوندھے اور پھر باتھ روم سے نکل آئی۔ اس کا چہرہ روشن تھا۔ آنکھوں میں مستیاں امنڈ رہی تھیں۔ اچانک ذہن بھٹک گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک مجبور عورت ہے بے سہارا ہے۔ اپنی زندگی میں صرف اپنے جسم کو سہارا سمجھتی ہے۔ مجھے کسی اور طرح تیار نہیں کر سکی تو اپنے جسم کا سہارا لے رہی ہے۔ کیا میں اس کی مجبوریاں خرید لوں۔ وہ میرے نزدیک آکر بیٹھ گئی اور اس نے میرے چہرے پر کشمکش کے آثار دیکھ لیے۔ تب اس نے میری پنڈلیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے بارے میں فکر مت کرو نواز۔ تمہاری یہی مہربانی ہے کہ تم مجھے ہربنس کے جہنم سے نکال لائے۔ میں اپنے لیے کوئی راستہ تلاش کرلوں گی۔ کل میں تم سے رخصت ہو جاؤں گی۔ میں آج کی رات تمہارے احسان کا بدلہ اتاروں گی۔"

"میں کوئی بدلہ نہیں چاہتا درفشانہ۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا اور نہ کروں گا۔ بس ہم دو اجنبی ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی۔ زندگی کے سفر میں چند لمحاتی ملاقات رہی۔ اور بس۔ ذہنوں کو الجھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"ہم اجنبی نہیں ہیں نواز۔ تم میرے جسم کے رازدار ہو۔ ہم نے ایک رات ساتھ گذاری ہے۔"

"وہ رات۔ نواز اور درفشانہ کی رات نہیں تھی۔ وہ رات ہربنس کے اڈے پر ایک ہزار افغانی کے عوض حاصل کی گئی تھی۔ میں تمہارے لیے اجنبی ہوں اس رات میں صرف ایک گاہک تھا۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ مجھے سونے دو درفشانہ۔" میں نے کروٹ بدل لی۔ اسے اس طرح ٹھکرانے کا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت کے احساسات نے ہمت ختم کردی تھی۔ ضمیر کے گوشوں میں کھد بدر ہونے لگی تھی جس نے ذہن کا رخ بدل دیا تھا۔ نہ جانے وہ کب تک میرے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی رہی۔ ایک وفاشعار دلہن کی طرح۔ ہاں سونے کے بعد مجھے کوئی احساس نہ رہا۔

لیکن اس وقت آدھی رات گذر گئی تھی' جب میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کروٹ بدلی تو میرے ہاتھ کسی نرم و گداز شے پر جا پڑے۔ عجیب سی گدگداہٹ ہوئی۔ اور حواس جاگ پڑے۔ درفشانہ میرے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا لباس اوپر سرک گیا تھا۔ اور اس کا جسم عریاں ہوگیا تھا۔

دودھ کی طرح سفید اور چمکدار جسم میری کلائی اس کے گداز سینے پر رکھی ہوئی تھی۔

اور مجھے سالوں پہلے کی ایک رات یاد آگئی۔ وہ رات جب میں اٹھارہ انیس سال کا لڑکا تھا۔ چاچا ظہور کے بیٹے نوردین کی شادی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ پوری بستی شادی کی تیاریوں میں اس طرح مصروف تھی جیسے خود اپنے گھر میں شادی ہو رہی ہو۔ ظہور چاچا کا گھر ہمارے گھر سے بالکل ملا ہوا تھا۔ ان کے مہمانوں نے ہمارے پورے گھر پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ عورتوں کو ہمارے گھر میں ٹھہرایا گیا تھا۔ میں عورتوں کے ہجوم سے گھبرا کر اپنا بستر لے کر کوٹھے پر چڑھ گیا تھا۔ کچی زمین پر بستر بچھا کر میں اس پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ چاچا کے گھر میں ڈھول بج رہا تھا۔ ڈھول کی سہانی آواز سماعت پر بار بننے کی بجائے اور گہری نیند کی وادیوں میں لے جا رہی تھی۔ "مینو ڈنڈیاں گڑھا کردے گیانی منڈا ماتجھے دا۔" کسی کنواری کی مدھر اور سوز بھری آواز ابھر رہی تھی اور یہ آواز ذہن پر سحر طاری کرتی رہی یہاں تک کہ میں سو گیا۔ اور پھر رات کے کسی حصے میں آنکھ کھل گئی۔ ڈھول بج رہا تھا۔ کلائی کو ایسے ہی گداز کا احساس ہو رہا تھا' جیسا اس وقت میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ رشیداں تھی۔ سائیں کھبے کی لڑکی جہلم سے آئی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ میرے مختصر سے بستر میں آگھسی تھی۔ شاید گرمی سے پریشان ہو کر اس کا ثبوت اس سے ملتا تھا کہ اس نے اپنے کرتے میں لگے ہوئے چاندی کے بٹن کھول دیئے تھے۔ اور چاندنی اس کے سفید سینے پر نثار ہو رہی تھی۔ وہ سو رہی تھی گہری نیند۔ میں اسے جانتا ضرور تھا۔ اکثر ظہور چاچا کے ہاں آتی رہتی تھی لیکن اس قدر قریب نہیں ہوا تھا۔

وہ سو رہی تھی۔ لیکن شاید اسے سوتے میں ہاتھ پاؤں مارنے کی عادت تھی۔ اس نے اپنا پورا جسم میرے اوپر لاد دیا۔ اور۔ اور۔ اس کی حرکتوں سے گھبرا کر میں نیچے اتر آیا۔ نہ جانے اسے کیسی عادت تھی۔ باقی رات میں نے گھر کے دروازے کے باہر گذاری۔ بہت سی یادیں ذہن میں تڑپنے لگیں۔ احساس ہوا کہ رشیداں کیا چاہتی تھی۔ یہ بھی اندازہ بہت بعد میں ہوا کہ وہ سو نہیں رہی ہے اور اس احساس کے ساتھ میں نے چونک کر درفشانہ کی شکل دیکھی۔

درفشانہ بھی جاگ رہی تھی۔ اس کی مخمور آنکھوں کی چمک میرے اوپر سحر طاری کر رہی تھی۔ لیکن آج میں باہر نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں دبوچ لیا اور وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اس کے مومی جسم کی روشنی شامل ہوگئی۔ ماحول سرگوشیاں کرنے لگا۔ درفشانہ کی آنکھیں طمانیت سے بند ہوگئیں۔ جیسے اسے مستقبل کے سہارے مل گئے ہوں۔

لیکن دوسری صبح ہوش و حواس کی صبح تھی۔ رات کی حماقت کا احساس تھا۔ میں یہ مہنگی حماقت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ درفشانہ سے بھی الجھن ہونے لگی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں بستر پر لیٹا لیٹا سوچتا رہا۔ درفشانہ گہری نیند سو رہی تھی۔ سکون و اطمینان کے ساتھ جیسے اس نے زندگی کے تمام فاصلے طے کرلیے ہوں۔ میں اٹھا اور باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ نل کے نیچے نہاتے ہوئے بھی میں آخری فیصلے کرتا رہا۔ پانی گرنے کی آواز سے شاید درفشانہ بھی اٹھ گئی تھی۔ مجھے اس کے جاگ جانے کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر میں بدن خشک کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

درفشانہ مجھے دیکھ کر مسکرائی میں بھی جواب میں مسکرادیا۔ اور وہ باتھ روم میں چلی گئی۔
دونوں نے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ اور پھر کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہوگا درفشانہ؟"

"میں کہہ چکی ہوں۔ میری فکر مت کرو۔ میں تھوڑی دیر کے بعد چلی جاؤں گی۔" اس ن اسی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور مجھے دل ہی دل میں خفت ہونے لگی۔ بلاوجہ اس کے بارے م الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہا تھا۔ تب میں نے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے آدھی رقم نکا درفشانہ کی طرف بڑھادی۔

"نئی زندگی کے راستے تلاش کرنے میں یہ تمہاری مدد کرے گی۔" اور درفشانہ نے تکلفی سے وہ رقم لے لی۔

"ہاں مجھے اس کی ضرورت تھی نواز۔ یہ مجھے فوری طور پر بھٹکنے سے روک لے گی۔ ا مجھے اجازت دو۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل کو دکھ کا احساس ہوا۔ وہ جا رہی لیکن دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا۔ زندگی میں نہ جانے کتنی آئیں گی اور کتنی جائیں گی ان الجھنوں کو ذہن میں جگہ دینی حماقت ہے۔

"خدا حافظ نواز۔"

"اپنا سامان ساتھ لے لو درفشانہ۔ سوٹ کیس تم لے جاؤ۔ میں دوسرا خرید لوں گا۔"

"میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی میرے محسن۔" اس نے میرے قریب آکر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور پھر اس نے میرے ہونٹوں کو ایک بوسہ دیا اور سوٹ کیس اٹھا کر نکل گئی۔ میرے کپڑے اس نے نکال کر رکھ دیئے تھے۔ میں سلگتی ہوئی نگاہوں سے دروازے کو رہا۔ ذہن میں طوفان امنڈ رہے تھے لیکن پھر دل میں آگ جل اٹھی۔ طوفان خشک ہوگئے۔ میں خود کو لاتعلق کرلیا۔ پوری زندگی حادثات سے عبارت ہے۔ کسی ایک حادثے کو ذہن پر سوار ہونے دینا چاہیے۔ میں نے ایک لباس نکالا۔ اسے پہنا۔ بال وغیرہ درست کرکے میں باہر نکل آ صورت شکل بلیوں کی سی تھی۔ لیکن غلیظ نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان میں شامل ہونے لیے یہ شرط نہیں ہے۔

میں بھی ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر میں نے دور تک سڑکیں دیکھیں۔ درفشا کہیں پتہ نہیں تھا۔ وہ جاچکی تھی۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ کچے مکانات، تنگ گلیاں، جگہ جگہ بکھ ہوئے سرو کے درخت۔ سڑکوں کے کنارے قندھار کے تحفے سرخ انار کے بیوپاری ہیں بازار تلاش میں چل پڑا۔ قاعدے کا ایک بھی بازار نہیں تھا۔ کوئی چیز خریدنے کا سوال ہی پیدا نہیں تھا۔ سوٹ کیس کی ضرورت تھی لیکن نظر ہی نہ آیا۔ مجبوراً پلاسٹک کا ایک تھیلا خرید لیا۔ او واپسی کے خیال سے چل پڑا۔ لیکن ابھی چند قدم آگے بڑھا تھا کہ ڈھیلے ڈھالے جبے میں ملبو لمبی پگڑی باندھے ہوئے بڑی بڑی مونچھوں والا ایک افغان میرے راستے میں حائل ہوگیا۔ ا گہری سرخ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

"خو تمارا نام کیا ہے۔" اس نے غرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے خان؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔

"خو اگر تمارا نام نواز ہے تو جلدی ہمیں بتاؤ۔"

"ہاں میرا نام نواز ہے۔" میں نے کہا اور سنبھل گیا۔ میں کسی بھی واقعے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ خان نے لپک کر میری کلائی پکڑلی۔ لیکن گرفت غیردوستانہ نہیں تھی۔ وہ مجھے ایک گلی میں لے گیا۔ اور پھر میری کلائی چھوڑتے ہوئے بولا۔

"امارا نام گلزار خان ہے۔ زیاد خان نے تمہارے کو بتایا ہوگا۔"

میرے دماغ میں بجلی سی چمک گئی۔ مجھے یاد آگیا۔ زیاد خان نے بتایا تھا کہ اگر ہربنس کے اڈے پر کوئی گڑبڑ ہوجائے تو گلزار خان مدد کرے گا۔

"ہاں خان۔ زیاد خان نے مجھے بتایا تھا۔ مگر تم یہاں کہاں؟"

"خو ہربنس کالوگ کے ساتھ آیا ہے۔ تمارا تلاش میں تمہیں قتل کرنے ہربنس کو پتہ چل گیا کہ تم درفشانہ کو نکال لایا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ام لوگ کو اور چھوڑا۔ تمارا پتہ بتایا۔ لڑکی کدر ہے؟"

"وہ آزادی چاہتی تھی خان۔ میں نے اسے آزاد کردیا۔"

"چہ تم ادر سے سیدا ارات چلا جاؤ۔ اب ہوٹل مت جاؤ۔ وہ خدائی خوار تمارا تلاش میں ہے۔ ام بھی ان کے ساتھ آیا۔ تم ہوٹل میں نہیں ملا تو سب لوگ الگ الگ تمارا تلاش میں نکل پڑا۔ خدا کا شکر ہے تم سب سے پہلے ام کو مل گیا۔"

"کل کتنے آدمی ہیں خان؟" میں نے پوچھا۔

"چار آدمی ہے امارا سمیت۔"

"ٹھیک ہے خان! تم فکر مت کرو۔ میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"امارا مدد کا ضرورت ہو تو امیں بتاؤ" گلزار خان نے کہا۔

"نہیں خان۔ شکریہ۔ ہاں۔ میں نے لڑکی سے معلومات حاصل کی ہیں اس کی رپورٹ دینا چاہتا ہوں۔ کیا وہ رپورٹ تمہارے ہاتھ بھیجی جاسکتی ہے۔"

"نہیں۔ بائی صاحب۔ تم ارات پہنچ کر رپورٹ ڈاک سے بھیج دینا۔ اچھا اب چلو چھوٹا جگہ ہے۔ کوئی اور نکل آیا تو ہمیں بھی پریشانی ہوگا۔ خدا حافظ ادر سے سیدھا راستہ بس اڈہ جاتا ہے۔ اور سے تمہیں ارات جانے کا راستہ مل جائے گا۔"

"خدا حافظ خان۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور گلزار خان گلی سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جو ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے۔ اگر درفشانہ کو وہاں سے نکلنے میں ذرا سی بھی دیر ہوجاتی تو تمام کئے دھرے پر پانی پھر جاتا۔ وہ دوبارہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتی لیکن خوش قسمتی سے وہ نکل گئی تھی۔ اور اب میں رہ گیا تھا۔ میں کسی سے خوف زدہ نہیں تھا۔ ہربنس کے چار آدمی میری تلاش میں آئے ہیں۔ جن میں سے گلزار نکل گیا تو تین رہ گئے۔ بہرحال ——— مجھے اپنا سامان تو ہوٹل

قندھار سے لینا ہی تھا۔ گلزار خان نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کی یہی مہربانی کافی تھی کہ اس نے مجھے پہلے سے ہوشیار کردیا تھا۔ اگر میں خوفزدہ ہوتا تو سامان بھی چھوڑ دیتا۔ ظاہر ہے کونسی نیک کمائی کا تھا۔ لیکن میرے ذہن میں تو الاؤ جل رہے تھے۔ ایک قسم کی اذیت طلبی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ دماغ پر جمی ہوئی برف کو توڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے سیدھے ہوٹل کا رخ کیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر ہوٹل کا حساب کتاب کیا۔ اس دوران میری نگاہیں قرب و جوار کا جائزہ لیتی رہیں۔ اور پھر------ ایک چست و چالاک جسم کا سردار میری نگاہوں میں آگیا۔ جو عجیب انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔ ممکن ہے وہ بھی ہربنس کا ساتھی ہو۔ حالانکہ میں نے گلزار خان سے یہ بات نہیں پوچھی تھی کہ مجھے تلاش کرنے والوں میں سکھ بھی ہیں یا صرف افغانی۔

تاہم میں نے نگاہوں میں سردار کو بھرلیا۔ پھر میں اپنے کمرے میں آیا۔ اپنا سامان پلاسٹک تھیلے میں رکھا۔ پستول نکال کر اس کے چیمبر چیک کئے اور اسے اس انداز میں رکھ لیا کہ اگر نکالنے کی ضرورت پیش آئے تو دقت نہ ہو۔ پھر میں کمرے سے نکل آیا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے عقب کا جائزہ لیا۔

بالکل درست۔ میرے ذہن نے کہا۔ وہی سکھ ایک اور سکھ اور ایک افغان کے ساتھ میرے عقب میں چلا آرہا تھا۔ یقیناً چوتھا گلزار ہوگا' جو ان میں نہیں ہے۔ لیکن اب۔ کیا ان لوگوں سے حساب کتاب کرلیا جائے۔ نظر انداز کرنا حماقت ہے۔ اس سے مار کھا جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے جان بوجھ کر ایک سنسان راستے کا رخ اختیار کیا۔ میری اس حرکت پر وہ لوگ حیران تو ہوئے ہوں گے۔ ظاہر ہے میں جان بوجھ کر موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد میں ایک ایسی سڑک پر نکل آیا جس کے دو رویہ سرو کے درخت کھڑے ہوئے تھے۔ درختوں کے دوسری سمت ترکاری کے کھیت اور کھیتوں کے انتہائی سرے سے انار کے باغات شروع ہوگئے تھے۔ میرے خیال میں ان لوگوں کی مدافعت کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ اور بلاشبہ انہوں نے بھی میرے ہی انداز سے سوچا۔ چنانچہ ان کی رفتار تیز ہوگئی۔ میں اسی پرسکون انداز میں چل رہا تھا۔ میری رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چنانچہ چند ساعت میں وہ میرے قریب پہنچ گئے۔ میں رک گیا۔ وہ مجھے گھیر کر کھڑے ہوگئے۔

"درفشانہ کہاں ہے؟" ان میں سے ایک سردار نے انگلش میں پوچھا۔

"کون درفشانہ؟" میں نے پنجابی میں الٹا سوال کرڈالا۔ میرے منہ سے پنجابی سن کر دونوں سکھ حیران رہ گئے۔ لیکن پھر وہ سنبھل گئے۔ اور ان میں سے ایک نے جو چھریرے بدن کا تھا' اور جسے میں نے ہوٹل میں دیکھ لیا تھا' کہا۔

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ وہی لڑکی جسے تم ساتھ لے آئے ہو۔ جو ڈیرے پر رقص کرتی تھی۔ وہ یہاں تک تمہارے ساتھ آئی ہے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہمیں مل گیا ہے جو تم دونوں کو یہاں لایا تھا۔"

"لڑکی میرے ساتھ آئی تھی۔ ایک رات اس نے یہاں قیام کیا اور پھر چلی گئی۔ مجھے نہیں

معلوم وہ کون تھی اور کہاں چلی گئی۔"

"جھوٹ۔ بکواس۔ تم نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ بتاؤ۔ ورنہ--- ہربنس کے حکم سے تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

"چلو۔ کوشش کرو۔" میں نے اپنا تھیلا زمین پر رکھ دیا۔

"مارو۔" دوسرے سکھ نے افغان اور چھریرے بدن والے سے کہا۔ اور افغان نے اپنی پگڑی کا لٹکتا ہوا سرا دانتوں میں دبالیا۔ اس نے مٹھیاں بند کرکے میری طرف بڑھائیں۔ لیکن دوسرے لمحے میری لات اس کے پیٹ پر پڑی اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لیکن اسی وقت عقب سے دبلے پتلے سردار جی نے میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر گردن میں پھنسانے کی کوشش کی۔ داؤ تو اچھا تھا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے سے طاقتور پر نہیں آزمایا جاتا۔ میں نے بازوؤں کو زوردار جھٹکا دیا اور سردار جی کو خود لینے کے دینے پڑ گئے۔ ان کے بازو چھیل گئے تھے۔ پیچھے سے میری کہنی ان کے سینے پر پڑی اور ان کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اتنی دیر میں افغان اٹھ گیا تھا۔ اس بار اس نے غراتے ہوئے میرے اوپر حملہ کیا تھا۔ لیکن میں سامنے سے ہٹ گیا اور افغان جھونک میں دوسرے سردار سے ٹکرا گیا۔ جس نے ابھی تک لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ تب میں نے دبلے پتلے سردار کو سنبھال لیا۔

لیکن اس وقت افغان کے نیچے دبے ہوئے سردار نے پستول نکال لیا اور چیخ کر بولا۔ "بس اب ہٹ جاؤ۔ کھیل ختم ہوگیا۔" لیکن میں کھیل ختم کرسکتا تھا۔ دبلے پتلے سردار کو میں نے پھرتی سے ڈھال بنالیا اور پھر میرا پستول بھی نکل آیا۔ اسی ڈھال سے میں نے دوسرے سردار کے پستول پر گولی چلادی۔ لیکن بدقسمتی کہ نشانہ پستول کا نہ رہا۔ گولی نے سردار جی کی پسلیاں توڑ دی تھیں۔ سردار جی کی دلخراش چیخیں گونج اٹھیں۔ دوسرے سردار نے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ اور افغان کبھی میرے پستول کو دیکھتا کبھی زمین پر پڑے سردار جی کو۔ میں نے اطمینان سے اپنا تھیلا اٹھایا اور پستول اسی انداز میں ہاتھ میں لیے--- آگے بڑھ گیا۔ ویسے میں چوکنا تھا۔ مفرور سردار جی کسی بھی طرف سے حملہ آور ہوسکتے تھے۔

میں اس سڑک سے نکل آیا۔ لیکن دوسرے سردار جی کا پتہ نہیں چل سکا۔ بارونق جگہ آکر مجھے احساس ہوا کہ میں بہرحال خطرے میں ہوں۔ ممکن ہے وہ مرجائے جس کے گولی لگی ہے۔ ایسی مشکل میں' میں مقامی حکومت کا مجرم بھی بن گیا ہوں۔ بڑی خطرناک صورت حال ہو جائے گی۔ چنانچہ یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ ہرات۔ یہاں سے ہرات جانا ہی بہتر ہے۔ تاکہ پھر وہاں سے ایران نکل جایا جائے۔ لیکن سفر کا مسئلہ تھا۔ جو کچھ ہوچکا تھا وہ کافی تھا۔ اب کسی خطرے میں پڑنا حماقت تھی یہاں سے کسی بس وغیرہ میں جانے کا مطلب تھا کہ پولیس کے یا ہربنس کے آدمیوں کے ہاتھ لگ جایا جائے چنانچہ بس کے اڈے پر جانا حماقت ہے۔

میں نے ایک افغانی کو روک کر ہرات جانے والے راستے کا پتہ پوچھا۔ اور پھر پیدل چل پڑا۔ مقصود یہ نہیں تھا کہ ہرات تک کا راستہ پیدل طے کروں۔ بس یہ خیال تھا کہ قندھار سے جس قدر

دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں اور کسی اور جگہ سے بس وغیرہ حاصل کروں۔ تاکہ اگر یہاں فوری تلاش شروع ہو جائے تو اس سے بچ سکوں۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چل پڑا۔ یہی سڑک ہرات جاتی تھی۔ لیکن میں نے سڑک سے کافی فاصلہ رکھا تھا تاکہ کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑ سکے۔ قندھار کے نواح میں تو اس طرح چلنے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ باقی اس سے آگے جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں چلتا رہا۔ ذہن آزاد چھوڑ دیا تھا۔ کوئی فکر نہیں تھی۔ بس ایک آوارہ گرد۔ دنیا کے جھمیلوں سے آزاد۔ کھانے پینے کے لیے کچھ ساتھ نہیں تھا۔ لیکن اس کی بھی فکر نہیں تھی۔ جب صحرانوردی کی ٹھان لی تھی تو مصائب سے بچنے کا تصور بے وقوفی کے علاوہ اور کیا تھا۔ انار کے باغات کا سلسلہ پیچھے رہ گیا تھا اور اب تاحد نظر خشک پہاڑ اور ویرانے نظر آرہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بس ست روی سے سڑک پر چلتی نظر آجاتی اور پھر آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی۔

دوپہر ہوگئی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ لیکن غم کھانے کے علاوہ اور کوئی چیز نہ تھی۔ سفر جاری رہا۔ پھر دائیں ہاتھ پر واقع ایک پہاڑ نظر آیا جس کی چوٹی پر بابر کی فتوحات کے نشان کندہ ہیں۔ کچھ سیڑھیاں بھی نظر آئیں اور قدم رک گئے۔ شاید پانی موجود ہو۔ پیاس بھی سخت لگ رہی تھی۔ کچھ نہ سہی تھوڑی دیر آرام ہی کرلیا جائے۔ سفر تو کرنا ہی ہے۔ سڑک چھوڑ دی اور سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیئے اوپر تک پہنچنے کے لیے چالیس سیڑھیاں طے کرنی پڑیں۔ خاصی مشکل چڑھائی تھی۔ لیکن بہرحال اوپر پہنچ گیا۔ یہاں پتھروں پر بابر کے عہد کی خوبصورت تحریریں موجود تھیں۔ ایک تحریر اکبر کے دور کی بھی تھی۔ ذہن بٹ گیا۔ خیالات کتابوں کی طرف دوڑ گئے۔ کسی زمانے میں تاریخ سے بھی دلچسپی تھی جن علاقوں سے گذر رہا تھا ان کے بارے میں پڑھ بھی چکا تھا۔ لیکن جس حیثیت سے یہ سفر کر رہا تھا اس میں تاریخ کی دلچسپیوں میں گم ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔

تاہم وقتی طور پر ان صحرانشینوں کے جبروت و جلال کی کہانیاں یاد آئیں اور ان میں گم ہو گیا۔ ایک ابھرے ہوئے پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ پانی وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن یہاں بیٹھنے سے ہی کافی سکون مل گیا تھا۔ منتشر ذہن یکسو ہو گیا تھا۔ سورج کبھی پوری طرح چمکنے لگتا۔ کبھی بادلوں کی اوٹ میں گم ہو جاتا۔ تقریباً ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد نیچے اترا اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ٹانگوں میں ابھی کافی جان تھی۔ گو رفتار سست تھی لیکن ابھی رات گئے تک چلنے کی ہمت رکھتا تھا۔ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ سورج چھپ گیا۔ بہت دیر سے کوئی بس وغیرہ بھی نہیں گذری تھی۔ ویسے اب سڑک کے کنارے ہی چلنا پڑ رہا تھا۔ کیونکہ دونوں سمت گہری گھاٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔

کئی بار گاڑیوں کے ہارن سنائی دیئے رفتار سست ہوئی، لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔ یہ خیال ہی ذہن میں نہیں آیا تھا کہ کسی سے لفٹ لینے کی کوشش کی جائے۔ یہ صورت حال بس سے بہتر تھی۔

وہ نیلے رنگ کی ایک پرانے طرز کی کار تھی۔ جس کے انجن کی آواز کافی تیز تھی اس وقت میں ایک چھوٹے سے پل سے گذر رہا تھا۔ جس کے نیچے ایک خشک پہاڑی نالہ موجود تھا۔ جگہ اتنی تھی کہ ایک طرف کھڑے ہو کر ہی گاڑی کو گذرنے دیا جاتا۔ چنانچہ رک گیا۔ جھٹپٹا ہو چکا تھا اس لیے

ڈرائیور کی شکل نظر نہیں آرہی تھی۔ بہرحال کار میرے قریب سے گذری۔ پل سے بھی گذر گئی اور آگے جا کر رک گئی میں نے بھی آگے قدم بڑھا دیئے تھے۔ لیکن کار رکتے دیکھ کر میں چونک پڑا اور پھر جب کار ریورس ہوئی تو میرے ذہن میں خدشات جاگ اٹھے۔

ممکن ہے ہر بنس کے آدمی ہوں۔ میری تلاش میں نکل پڑے ہوں۔ دوسرے لمحے میں نے اپنا پستول نکال لیا۔ اور اسے اس طرح تھیلے کی آڑ میں کرلیا کہ صاف نظر نہ آئے۔ میرے قدم ست روی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ لیکن کار کی کھڑکی سے کسی نے سر نکال لیا تھا اور اب ہاتھ سے میری طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں کسی قدر حیران سا آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر کار کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن بالکل قریب سے میں ڈرائیور کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چمکیلے چہرے اور سبک نقش و نگار کی ایک خوبصورت سی لڑکی تھی۔

”ہے۔ کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے برطانوی نوجوانوں کے لہجے میں کہا۔

”ہرات۔“ میں نے بھی انگریزی ہی میں جواب دیا۔

”آجاؤ۔“ اس نے مجھے کوئی آوارہ گرد ہپی ہی سمجھا تھا اور اپنے برابر کا دروازہ کھول دیا تھا۔ میں نے چالاکی سے ایک نگاہ اس کی کار کی عقبی سیٹ پر ڈالی۔ کہ اس کے درمیان کوئی چھپا ہوا تو نہیں ہے۔ اور پھر مطمئن ہو کر اس کے برابر کی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اندر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ ایک قیمتی کپڑے کی ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ اس کے سیاہ بال بہت خوبصورت تھے اور اس نے کوئی اعلیٰ قسم کی خوشبو استعمال کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ نہ تو افغانی تھی اور نہ کسی اور ملک کی بلکہ اپنے ہی قبیلے کی معلوم ہوتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے غیر ملکی ہی سمجھ رہی تھی اسی لیے خالص برطانوی لہجے میں بات کی تھی۔

میرے اندر بیٹھنے کے بعد اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی میں نے غیر محسوس انداز میں پستول تھیلے میں ڈال لیا تھا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے پیشانی سے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔

”کابل سے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس سے پہلے؟“

”پشاور۔“

”اس سے بھی پہلے؟“ اس کے ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں بھی مسکرانے لگا تھا لیکن میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور وہ انتظار کرتی رہی۔ پھر میرا جواب نہ پا کر دوسرا سوال کیا۔

”پیسے ختم ہو گئے تھے؟“

”کیوں؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”پھر بس سے سفر کیوں نہیں کیا؟ ہرات کے لیے تو بس ملتی ہے۔“ اس دوران میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اچھی خاصی اردو داں ہے خواہ مخواہ زبان بگاڑ کر انگریزی میں بولتی رہی ہے۔

چنانچہ میں نے بطور آزمائش اردو میں کہا۔

"بس جنوں منت کش آہن نہ ہوا۔ صحرانوردی ہی ٹھہری تو ستاروں کی تلاش فضول سمجھی اور چل پڑا۔ ابھی ٹانگوں میں جان ہے تھک گیا تو منزل سمجھ لوں گا۔ گھاٹا نہیں ہے۔ کیا خیال ہے؟"

لیکن اس نے جواب دینے کی بجائے پورے بریک لگا دیئے اندر کی بتی روشن کی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔

"کیوں؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم۔ تم کہاں کے باشندے ہو؟" وہ متحیر لہجے میں بولی۔

"پاکستانی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"مائی گاڈ۔ اب تک میں احمق بنتی رہی۔" اس نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔ "میں تمہیں غیر ملکی سمجھ رہی تھی۔"

"اب تصحیح کر لو۔ ویسے تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟"

"مشرقی پنجاب سے۔ میں جالندھر کی رہنے والی ہوں۔ وہاں کے ایک معزز برہمن گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ تم مسلمان ہو گے؟"

اس کے سوال سے دل پر گھونسہ سا لگا۔ کس منہ سے خود کو مسلمان کہتا۔ حلیہ اور حرکتیں حالات نے کیا بنا دیا تھا۔ یقیناً پیدائش کے بعد کانوں نے اذان کی آواز سنی تھی۔ لیکن پھر یہ آواز۔ یہ آواز ماحول میں گم ہو گئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کار اسٹارٹ کر دی اور پھر اسے سست روی سے آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"بڑا دلچسپ اتفاق ہے۔ خوب غلط فہمی رہی۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ تم مقامی ہو۔ میرے ملک میں بھی ہپی ازم کافی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ نوجوان ہری کرشنا ہری رام کرتے ہیں اور آوارہ گردی کو نکل جاتے ہیں' لیکن ہری کرشنا اور ہری رام سے ان کا کیا واسطہ لوگوں نے مذہب کو بھی مذاق بنا لیا ہے۔ ویسے یہ زندگی بری نہیں ہے لیکن اس کے لیے یہ مخصوص انداز ہی کیوں۔ سیاحت کا شوق' تو ایک اعلیٰ شوق ہے۔ میں بھی سیاح ہوں۔ میں بھی دنیا دیکھنے نکلی ہوں۔ لیکن باقاعدہ اور باعزت طور پر۔ کیا تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"خوب۔ گویا تم میں بہتر ساتھی بننے کی ہر صلاحیت موجود ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نام کیا ہے؟"

"نواز۔" میں نے مختصراً کہا۔

"میرا نام کوشلیا ہے۔ ہم دونوں میں مذہب کا رشتہ نہیں ہے۔ لیکن انسانیت کا رشتہ ضرور ہے۔ کیا تم رشتوں کے قائل ہو؟"

"نہیں۔ میں کسی چیز کا قائل نہیں ہوں۔ میں صرف حالات کا قائل ہوں۔ حوادث کا قائل ہوں۔ ہمارا رشتہ صرف ماحول سے ہے۔ ہم حالات کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ نظر نہ آنے

والے تاروں کی حرکت کی طرح متحرک ہیں۔ خود ہماری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہم وقت کے غلام ہیں اور غلاموں کی سوچ اپنی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ سوالات فضول ہیں۔ اگر تسلی چاہتی ہو تو صرف یہ کافی ہے کہ میرے ذہن میں تشدد کا خانہ نہیں ہے' جب تک ساتھ رہو گی دھوکہ نہیں کھاؤ گی۔"

"ہوں۔" اس نے سڑک سے نظریں اٹھا کر گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا "کوئی کہانی؟"

"تمام کہانیاں بھول چکا ہوں۔ صرف یہ سڑک یاد ہے جس پر ہم جا رہے ہیں۔ یہ سیدھی ہرات جاتی ہے۔"

"نہیں' راستے میں گرشک بھی پڑتا ہے۔ دریائے ہلمند کا کنارہ بہت خوبصورت ہے۔ جہاں غزنوی سلطان کی تاریخ بکھری پڑی ہے۔ اگر سیاح ہو تو تاریخ کو نظرانداز نہ کرو۔ یہ رات ہم دریائے ہلمند پر گذاریں گے۔"

میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ یہ نوجوان لڑکی کس قدر نڈر ہے تنہا یہ خطرناک سفر کر رہی ہے۔ میرے بجائے اسے کوئی خونخوار افغانی بھی مل سکتا تھا جو اس کی نازک پسلیوں میں چاقو اتار کر اس کا سامان چھین لیتا۔ یا پھر کوئی آوارہ گرد بدمعاش۔ لیکن وہ خود سے بے خوف ہے۔ اس نے ایک اجنبی کو ایک ویران جگہ اپنے ساتھ رات گذارنے کی دعوت دے دی ہے۔ ممکن ہے یہ وہ نہ ہو جو خود کو ظاہر کرتی رہی ہے۔ وقت اور ماحول کے تحت خود کو بدل لینے کی عادی ہو۔ الفاظ خرچ کرنے میں کیا جاتا ہے۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔

"کیا خیال ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ اس وقت تمہارے ساتھ ہوں۔ جو تم پسند کرو گی وہی مجھے پسند ہو گا۔ ویسے تم نے میرے اوپر یہ احسان کیوں کیا ہے؟"

"راستے میں کئی آوارہ گردوں کو لفٹ دے چکی ہوں۔ سب کے سب بیخود دنیا سے بے زار تھے۔ بعض پر تو ترس آتا ہے۔ لیکن یہ تمہاری خوبی ہے' نہیں ہمارے علاقے کی خوبی ہے کہ تم ان آوارہ گردوں کی طرح گندے نہیں ہو۔ ان میں بعض تو ایسے غلیظ تھے کہ مجھے اپنی حماقت پر کافی شرمندہ ہونا پڑا۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ بھی ہنستی رہی۔ ہنسنے سے اس کا چہرہ کچھ اور چمکنے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم گرشک پہنچ گئے۔ اور اس نے کار دائیں سمت کچے راستے پر ڈال دی۔ تب دریائے ہلمند کا کنارہ آ گیا اور اس نے کار ایک مناسب جگہ روک دی۔ کار روک کر اس نے انجن بند کیا۔ اور پھر دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اور پاؤں پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی۔ انگڑائی کے ساتھ ایک عجیب سی آواز اس کے منہ سے نکلی تھی۔ جس پر وہ خود ہی ہنس پڑی۔

"خوب تھک گئی ہوں۔ لیکن ہم چاندنی رات میں ہلمند کے کنارے کی سیر کریں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"بھوکے ہو؟" اس نے ایک دم سوال کیا۔

"کچھ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کچھ۔" اس نے کہا اور کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ پرانے طرز کی اس کشادہ کار کی ڈگی میں کافی گنجائش تھی۔ میں بھی نیچے اتر آیا۔ اور ڈگی کھولنے میں اس کی مدد کی۔ پوری ڈگی بھری ہوئی تھی۔ خوراک کے ڈبے۔ پٹرول کے بیرل' سوٹ کیس اور نہ جانے کیا کیا۔

اس نے پکی ہوئی خوراک کے چند ڈبے' ڈبل روٹیاں اور پانی کے ٹین نکال لیے۔ پھر ایک چادر نکالی اور اسے کار کے قریب ہی زمین پر بچھالیا۔

"بیٹھو۔" وہ بے تکلفی سے بولی اور پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ابھی چاند نہیں نکلا تھا۔ لیکن ستاروں کی مدھم روشنی میں اس کے جسم کے خطوط نمایاں تھے خاصی گداز لڑکی تھی۔ لیکن میں اس سے چند وعدے کر چکا تھا انہیں پورا کرنا ضروری تھا۔ اس لیے میں نے اس پر سے نگاہیں ہٹالیں۔ وہ ٹن کٹر سے ڈبے کاٹ رہی تھی۔ میں نے کٹر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس نے میری طرف دیکھا اور پھر ہنس پڑی۔

"کیوں؟" میں نے ایک ڈبہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"اگر تم موجود نہ ہوتے تو ظاہر ہے یہ ڈبے میں ہی کھولتی۔ دراصل مرد کو خود کو عورت سے برتر سمجھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اچھے اور برے ہر انداز میں وہ خود کو عورت پر فوقیت دیتا ہے اور خود کو اس پر برتر سمجھ کر مطمئن رہتا ہے۔ حالانکہ عورت جسمانی طور پر بعض اوقات مرد سے زیادہ طاقتور ثابت ہوتی ہے۔"

"بعض اوقات——" میں نے شرارت سے کہا۔ اور وہ اس انداز میں مجھے دیکھنے لگی جیسے میرے جملہ پورا کرنے کی منتظر ہو۔ لیکن جب میں خاموشی سے ڈبے کھول کر اس کے سامنے رکھتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ تو اس نے کہا۔

"تم کچھ کہنے کے لیے رک گئے۔"

"نہیں۔ میں جملہ پورا کر چکا ہوں۔" میں نے بدستور شرارت سے کہا۔

"بات بعض اوقات کی تھی۔ میرا خیال ہے یہ خصوصی قوت ہر عورت میں ہوتی ہے۔ اگر کسی بھی مرد کو زندگی میں صرف ایک بار بچہ پیدا کرنا پڑتا تو شاید وہ ہمیشہ کے لیے عورت پر اپنی برتری کو بھول جاتا۔"

"میرا خیال تھا کہ وہ میری بات پر خاموش ہو جائے گی' شرمائے گی' کھانا شروع کر دے گی لیکن اس نے پوری فراخ دلی سے ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر بے تحاشا ہنسنے لگی۔

"میری دلی آرزو ہے۔ یقین کرو میری دلی آرزو ہے۔ کاش یہ کام بھی مرد کی طرف منتقل ہو جائے کاش۔" وہ پھر ہنس پڑی۔ میں بھی اس کا ساتھ دیتا رہا۔ پھر ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔ اس گفتگو سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہو گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ بے حد دلچسپ لڑکی ہے۔ جب تک بھی اس کا ساتھ رہے گا' خوب وقت گذرے گا'! کیا ضروری ہے کہ اسے عورت ہی سمجھا جائے

عورتیں تو بے شمار مل چکی تھیں۔ کھانے کے بعد ہم نے سرد کافی پی۔ اور پھر خالی ڈبے ایک طرف اچھال دیئے۔ پھر کھڑے ہو کر چادر اٹھائی اور اسے ڈگی میں ٹھونس دیا۔ باقی بچا ہوا سامان بھی ڈگی میں رکھنے کے بعد اس نے ایک کارٹن سے قیمتی سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔

"سگریٹ پیتے ہو؟"

"ہاں۔ میرے پاس موجود ہیں۔"

"بھرے ہوئے ہوں گے؟"

"بھرے ہوئے بھی ہیں۔ تم پیتی ہو؟"

"نہیں لیکن اس کے بارے میں تم سے سوالات ضرور کروں گی؟ لو جب تک یہ پیو۔" اس نے پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ مجھے آفر کیا۔ دوسرا خود ہونٹوں میں لگا کر اسے سلگانے لگی۔ میرا سگریٹ بھی سلگا کر اس نے دو تین گہرے گہرے کش لیے پھر ڈگی لاک کی' کھڑکیوں کے شیشے چڑھا کر ہینڈل لاک کیے اور پھر آگے بڑھ گئی۔ رخ دریا کے کنارے کی طرف تھا۔ کچھ منٹ خاموشی رہی۔ تو میں نے سوال کیا۔

"ہاں۔ تم کیا سوال کر رہی تھیں؟"

"میں نے اچانک ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ دراصل میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تم لوگ' میرا اشارہ ہپیوں کی طرف ہے۔ تمہارے عقائد کے بارے میں تھوڑا بہت مجھے معلوم ہے تم لوگ انسانی تہذیب کا مذاق اڑاتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ پتھر کے دور کا انسان زیادہ مہذب اور امن پسند تھا۔ تمہارے خیال میں اس دور کا انسان غیر مہذب اور وحشی ہے اور تم صرف اس کے خلاف ہو جو موجودہ تہذیب میں رائج ہے لیکن یہ نشہ آور اشیاء کا استعمال کون سے زمرے میں آتا ہے۔ تب میرے ذہن میں آیا کہ یہ خود کو فریب دینے کے مترادف ہے۔ تم خود کو نشہ آور اشیاء میں غرق کر کے دنیا کو بھول جانے کے خواہشمند ہوتے ہو۔ کیونکہ اس دنیا کو مکمل طور سے نہیں بدل سکتے۔ اس لیے کبوتر کی طرح آنکھ بند کر لینے پر اکتفا کرتے ہو۔ حالانکہ آنکھ بند کر لینے سے اقدار نہیں بدل جاتیں۔ سوائے اس کے کہ تم دنیا سے الگ تھلگ' ایک غیر انسانی مخلوق بن کر رہ گئے ہو۔ میں نے خود کو اس سوال کا جواب اس انداز میں دے دیا تھا اور اس سے زیادہ میں کچھ سننا بھی نہیں چاہتی کیونکہ ایک بے مقصد موضوع نکل آئے گا۔ کیا تم مجھے مزید کچھ بتانے کے لیے بے چین ہو؟"

"نہیں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"یہ تمہاری خوبی ہے۔" اس نے تعریفی انداز میں کہا۔ دریا کے کنارے کنارے ہم بہت دور نکل آئے۔ سامنے ہی لشکری بازار اور ایک پرانے قلعے کے کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے جو ستاروں کی چھاؤں میں عجیب ہیئت اختیار کر گئے تھے۔

"یہ کھنڈرات اپنے پہلو میں کیسی کیسی پر اسرار داستانیں چھپائے ہوئے ہیں۔ لشکری بازار غزنوی سلطانوں کا سرمائی دارالسلطنت رہ چکا ہے۔ سلطان مسعود کو ترکوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو یہ بھی برباد ہو گیا۔ یہ زمین نہ جانے کتنے معرکے دیکھے ہوئے ہے۔ اگر تم اس کے سینے میں جھانکو تو

صدہا داستانیں پوشیدہ ہوں گی کیسے کیسے رازوں کی امین ہوتی ہے زمین کیسا وسیع ہے اس کا دل' کسی کو اس سے شکایت نہیں ہوتی۔" کوشلیا نے پرخیال انداز میں کہا۔

"تمہیں تاریخ سے کافی دلچسپی ہے۔ کیا ان علاقوں میں پہلے بھی آچکی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔ لیکن میں نے سفر پر روانہ ہونے سے قبل اس لائن کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل کی ہیں جہاں مجھے سفر کرنا ہے۔ میں ان پہاڑوں کے ایک ایک درے سے واقف ہوں۔ یہاں کی ایک ایک عمارت کی تاریخ مجھے زبانی یاد ہے۔ یہاں کے پورے نقشے میرے پاس موجود ہیں۔"

"بڑی سخت کاوش کی ہے تم نے۔" میں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔ عورت ہوں نا۔ ہر طرح سے مکمل ہو کر گھر سے نکلی ہوں۔" کوشلیا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں خاموش ہو گیا۔ وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی شکار تھی لیکن اس کے باوجود میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ عورت ہے ہر حالت میں مرد سے کمزور۔ فرض کیا جائے ان ویرانوں میں' میں اسے دبوچ لوں' تو وہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ شاید کچھ بھی نہیں۔ خواہ وہ مسلح ہو۔ دل چاہا کہ امتحان لے ڈالوں۔ لیکن پھر اس بے کار سی خواہش کو دبا لیا۔ خواہ مخواہ وہ بددل ہو جائے گی تھوڑے وقت کی اچھی ساتھی ہے۔ اس کے احساس برتری کو قائم رہنے دیا جائے۔

اور پہاڑوں کی اوٹ سے چاند نے زمین کا جائزہ لیا۔ اور مسکراتا ہوا ابھر آیا۔ اس کی ضیاء نے زمین کو منور کر دیا۔ تاریکی چھٹ گئی اور مناظر اجاگر ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ہی' نہ جانے کس طرف سے سازوں کی آواز ابھری اور ہم دونوں چونک پڑے۔ ڈفلی اور گٹار بج رہا تھا۔ بے ہنگم بے سرا نغمہ۔

"یہ کون ہے؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور کوشلیا مسکراتے ہوئے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

"تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔ ان پر اسرار کھنڈرات سے کون سی کہانیاں وابستہ ہیں۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

"گویا تمہارے خیال میں غول بیابانی؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تمہاری نسل کے لوگ۔ افغانستان کے بہت سے علاقے ان کے لیے کشش رکھتے ہیں۔ ممکن ہے یہاں ان کھنڈرات میں بھی ناجائز منشیات کا کوئی اڈہ ہو۔ چلیں دیکھیں میں بہرحال ان لوگوں کو دیکھ کر محظوظ ہوتی ہوں۔"

"اوہ!" میں نے دل ہی دل میں اس لڑکی کی ذہانت اور بے خوفی کی داد دی۔ درحقیقت میرا ذہن فوری طور پر اس طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ یہ عین ممکن تھا۔ کوشلیا نے آواز کی سمت قدم بڑھا دیئے۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ لیکن میرے قدم الجھے الجھے تھے۔ ممکن ہے یہاں موجود ساتھی خانہ ہر بنس کا ہو۔ ممکن ہے اس نے اپنے ان ساتھیوں کو بھی اطلاع دے دی ہو۔ اور یہاں مجھے پہچان لیا

جائے۔ کوشلیا نے میری اس جھجک کو محسوس کیا اور ہنس پڑی۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اور وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تمہارے قدموں میں روانی نہیں ہے۔ تم شاید درحقیقت غول بیابانی کی موجودگی پر غور کر رہے ہو۔" میرے ہونٹ سکڑ گئے۔ دل چاہا اسے برا بھلا کہوں۔ لیکن پھر خود کو سنبھال لیا اور خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے صحیح سمت کا رخ کیا تھا۔ تقریباً ایک فرلانگ پر ہمیں کچھ کھنڈرات میں پھیلی روشنی نظر آرہی تھی۔ راستے میں ہم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور روشنی پر نگاہیں جمائیں آگے بڑھتے رہے۔ روشنی بڑھتی جا رہی تھی شاید مزید مشعلیں روشن کی جا رہی تھیں اور جب ہم کھنڈرات میں پہنچے تو کافی روشنی ہو گئی تھی اور اس روشنی میں مخصوص قسم کے آوارہ گرد نظر آرہے تھے۔ مرد نما عورتیں عورت نما مرد۔ دم لگ رہے تھے' غم مٹ رہے تھے۔ چاندنی میں دھواں پیوست ------- ہو رہا تھا۔ دھوئیں کو چاندنی کاٹ رہی تھی۔ ہماری طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ ہم دونوں بھی ایک ٹوٹی ہوئی محراب کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس طرف قدرے اندھیرا تھا لیکن پتھر پر بیٹھے بیٹھے میری نگاہ گٹار بجانے والے پر اور پھر گٹار پر پڑی۔ اور میں اچھل پڑا۔ مشعلوں کی دھندلی روشنی میں' میں نے اوہوتے کو پہچان لیا تھا اور یہ گٹار' یہ گٹار بھی میرا تھا۔ نہ جانے کس خیال کے تحت میں نے اوہوتے کے اطراف میں دیکھا اور میرا یہ خیال بھی درست نکلا اوہوتے کے بالکل ساتھ ایک پتھر سے پشت لگائے' ٹانگیں پھیلائے میگاں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میرا پائپ تھا جس کو وہ ہونٹوں میں دبائے گہرا گہرا دھواں چھوڑ رہی تھی۔

اوہوتے گٹار بجا رہا تھا۔ اور میری ذہنی کیفیت عجیب تھی۔ مجھے اس پر غصے کے بجائے ہنسی آرہی تھی۔ کوشلیا بھی دلچسپی سے ان لوگوں کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ میرے لیے یہ حرکتیں نئی نہیں تھیں۔ اور بس ذہن میں کچھ دلچسپ پروگرام بنا لیا تھا۔ لیکن اس سے قبل میں جائزہ لے لینا چاہتا تھا کہ یہاں کوئی ایسا تو نہیں ہے جو مجھے پہچان جائے۔ مجھے صرف دو افغان نظر آئے جو میرے لیے اجنبی تھے۔ بہرحال میں نے دلچسپی کی خاطر خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔

"کوشلیا۔" میں نے سرگوشی کی۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ "تمہیں موسیقی سے دلچسپی ہے؟"

"بہت میرے پاس ریکارڈ چینجر ہے۔ میں تمہیں اپنی پسند کے نغمے سناؤں گی۔"

"میں گٹار بجانا جانتا ہوں۔"

"اوہ۔ واقعی۔ مگر گٹار تو نہ میرے پاس ہے نہ تمہارے پاس۔ اور یہ آدمی یا تو نشے میں ہے یا پھر اسے گٹار بجانا نہیں آتا۔"

"میں سناؤں؟"

"ضرور۔ لیکن۔" میں نے اس کا جملہ پورا نہ ہونے دیا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے اٹھایا اور اندھیروں کی آڑ لیتا ہوا اوہوتے کی طرف بڑھ گیا۔ چند ساعت کے بعد میں اس کے پیچھے تھا۔ اوہوتے اپنے نغمے کی آخری دھن بجا رہا تھا پھر اس نے نغمہ ختم کیا گلے سے گٹار کی ڈوری نکالی اور اسے رکھنے لگا۔ لیکن میں نے آگے بڑھ کر گٹار تھام لیا۔ اوہوتے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور نشے

میں ہونے کے باوجود مجھے پہچان گیا۔ وہ بری طرح اچھل پڑا اور اس کے چہرے پر سخت بدحواسی کے آثار نظر آئے۔

"کیا میں تمہیں اپنے گٹار پر کوئی اچھا سا نغمہ سناؤں اوہوتے؟" میں نے اس سے پوچھا لیکن اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ کوشلیا بھی اس کی اس حالت کو تعجب سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری اجازت سے۔" میں نے اوہوتے سے گٹار لے کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ پھر میں نے اس کے تار چھیڑے۔ اور پہلے وہی دھن شروع کر دی۔ "لعل میری پت رکھیو۔" گٹار کی آواز وہی تھی۔ لیکن اب اس کے سر دوسرے تھے۔ نشے میں بدمست ہپی چونک پڑے۔ دھن ہی ایسی تھی کہ دلوں کو گرما دیتی تھی۔ نغمہ بلند ہوتا گیا اور مردوں میں زندگی دوڑ گئی کسی نے میری طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی سب کھڑے ہو گئے اور رقص شروع ہو گیا۔ اوہوتے اسی طرح بیٹھا تھا لیکن نغمے کو میگاں نے بھی پہچان لیا تھا۔ پائپ اس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں مسکرا مسکرا کر گٹار بجا رہا تھا۔ کوشلیا میٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر میگاں اٹھی اور آہستہ آہستہ میرے قریب پہنچ گئی۔ وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس نے اپنا سر میرے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ بدمست آوارہ گرد سر دھنتے رہے رقص کرتے رہے اور پھر نغمہ ختم ہو گیا۔ قدم رک گئے۔ عجیب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لیکن فوراً بعد میں نے ایک اور دھن شروع کر دی۔ یہ ایک فرنچ دھن تھی۔ سسکاریاں ہیجان خیز آوازیں کھنڈرات میں گونجنے لگیں۔ دیوانے مست ہو گئے تھے۔ ناچ رہے تھے۔ اور تھوڑے فاصلے پر کوشلیا خاموش کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ نغمہ آخری مرحلے میں داخل ہو گیا اور پھر رک گیا۔ ناچتے بدن ڈھیلے پڑ گئے۔ جیسے گراموفون کی چابی ختم ہو گئی ہو اور پھر گردنیں اور شانے لٹک گئے میگاں کا سر اب بھی میرے گھٹنے پر ٹکا ہوا تھا کسی کونے سے تالی کی آواز ابھری اور کسی نے بدمست آواز میں کہا۔

"ایک اور۔ صرف ایک اور۔" نہ جانے وہ نغمے کے بارے میں کہہ رہا تھا یا چرس بھرے ایک سگریٹ کے بارے میں۔ میں نے اوہوتے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بدستور پھیکا پڑا ہوا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اور اوہوتے نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔

"میں بہت پنچ ہوں فنکار۔ میں بہت ذلیل ہوں۔ میں نے تمہارے نغمے چرائے تھے۔ یہ ساز بھی تمہارے پاس خوش ہے۔ میں نے بہت کوشش کی، لیکن اس سے خوشی کا ایک نغمہ نہ نکل سکا۔ اس کے سر غمگین تھے۔ میں بہت پنچ ہوں۔ بہت کمینہ ہوں۔"

وہ منہ چھپائے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے میگاں کا سر اپنے گھٹنے سے ہٹایا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ تب میں نے گٹار اوہوتے کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ اور واپسی کے لیے مڑا۔ اوہوتے تڑپ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "سنو۔ میں بیشک چور ہوں۔ لیکن میں چرائی ہوئی کوئی چیز واپس نہیں کر رہا۔ یہ گٹار لے جاؤ۔ یہ جاندار شے کسی طور میرے پاس نہیں رہ سکتی۔ یہ میرے لیے بے کار ہے۔ یہ اپنے

حسین سُر مجھے نہیں دے سکتی۔ اسے لے جاؤ۔ میرے لیے سزا کا حق تمہارے پاس محفوظ ہے۔" اس نے گٹار کی ڈوری میرے گلے میں ڈال دی۔ میں نے بھی زیادہ رد و کد نہیں کی اور گٹار لے کر واپس مڑ گیا۔ کوشلیا میرے قدموں سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ وہ غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔

"کیا بات ہے کوشی؟" میں نے تھوڑی دور چل کر پوچھا۔ اور وہ چونک پڑی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے گہری سانس لی۔

"کیا سوچنے لگی تھیں؟"

"بس انہیں لوگوں کی زندگی کے فلسفے پر غور کر رہی تھی۔ نہ جانے یہ کس طرح زندہ ہیں۔ کیوں زندہ ہیں۔ ہر چیز کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ بظاہر ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے۔ بہر حال چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ گٹار والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا وہ تمہارے شناسا تھے؟"

"نغمہ تمہیں پسند آیا؟" میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کر ڈالا۔

"بہت عمدہ بجاتے ہو۔ دریا کے کنارے بیٹھ کر ایک نغمہ اور سنوں گی تم سے۔"

"ضرور سناؤں گا۔" میں نے گٹار کے تار پر انگلی مارتے ہوئے کہا۔

"میرے سوال کا جواب؟"

"ہاں۔ پشاور میں ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"گٹار کا کیا معاملہ تھا؟"

"گٹار میرا تھا۔ اسے پسند آگیا۔ چنانچہ دوسرے سامان کے ساتھ اس نے گٹار بھی چرا لیا اور خاموشی سے غائب ہو گیا۔ ہاں اس نے اپنی ساتھی لڑکی کو چھوڑ دیا تھا جو بہر حال اس سے دوبارہ آملی ہے۔"

"وہی جو تمہاری گود میں منہ رکھے بیٹھی تھی؟" کوشلیا نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔" میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"خاصی بے تکلف معلوم ہوتی ہے تم سے؟" کوشلیا کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔ جب اس کا ساتھی اسے چھوڑ کر فرار ہو گیا تو وہ بے سہارا رہ گئی۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ تب میں اسے کابل تک ساتھ لایا اور ایک رات جب اس نے محسوس کیا کہ میں کنگال ہو گیا ہوں۔ تو وہ بھی خاموشی سے نکل گئی۔ اب مجھے یہاں ملی ہے۔" میں نے صاف گوئی سے حقیقت بتا دی اور کوشلیا میری شکل دیکھتی رہی۔

ہم دونوں کار کے نزدیک واپس پہنچ گئے۔ چاندنی شباب پر تھی۔ میں کار سے ٹک گیا۔ اور میں نے گٹار سامنے کر لیا۔ کوشلیا نے منہ پھاڑ کر جماہی لی اور پھر بوجھل لہجے میں بولی۔ "نیند آرہی ہے۔ میں کار کی عقبی سیٹ پر سوؤں گی۔ تم چھت پر سو جاؤ۔ تکلیف تو نہیں ہو گی؟"

"تم آرام سے سو جاؤ۔ میری فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ اور کوشلیا ڈکی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے ایک چادر نکال کر مجھے دی اور پھر بولی۔

"گٹار ڈکی میں رکھ دو۔ ورنہ پھر کوئی چرا لے جائے گا۔"

"ہوں۔" میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ میں اس کے بدلے ہوئے موڈ کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن بہرحال ایک رات کی بات تھی۔ میرا اس کا رشتہ ہی کیا تھا اور سچ پوچھا جائے تو میں اس وقت اس کے لیے بار بنا ہوا تھا۔ اسی کے سر کھایا تھا۔ اسی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ مصلحت نے میرے بگڑے ہوئے موڈ کو درست کر دیا۔ گٹار ڈگی میں رکھ دیا گیا اور پھر کوشلیا کار میں داخل ہو گئی۔ اس نے اندر داخل ہو کر تمام شیشے چڑھا لیے اور لیٹ گئی میں دریا کی طرف بڑھ گیا۔ کار کی چھت پر سونا مجھے پسند نہیں تھا۔ یہ بات مجھے پسند نہیں آئی تھی کہ اس نے شیشے چڑھا لئے تھے۔ اسے میرے اوپر اعتبار نہیں تھا۔

دریا کے کنارے چادر بچھا کر میں لیٹ گیا۔ میری نگاہیں چاند پر جمی ہوئی تھیں۔ اور ذہن پھر ماضی کی طرف لوٹ گیا تھا۔ یہی چاند میرے گھر کے آنگن میں بھی نظر آتا تھا۔ چوڑا چکلا آنگن' جہاں دوسری چارپائیاں بھی بچھی ہوئی تھیں۔ بارش کے موسم میں بھیگی بھیگی ہواؤں کے دوش پر تیرتی ہوئی چاندنی رات ہمارے آنگن میں اتر آئی تھی۔ ڈیوڑھی سے حقے کی آواز ابھرتی تھی اور پھر شیرے ملے ہوئے تمباکو کی سوندھی سوندھی بو پورے آنگن میں چراتی پھرتی تھی۔ اس وقت اس چاند کی مسکراہٹ کیسی پاکیزہ ہوتی تھی۔ ہنستا ہوا کیسا بھلا لگتا تھا یہ۔ لیکن آج آج کا چاند۔ داغدار تھا۔ یہ داغ دل کے تھے ضمیر کے یہ داغ بلند ہو کر چاند کی پیشانی پر جا ٹکے ہیں۔ کل اور آج میں بہت فرق تھا۔

چاند سے نگاہیں نہ ملائی گئیں۔ ماضی کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ اگر یہ سیلاب کناروں سے بہہ نکلا۔ تو پھر کبھی نیند نہیں آئے گی۔ روک دو ان طوفانوں کو جھٹک دو ذہن سے ان خیالات کو جو زندگی کا روگ بن گئے ہیں۔ میں نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دریا کی طرف سے چلنے والی ہوائیں بے حد فرحت بخش تھیں۔ ہواؤں کا جادو سر چڑھنے لگا۔ آنکھوں میں بھاری پن پیدا ہو گیا اور پھر آنکھ جھپک ہی رہی تھی کہ پشت پر قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔ میں اچھل پڑا۔ کوئی جانور بھی ہو سکتا تھا۔ پستول بھی میرے پاس موجود نہیں تھا۔ دوسرے لمحے میں نے پلٹ کر دیکھا۔

ایک انسانی جسم میرے بالکل قریب آچکا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ میگاں تھی۔ بکھرے ہوئے بال۔ بہکی بہکی چال۔ چاندنی رات میں وہ ایک چڑیل معلوم ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ حسین ماحول یہ سنسان کنارہ' رومان پرور فضاء' کسی حسین جسم کی طلب پیدا کرنے کے لیے کافی تھے اور میگاں جانی پہچانی تھی۔ اس کے جسم کے خطوط آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ اس گندے لباس کے نیچے ہر ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت دل نے اسے قبول نہ کیا۔ ایک عجیب سی کراہت کا احساس ہوا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"نواز۔" اس نے لرزتی آواز میں پکارا۔

"کیا بات ہے میگاں؟" میں نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا اور وہ رک گئی۔ اس نے بوجھل پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر ایک قدم آگے بڑھ کر بولی: "میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں نواز۔"

"کیسی معافی میگاں؟"

"میں ہوٹل سے تمہیں بتائے بغیر چلی آئی تھی۔"

"اوہ۔ وہ کوئی بات نہیں تھی۔ اوہوتے بہرحال تمہارا پرانا ساتھی تھا اور پھر میں تمہارے کسی بھی پروگرام پر ناراض ہونے کا کیا حق رکھتا ہوں۔ تم دونوں نے یہی پروگرام بنایا تھا تو ٹھیک ہے۔"

"پروگرام۔۔۔۔۔" میگاں سسک پڑی "نہیں نواز۔ غلط فہمی میں مت پڑو۔ ہم لوگوں نے کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا۔ بس میں وہاں سے چلی آئی۔ دربدر پھر رہی تھی کہ وہ پھر مل گیا۔ میں نے ترلوکا کی تعلیمات دہرائیں۔ ترلوکا کا قول ہے کہ انسان کا خمیر خطاؤں سے ابھرا ہے۔ اگر وہ خطائیں نہ کرے تو انسان نہ کہلائے اور جو اس کی خطاؤں کو درگذر نہ کرے وہ بھی انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ بس چاہیے کہ تم خطائیں کرو اور دوسروں کی خطائیں معاف کر کے پھر شیر و شکر ہو جاؤ۔ اسی میں نجات ہے اور اسی پر دنیا کا انحصار میں نے اسے معاف کر دیا۔ اور اب تم بھی مجھے معاف کر دو نواز۔ دیکھو میں سب کو چھوڑ کر تمہارے پاس آئی ہوں۔" وہ میرے قریب آبیٹھی۔

"میں نے تمہیں معاف کر دیا میگاں۔ بس اب جاؤ۔"

"کہاں جاؤں نواز۔ میں آسودگی چاہتی ہوں۔ تمہاری گرم آغوش بس نشہ ہی نشہ ہے۔ آؤ۔ میرا لباس نوچ ڈالو۔ دیکھو میرا جسم تمہیں آواز دے رہا ہے۔" اس نے میری آغوش میں اپنا سر رکھ دیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر دبانے لگی۔ اور نہ جانے کیوں اس کے جسم سے متاثر ہونے کی بجائے میرے ذہن پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی۔ میں نے اس کا سر اپنی گود سے ہٹا دیا۔ اور کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"بدقسمتی سے میں مشرقی ہوں میگاں۔ ہم لوگ سر پھرے ہوتے ہیں۔ جو آنسو آنکھ سے ٹپک جائے اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ تم میرے دل سے اتر گئی ہو۔ ہمیشہ کے لیے۔ میں مرد ہوں۔ کوئی ابوالہوس کتا نہیں ہوں۔ بھاگ جاؤ میگاں۔ تم میرے قابل نہیں ہو۔ میں تمہیں عورت کی حیثیت سے برداشت نہیں کر سکتا۔ بس اب چلی جاؤ۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

"میگاں زمین پر پڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اس کا لباس بے ترتیب تھا رانیں انتہائی حصے تک کھلی ہوئی تھیں۔ سینے کے بٹن بھی کھلے ہوئے تھے اور اس کا شفاف سینہ چاندنی میں کچھ اور چمک رہا تھا۔ گداز رانوں پر جیسے چاندنی کا غازہ چڑھ گیا تھا۔ لیکن مجھے اس وقت اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس نفرت کا جنون چڑھ گیا تھا۔

تب وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میں جاؤں نواز؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ فوراً چلی جاؤ۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہارے قدموں میں سو جاؤں؟" اس نے پوچھا۔

"میں تمہیں اٹھا کر دریا میں پھینک دوں گا۔" میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور وہ سہم گئی۔ تھوک نگلنے کی ٹرچ ٹرچ دو بار سنائی دی تھی۔ پھر اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

"تمہارے پاس تھوڑی سی چرس ہو گی؟" میرا دل چاہا کہ ایک زوردار قہقہہ لگاؤں۔ بالآخر وہ

اپنی اصلیت پر آ گئی تھی۔

"ہاں۔ موجود ہے۔" میں نے جیب سے چرس بھری سگریٹوں کا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔

"تھینک یو ڈیر۔ تھینک یو۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ تھینک یو۔ تھینک یو۔" اس نے پیکٹ لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ واپسی کے لیے مڑ گئی لیکن اس انداز میں پلٹ پلٹ کر دیکھتی جارہی تھی، جیسے میں اسے آواز دوں گا۔ پھر جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچنے لگا کیا میں نے برا کیا ہے۔ کیا اس حسین چاندنی کو اور حسین نہیں بنایا جاسکتا۔ کیا اس کا لباس سے بے نیاز جسم اس رات کو مزید حسن نہیں بخش سکتا۔ بے شک وہ حسین تھی لیکن اس کا کردار۔ اس وقت میں نے ایک قیمتی بات سوچی۔ ظاہری حسن متاثر ضرور کرتا ہے۔ لیکن کردار بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کردار حسن پر کالک پھیر دیتا ہے۔ حسن اگر بے کردار ہو تو.....

لیکن۔ ابھی اتنا ہی سوچنے پایا تھا کہ دوسری طرف سے گٹار کے تار کی آواز گونجی۔ اور میں ایک بار پھر اچھل پڑا۔ وحشت زدہ ہو کر دیکھا۔ کوشلیا مسکرا رہی تھی۔ میرا گٹار اس کے ہاتھ میں تھا۔ حالانکہ میرے سامنے وہ ساڑھی میں کار کی عقبی سیٹ پر گئی تھی۔ لیکن اب وہ ایک خوبصورت سلیپنگ سوٹ میں ملبوس تھی۔ اس نے بال سمیٹ کر پیچھے باندھ لئے تھے۔ اور اس انداز میں وہ نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک سبک مسکراہٹ تھی۔

"بڑے وعدہ خلاف ہو۔" اس نے ناز سے کہا۔ میں صرف اسے دیکھتا رہا۔ کچھ کہہ نہ سکا۔ تب اس نے پھر کہا۔ "تم نے ایک نغمہ سنانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں۔ کیا تھا۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"پھر۔ پورا کیوں نہیں کیا؟"

"وعدہ خلافی بری بات ہے۔" وہ میرے قریب آ بیٹھی۔ اور پھر اس نے گٹار میری گود میں رکھ دیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہاں کب سے ہو؟"

"ایک سائے کو تمہارے قریب دیکھ کر آ گئی تھی۔ میں نے سوچا وہ تمہیں نقصان نہ پہنچا دے۔"

"شکریہ۔" میں نے مختصراً کہا۔

"نغمہ نہیں سناؤ گے؟"

"سناؤں گا۔" میں نے کہا۔ اور گٹار اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ میری انگلیاں کام کرنے لگیں اور دھیمے دھیمے سروں میں ایک حسین نغمہ ابل پڑا۔ مجھے خود بھی یقین نہیں تھا کہ میں اتنا اچھا نغمہ بجا سکوں گا۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ گٹار اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ اسی لیے اس آواز میں اتنا سوز پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مبہوت سی بیٹھی تھی۔ چاندنی کی بارش ہو رہی تھی۔ چاند کے داغ مٹ گئے تھے۔ اس کی ضیاء بڑھ گئی تھی۔ رات آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ دریا ساکت ہو گیا تھا۔ نغمہ ختم

ہو گیا۔ فضا ساکت ہو گئی۔ وہ بھی ساکت تھی۔ کئی لمحے تک اس کے جسم میں جنبش نہ ہوئی۔

پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ "نواز۔" اس نے سانس کے دوران پکارا۔ اس کی آواز کی لرزش بہت حسین تھی۔

"پسند آیا نغمہ؟" میں نے گٹار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"تم جادوگر ہو۔" وہ گہری سانس کے درمیان بولی۔

"ایک بار پھر شکریہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم میں اور ان میں یہی فرق ہے اور ہم اس فرق پر فخر کر سکتے ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے چادر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں چاند سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے اس کے اس جملے کی وضاحت طلب نہیں کی۔ وہ میرے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر خود ہی بولی۔

"میں نے اس کی اور تمہاری گفتگو سنی تھی۔ کیا تم اس حقیقت سے انکار کرو گے کہ ہم اجنبی تھے۔"

"ہاں۔ یہ حقیقت ہے۔"

"تم میرے ہم سفر ضرور تھے۔ لیکن میں تمہاری فطرت کے بارے میں کیا جان سکتی تھی۔"

"یقیناً۔"

"لیکن۔ اس لڑکی نے میری مدد کی۔ میں نے اسے تمہارے زانو پر سر رکھے۔ دیکھا تو میرا موڈ خراب ہو گیا۔ بس یوں سمجھ لو۔ عورت ہوں۔ حالانکہ چند گھنٹوں کا ساتھ اتنا قریب نہیں لاتا۔ بس ذہن پر الجھن سوار تھی۔ شاید تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ناراض ہونا؟ اس نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔ میری کنپٹیوں میں خون ٹھوکریں مارنے لگا! اب اتنا ناتجربہ کار نہیں تھا عورت کی نگاہیں نہ پہچان سکتا تھا۔ وہ متاثر ہو گئی تھی۔ ماحول اس پر اثر انداز ہو گیا تھا۔

"نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

"تم نے اسے آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو کہا تھا۔ حالانکہ کافی حسین تھی۔"

"فطرت اگر گھناؤنی ہو۔ تو ظاہری حسن چھپ جاتا ہے۔"

"درست کہا۔ بہرحال میں اپنے سلوک کی معافی چاہتی ہوں۔ میری نگاہوں میں تمہاری وقعت بڑھ گئی ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن میں پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ تاہم میں نے اس کی بات کا جواب ضرور دیا۔

"شرمندہ نہ کرو کوشی۔ تم نے میرے اوپر احسان کیا ہے۔ تم نے جو کچھ میرے لیے کیا وہ آپ کے ہر سلوک پر بھاری ہے۔"

"کچھ دن ساتھ دے سکو گے؟"

"کیوں نہیں۔"

"تب آؤ۔ ہم ایک دوسرے پر مکمل اعتماد کر لیں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اور میں بے ساختہ اس کے نزدیک جا گرا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال سمیٹے اور پھر گردن اٹھا کر اپنے

ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

"کوشی۔" میں نے جذبات سے لبریز آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے میرے الفاظ اپنے ہونٹوں میں بھینچ لئے۔ اس نے دونوں ہاتھ میری گردن میں حمائل کردیئے۔ اور میرے سر کو نیچے جھکائے ہوئے میرے سینے پر سوار ہوگئی۔ اب میں بھی جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں اس کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈال کر اسے سینے سے بھینچ لیا اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

اب تک وہ بند مٹھی تھی۔ لیکن کھلی تو ایسی کھلی کہ پھر کوئی پردہ نہ رہا۔ اس کی محبت اس کے جذبات پھٹ پڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

مشرق مشرق ہے میری زندگی کی پہلی عورت مشرقی نہیں تھی۔ میری مراد اس عورت سے ہے جس سے مل کر میں عورت کی کشش اور کائنات کی پر اسرار سرگوشیوں سے روشناس ہوا۔ جوانی کے حسین اشاروں کو سمجھا۔ اس سے پہلے بھی چند لڑکیاں میری زندگی میں داخل ہوئی تھیں۔ جن کے بارے میں مختصراً آپ کو بتا چکا ہوں' لیکن اس وقت میں رموز فطرت سے ناواقف تھا۔ ملائم ملائم چہروں اور حسین خدوخال والی یہ مخلوق مجھے اچھی تو لگتی تھی' لیکن اس کی پوشیدہ کشش سے میں بالکل ناواقف تھا۔ بلکہ چند مواقع بھی مہیا ہوئے تو اپنی عدم واقفیت کی بناء پر ان سے مستفیض نہ ہو سکا۔

بہرحال زندگی کی پہلی عورت وہ غلیظ ہپی لڑکی تھی۔ جسے میں نے حاصل کائنات سمجھ لیا تھا۔ میں نے اس کے استعمال شدہ جسم کی کشش کو حرف آخر سمجھ لیا تھا۔ لیکن بہت جلد میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ اسی ساخت کی دوسری لڑکیوں نے کچھ اور عقدے حل کئے۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ تب میرے ذہن نے اپنے وطن کی سوندھی مٹی سے تیار شدہ مخلوق کے بارے میں غور کیا تھا۔ بلاشبہ یہ مخلوق اس سفید مخلوق سے کہیں زیادہ حسین ہے لیکن میں اس کی اندرونی کیفیت سے ناواقف تھا۔ سفید خشک چہرے جاذب نگاہ ضرور ہوتے تھے۔ بدبو دار لباس کے نیچے کے جسم ملائم اور پرکشش ضرور ہوتے تھے' لیکن ایک طلب باقی رہ جاتی تھی۔ میں اس طلب کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ لیکن پھر درفشانہ ملی۔ مشرق کا پہلا پھول گو وہ پیشہ ور تھی لیکن ان سفید چھپکلیوں سے کہیں زیادہ معصوم اور کشش انگیز۔ اس کے اندر گھریلو پن ملتا تھا۔ اذیت طلبی نہیں تھی اور ہیجان نہیں تھا بلکہ وہ سنسان پہاڑوں میں انسان کی ہوس انگیز نگاہوں سے دور ایک گنگناتے ہوئے جھرنے کی مانند تھی جس کی پاکیزہ جوانی خاموشی سے بہتی رہتی ہے۔ اسے داد حسن کی طلب نہیں ہوتی۔ وہ تو فطرت کا تقاضا پورا کرتا ہے۔ اپنے حسن سے بے نیاز معصوم ـــــــ اور درفشانہ کے ساتھ گذرنے والی پہلی رات نے وہ طلب پوری کردی جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ بلاشبہ درفشانہ ایک بھرپور عورت تھی۔ حالات نے اسے سڑکوں پر لا ڈالا تھا۔ لیکن اس کی فطرت کا حسن باقی تھا۔ میں درفشانہ کو کھو کر خوش نہیں تھا۔ دل کے کسی گوشے میں ایک ننھی سی چنگاری روشن تھی۔ اگر میرے حالات درست ہوتے۔ اگر میں خود راہوں کا پتھر نہ ہوتا۔ اگر میری کوئی حیثیت ہوتی تو میں

درفشانہ کو حاصل زندگی سمجھ لیتا۔ اور اسے خود سے کبھی جدا نہ کرتا۔ لیکن خود میری کوئی حیثیت نہیں تھی میں خود دوسروں کے سہاروں پر جی رہا تھا۔ پھر میں اسے کیا سہارا دیتا۔

میں نے اپنی زندگی کے کسی پہلو کو راز نہیں رکھا۔ میں نے اپنی شخصیت سے ایک ایک پردہ ہٹا دیا ہے۔ میں اپنی پستی کی یہ داستان آپ کو اس لئے نہیں سنا رہا کہ آپ اس کے رنگین پہلوؤں پر چٹخارے لیں۔ میری داستان کو زیادہ دلچسپی سے پڑھیں۔ بلکہ جب میں اپنی سوانح حیات لکھنے بیٹھا ہوں تو ایک ایماندار انسان کی طرح زندگی کا ایک ایک راز بے نقاب کر رہا ہوں تاکہ میرے ذہن پر کوئی بوجھ باقی نہ رہے۔ میں جن حالات سے گذر چکا تھا۔ ان کے بعد خود کو کوئی شریف انسان کہلانے کا مستحق نہیں سمجھتا تھا۔ کسی کی ہمدردیاں بھی نہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ذہن کے تاریک گوشوں میں کبھی کبھی شرافت کا خون جوش مارنے لگتا تھا۔ اور میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ایک شریف انسان ہوتا ایک پرسکون زندگی گذارتا۔ جس میں ایک سادہ سا گھر' ایک حسین بیوی' چند معصوم بچے ہوتے' لیکن جب خود پر غور کرتا۔ تو ان حسین تصورات سے بہت دور۔ ایک ویران صحرا میں خاردار جھاڑیوں کے درمیان۔ خوفناک حشرات الارض میں گھرا ہوا ایک انسان نظر آتا۔ جس کے ہونٹ خشک ہوتے' جسم بے جان ہوتا۔ اور وہ پیاسی نگاہیں آسمان پر گاڑے ہوتا۔ شاید ان قطروں کا منتظر جن کے بارے میں اسے یقین ہوتا کہ وہ کبھی نہ برسیں گے۔

تب میں جھنجھلاہٹ میں یہ تصور فراموش کر دیتا اور اپنی اسی زندگی پر قانع ہو جاتا۔ جو میرے سامنے تھی۔ اور درفشانہ بھی اس جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئی تھی۔ میرا دل کئی بار اس کے لئے دھڑکا تھا۔ کاش یہ گوشت کا بے حقیقت لوتھڑا میرے اختیار میں ہوتا۔ اس کی احمقانہ خواہشات پر میں اس کی گردن دبا دیتا۔ حالات کی نزاکت میری بے بسی کا اسے کوئی احساس نہیں تھا۔ بہرحال درفشانہ کو بھلانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ کوشلیا مجھے مل گئی۔ کوشلیا جس انداز میں مجھے ملی تھی اس نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔ میں نے فوری طور پر اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا کہ وہ بحیثیت عورت مجھے مل جائے۔ دراصل صورتحال اس بار مختلف تھی۔ اس سے پہلے کی لڑکیاں میرے رحم و کرم پر تھیں اور اس بار میں کوشلیا کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ میرے ساتھ احسانات کر رہی تھی۔ ذہن میں چھپے ہوئے مرد نے جاگنے کی جرات نہیں کی تھی۔ حالانکہ ماحول بڑا رومان پرور تھا۔ تب میگاں نے میری مدد کی مجھے یقین ہے اگر میگاں اس طرح نہ آتی اور اتفاق سے میں اسے حقارت سے ٹھکرا نہ دیتا تو کوشلیا بے خود ہو کر خود کو اس طرح میرے حوالے نہ کر دیتی۔ ہندوستانی عورت کی فطرت سب سے جدا ہے۔ اس کی پسند اور خواہشات بڑی انوکھی ہیں۔ لیکن جب اس میں عورت ابھرتی ہے تو وہ ایک ایسا سیلاب ہوتی ہے جس کے آگے بند باندھنے کا تصور حماقت ہے۔

یہی حالت اس وقت کوشلیا کی تھی۔ اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا اور یہ دوسری مشرقی عورت تھی' جو بلاشبہ کشش میں درفشانہ سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کا سانولا جسم سیماب صفت تھا۔ اس حسین پیکر کے پیچ و خم کائنات کے ذرے ذرے کی تفسیر تھے۔ اس کے الجھے الجھے سانسوں کی مہک' اس کی سیاہ آنکھوں کی شراب' اس کے سلگتے ہوئے ہونٹوں کی نمی ہر چیز ایک مکمل طلسم تھی'

کسی شاعر نے شاید کوشلیا ہی کو دیکھ کر کہا تھا کہ۔

"رنگ، خوشبو، صبا، چاند، تارے، کرن، پھول، شبنم، شفق، آب جو، چا
ان کے معصوم پیکر کی تخلیق میں، حسن فطرت کی ہر چیز کام
کائنات کی یہ حسین تفسیر میرے بازوؤں میں مچلتی

دریا کی لہروں پر چاندنی تڑپ رہی تھی۔ چاند ہماری سرگوشیوں کو سننے کے لئے ہمارے بالکل قریب آگیا تھا۔ دریا کے پانی کو چوم کر آنے والی ہوائیں ہمارے کانوں کے قریب سے دلچسپ فقرے کہتی ہوئی گذر رہی تھیں۔ ان کی آوازوں میں جذبات کی سسک تھی اور پھر چاند آسودہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا۔

کوشلیا کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ اس نے ایک چادر اپنے جسم پر ڈال لی تھی۔ شاید وہ چا
کی بیباک نگاہوں سے شرما گئی تھی۔ اس کا مہکتا ہوا سر میرے بازو پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے جسم کی حرارت میرے جسم میں پیوست تھی۔ اور میں فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ کافی دیر اسی طرح گز
گئی۔ نیند کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ ہم دونوں جاگ رہے تھے۔ تب کوشلیا کی آواز ابھری۔

"نواز۔"

"ہوں ــــــ" میں نے آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کو دیکھا اس کے ہونٹ خ
تھے۔ چہرے پر جذبات رقصاں تھے۔

"تم میری زندگی میں پہلے مرد ہو۔"

"مجھے اعتبار ہے۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"جس دور میں، میں سانس لے رہی ہوں، اس کے تقاضے پرانے دور کی مخالفت کر
ہیں۔ لیکن بعض اوقات ہم ماضی دوہرانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہم اس فطرت کو کیسے بدل سکتے ہ
صدیوں سے ہماری میراث ہے اور صدیوں کی میراث یوں تو نہیں ٹھکرائی جاتی۔"

"میں نہیں سمجھا کوشلیا۔" میں نے اسے اور قریب کرتے ہوئے کہا۔

"میں ہندو ہوں۔ ہمارے دھرم میں پہلا مرد۔ آخری مرد ہوتا ہے۔" اس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں ــــــ" میں اس کی بات کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا

"کیا تم میری زندگی کے آخری مرد بنو گے۔" اس نے پوچھا اور میں چونک پڑا۔ اس کی
میری سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ مشرق کی آواز تھی۔ یہ درفشانہ بول رہی تھی۔ وہ بے سہارا لڑکی
الفاظ کو زبان نہیں دے سکی تھی۔ البتہ اس کی آنکھوں نے بارہا یہ خواہش کی تھی۔ میں نے د
کی آواز دل کے قریب محسوس کی تھی۔ دل اس آواز پر پسیجا بھی تھا۔ لیکن پھر میں نے دل کو
ڈانٹ دیا تھا۔ اسے حالات کا احساس دلایا تھا۔ اور دل نے اداس ہو کر مایوسی سے سر جھکا لیا
الفاظ پھر دہرائے جا رہے تھے۔ لیکن آواز میں فرق تھا۔ وہ ایک مجبور اور بے سہارا عورت ک
تھی۔ اور یہ ایک صاحب اقتدار عورت کی آواز تھی۔ جو میرے بغیر بھی گذارا کر سکتی تھ

موجود حالات میں تو خود مجھے اس کی ضرورت تھی اگر وہ ناراض ہو جاتی تو میرے لئے پریشانیاں..... پیدا ہو جاتیں۔ جب میں نے درفشانہ کو نہیں اپنایا تھا تو کوشلیا تو میری ہم مذہب بھی نہیں تھی۔

مذہب میرے ذہن پر ایک اور ضرب لگی۔ کیا اب بھی مذہب سے میرا تعلق رہ گیا ہے۔ کیا میں اس مقدس لفظ سے خود کو منسلک کر سکتا ہوں۔ اپنے عمل سے جس چیز کا میں نے کھلے عام مذاق اڑایا ہے کیا اس میں اب بھی میری کوئی گنجائش ہے۔ حالات نے مجھے مذہب سے تو بہت دور پھینک دیا تھا۔ اب میرا کیا مذہب۔ ہاں درفشانہ کوشلیا سے زیادہ میرے قرب کی مستحق تھی۔ کوشلیا کے بارے میں تو میں پوری تفصیل بھی نہیں جانتا تھا۔ نہ جانے اس کی کیا حیثیت ہے سیاح ہے تو اچھے حالات ہی رکھتی ہوگی۔

دل اس کے بارے میں، مخلص تھا۔ وہ مجھے پسند بھی تھی۔ لیکن ظاہر ہے میں وہ نہیں کر سکتا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ میں تو دوسروں کا غلام تھا۔ چنانچہ ضمیر کے خلاف، مصلحت کے پیش نظر، میں نے تھوڑی سی عیاری سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا اور ایک گہری سانس لی۔

"بہت گہری سوچ میں کھو گئے۔ میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔" کوشلیا نے کہا۔

"تو بتاؤ۔" میں نے اس کے رخسار چومتے ہوئے کہا۔

"تم نے اپنا وطن چھوڑتے ہوئے کچھ پروگرام بنائے ہوں گے ممکن ہے ان میں کسی جیون ساتھی کی گنجائش نہ ہو۔ لیکن میں تم سے ایک اور بات کہوں گی۔"

"کہہ دو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم بھی آوارہ گرد ہو۔ ہم اپنا مشن جاری رکھیں گے ہمیں صرف ایک عہد کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ اب میں بھی تمہاری زندگی کی آخری عورت بن جاؤں گی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہوں گے۔ نہ میرے راستے میں کوئی مرد آئے گا نہ تمہارے راستے میں کوئی عورت۔ ہم اپنا کام جاری رکھیں گے۔ دوسری بات دھرم کی آتی ہے۔ ہمارے دھرم ایک دوسرے سے نہیں ٹکرائیں گے۔ اگر تمہارے دل میں دھرم کا خیال آئے تو تم اپنے دھرم پر قائم رہنا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور نہ مجھے میرے دھرم سے ہٹانا۔ ہم اپنے بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ بڑے ہو کر وہ جس دھرم کو پسند کریں گے اپنا لیں گے ہم میں سے کوئی مانع نہ ہوگا۔"

اس کے اس طویل پروگرام پر مجھے ہنسی آگئی۔ اور وہ بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے گھورتی ہوئی بولی۔ "ہنس کیوں رہے ہو۔ مشرقی لڑکیاں ایسی ہی پاگل ہوتی ہیں۔"

"میں تمہارے اس پاگل پن کی دل سے قدر کرتا ہوں۔" میں نے اسے سینے سے بھینچتے ہوئے کہا۔ اور اس نے اپنی دونوں بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ وہ آہستہ سے کھسکی اور چادر اس کے جسم سے ہٹ گئی۔ اس نے اپنا آدھا بوجھ میرے سینے پر ڈال دیا۔ اور میری تھوڑی پر تھوڑی رکھتے ہوئے بولی۔

"میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ میں نے خود کو تمہارے سامنے کھول دیا ہے تو پھر اس کے تمام راز بھی تمہارے سینے میں منتقل کر دوں گی۔ میں تمہیں بہت زیادہ

چاہنے لگی ہوں نواز۔"

"کاش۔ میں تمہاری چاہت کے جواب میں وہ سب کچھ دے سکتا جس کی تمہیں آرزو ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا' لیکن وہ جذبات کی رو میں میرے الفاظ کو نہ سمجھی۔ اور میرے ہونٹوں پر ہونٹ رگڑتے ہوئے بولی۔

"مجھے سب کچھ مل گیا ہے نواز۔ بس مجھے تمہارے سوا اور کچھ نہیں چاہئے۔ میں ٹھاکرے سے کہہ دوں گی کہ اب......"

لیکن اس کا حملہ ادھورا رہ گیا۔ گٹار کے تار کی پرسوز آواز گونج اٹھی تھی۔ ہم دونوں چونک پڑے۔ گٹار کافی دور رکھا ہوا تھا۔ کوئی چیز بھی اس پر نہیں لگی تھی۔ پھر کس نے اس تار کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے جلدی سے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اور ------ تھوڑے فاصلے پر' گٹار کے قریب' گردن جھکائے بیٹھی میگاں نظر آئی۔ کوشلیا سہم سی گئی۔ اس نے برق کی طرح میرے سینے سے اتر کر چادر اپنے جسم سے لپیٹ لی' میں بھی اٹھ گیا۔ اور میں نے بھی اپنے جسم کو ڈھک لیا۔

میگاں ہم دونوں سے لاپرواہ بیٹھی ہوتی تھی۔ گٹار اس کے زانو پر رکھا ہوا تھا۔ اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ میرے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

"تم پھر آ گئیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ اور جواب میں اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ شاید وہ نشے میں نہیں تھی۔ یا شاید وہ بہت زیادہ نشے میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی جلن تھی۔ شیشے کی طرح چمک رہی تھیں وہ آنکھیں اور غضب کا تیکھا پن تھا ان آنکھوں میں۔

لیکن میں ان سے مرعوب نہ ہوا۔ اب مجھے میگاں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ "جواب دو تمہیں یہاں آنے کی جرات کیسے ہوئی۔؟" میگاں نے آہستہ سے گٹار نیچے رکھ دیا۔ اور پھر وہ کھڑی ہو گئی۔ اسی طرح مجھے گھورتی رہی پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو جنبش ہوئی۔ اس نے اپنا اوپری لباس نوچ دیا۔ اور پھر زیریں لباس بھی اتار دیا۔ چاندنی میں وہ میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چمکدار جسم میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں اس کے جسم کے ایک ایک نقش سے بخوبی واقف تھا۔ میگاں میرے چہرے پر اس حرکت کا رد عمل تلاش کرنے لگی لیکن ------ میں پوری طرح آسودہ تھا۔ اب اس کے جسم میں میرے لئے کشش نہیں تھی اس سے ہزار گناہ زیادہ پرکشش جسم میری دسترس میں تھا۔ میں اسی لاپرواہی سے اسے دیکھتا رہا۔

"میں ------ میں پیاسی ہوں نواز۔ میں اپنی پیاس بجھانے آئی ہوں۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"اوہ ------ تمہارا ساتھی۔ اوہوتے شاید نشے میں اوندھا پڑا ہو گا۔ لیکن تمہیں اس کی فکر ------ کیا دوسرے کسی نوجوان نے بھی تمہارا جسم قبول نہیں کیا" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں تمہاری گرم آغوش حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ سب سردی کھائے ہوئے کتے ہیں ان کے جسموں میں حرارت نہیں ہے۔"

"میں ٹھیکیدار نہیں ہوں محترمہ۔ واپس چلی جایئے ورنہ میں آپ کو دھکے دے کر بھگا دوں گا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے نواز۔ میں تمہارے چہرے کو بگاڑ دوں گی۔ میں عورت ہوں۔ تم میری نسوانیت کی توہین نہیں کر سکتے۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن کسی عورت کے سامنے اپنے پندار کی توہین نہیں برداشت کر سکتی۔ سمجھے۔ تمہیں اس عورت کے سامنے میرے جسم کو قبول کرنا ہو گا۔ یہ مجھ سے زیادہ حسین نہیں ہے۔ میں اس سے کم دلکش نہیں ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر میرے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑ لئے۔ وہ ایک بھوکی بلی نظر آ رہی تھی۔

لیکن میرے ایک معمولی سے جھٹکے سے وہ دور جا پڑی۔ ------ "تم بھول رہی ہو میگاں۔ میں یورپ کا ابوالہوس کتا نہیں ہوں۔ ہم مشرقی مرد اپنی عورت کو صرف اپنا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور پھر تم سے میرا کیا واسطہ میں نے تو صرف تمہارے اوپر رحم کھایا تھا' تمہاری مدد کی تھی۔ تم نے اس مدد کا مجھے معاوضہ دے دیا تھا۔ سودا ختم ہو گیا۔ دوکاندار اور گاہک کا کیا رشتہ ------ تم بھی تو مال فروخت کر کے قیمت وصول کر کے خاموشی سے چلی آئی تھیں اب اتفاق سے یہاں مل گئیں تو اپنا حق کیوں جتا رہی ہو۔"

میگاں میرے جھٹکے سے اتنی زور سے گری تھی کہ اسے خاصی چوٹ آ گئی تھی۔ اس سے ایک دم اٹھا بھی نہ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا لئے اور پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔ "میں ------ میں نے تہذیب و تمدن سے رشتے توڑ دیئے تھے نواز ------ میں دنیا سے بیگانی ہو گئی تھی۔ میں نے اخلاقی اقدار کو مذاق سمجھ لیا تھا۔ میں ------ میں نے ترلوکا ------ کی تعلیمات کو حقیقت سمجھ لیا تھا۔ لیکن ترلوکا ------ نہیں جانتا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا۔ انسان دنیا کو مذاق سمجھ سکتا ہے۔ ہر چیز کو بے حقیقت سمجھ سکتا ہے لیکن وہ خود اپنی ذات سے بیگانہ نہیں ہو سکتا۔ جو جذبے اس کی ذات میں پنہاں ہیں وہ ہر حال میں اس پر قادر ہیں وہ اس پر حکومت کرتے ہیں ان سے سرکشی ممکن نہیں ہے۔ یہ بات مجھ پر واضح ہو گئی ہے اس ایک رات میں۔ میں تمہیں چاہنے لگی ہوں نواز ------ مجھے نہ ٹھکراؤ مجھے اپنا لو میں خود کو بدل دوں گی۔ میں چرس نہیں پیوں گی۔ انجکشن نہیں لوں گی۔ میں معاشرے کی پسندیدہ ہستی بن جاؤں گی۔ مجھے اٹھا لو نواز۔ مجھے اپنے چوڑے سینے سے لگا لو۔ مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لو۔ میں ڈوبنا نہیں چاہتی۔ یہ ماحول فریب ہے۔ ہم سب خود کو فریب دے رہے ہیں۔ گوشت پوست کے ان پنجروں کو کچھ احکامات دیئے گئے ہیں۔ وہ ہر حال میں ان احکامات کے تابع ہیں ان احکامات کی خلاف ورزی وقتی تسکین مہیا کر دیتی ہے لیکن ہوش آتا ہے تو ہم خود کو لٹا لٹا محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میں۔ میں اب اس بے خودی کے ماحول میں نہیں جانا چاہتی۔ میں ایک لوٹی ہوئی عورت ہوں۔ میری شخصیت قتل ہو چکی ہے۔ میرا پندار ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔"

وہ سسکتی رہی۔ کوشلیا اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ گئی تھی میرے اندر کا انسان کھول رہا تھا۔ مجھے اپنا جسم مضبوط رسیوں میں جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی گھٹن تھی۔ ایک پر

اسرار سی بے کلی تھی۔ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ میرے دماغ میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی دل نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

اور پھر ----- ایک گرم لاوا دل سے دماغ کی طرف بڑھا۔ چڑھائی تھی لیکن طوفان اتنا تیز تھا کہ دماغ روشن ہو گیا۔ چنگاریاں اڑنے لگیں ----- ٹوٹی ہوئی عورت ----- اپنے پندار کا شکار ----- لیکن میں کیا ہوں۔ میں بھی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہوں۔ اگر میں کوئی شریف نوجوان ہوتا۔ اگر میں کسی دفتر کا کوئی باعزت کلرک ہوتا اور وہ میرے سامنے آتی۔ اسی طرح چور چور۔ تو میں اس کے تمام زخموں کو بھر دیتا۔

لیکن اب تو میرے جسم کا ہر حصہ لہولہان تھا۔ میرا پورا وجود ایک زخم تھا دنیا نے مجھے یہ شکل دی تھی۔ میں نے خود تو یہ سب کچھ نہیں چاہا تھا۔ مگر میں اس دنیا سے کیوں تعاون کروں۔ میں کیوں ان ٹوٹے ہوئے انسانوں کو گلے لگاؤں۔ سب کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ انہیں بھی ویسی سزا ملنی چاہئے جو مجھے مل رہی ہے۔

میں نے کوشلیا کی طرف دیکھا۔ کوشلیا عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں ہوش و حواس میں واپس آ گیا۔ میں نے کوشلیا کا بازو پکڑا اور پھر ----- دریا کے کنارے کی طرف چل پڑا۔ عقب سے میگاں کی دلدوز کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ "نواز ----- نواز ----- نواز -----" ہر کراہ میرے دل میں چبھ رہی تھی۔ لیکن میں اس چبھن کو برداشت کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ آواز آنی بند...... ہو گئی۔ تب میں نے سکون کے گہرے گہرے سانس لئے۔ قدموں کے نیچے ہری ہری گھاس تھی۔ اس کی خوشگوار خنکی ذہن تک پہنچ رہی تھی۔ میگاں کی آواز کی بازگشت اب بھی میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے ذہنی ہیجان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے خود کوشلیا میں گم کر دینے کا فیصلہ کیا ----- میں نے کوشلیا کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اسے اتنی زور سے دبایا کہ اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں۔ اس کے ہاتھوں میں سنبھلی ہوئی چادر ڈھلک گئی۔ اور اس کا جسم عریاں ہو گیا۔ میں اس سے الگ ہٹ گیا اور اس کے دلکش جسم پر نگاہیں گاڑ دیں اور...... میرے اس طرح گھورنے سے کوشلیا کسمسانے لگی۔ اس نے اپنا جسم چرانے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں نے ایک وحشی درندے کی طرح اسے گھاس پر گرا دیا۔ اور اس کا خون پینے لگا۔ اور جب تازہ لہو سے میری پیاس بجھ گئی تو میں بے سدھ ہو کر وہیں لیٹ گیا۔ آنکھوں کو غنودگی کا احساس ہوا اور گہری نیند آ گئی۔ نہ جانے کیوں۔ نہ جانے کیسے۔؟

دوسری صبح آنکھ کھلی تو کوشلیا جاگ چکی تھی۔ وہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر لباس پہنے بیٹھی تھی اس کے بالوں سے شبنم ٹپک رہی تھی۔ اور آنکھوں میں وہی شرمائی ہوئی سی کیفیت تھی۔ جیسے کسی نویلی دلہن کی سہاگ رات کی صبح۔! میں نے چونک کر اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ میرے جسم سے چادر لپٹی ہوئی تھی۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور کوشلیا کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔

"تو تم نے غسل کر لیا۔ میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ تم بھی اٹھو۔ دریا کا پانی بہت ٹھنڈا لیکن بے حد فرحت بخش ہے۔" اس نے کہا اور میں چادر اچھی طرح جسم پر درست کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کپڑے میرے نزدیک تہہ کئے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے ایک ہاتھ سے چادر سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے کپڑے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تم بھی آؤ ----- ایک بار اور سہی -----" کوشلیا نے مسکراتے ہوئے گردن جھکالی۔ اس کی شخصیت بالکل بدل گئی تھی۔ وہ تیکھا پن نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا جو اس کی شخصیت کا حصہ تھا۔ اس کی جگہ ایک عجیب سی نرمی نے لے لی تھی۔ "آؤ گی!؟" میں نے پھر پوچھا۔

"لاج آتی ہے۔" اس نے گردن جھکائے ہوئے کہا ----- اور پھر جلدی سے بولی۔ "آپ نہالیں۔ میں ناشتہ تیار کرتی ہوں پھر ہم یہاں سے چلیں گے۔"

"اچھا۔!" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور آگے بڑھ گیا ----- کوشلیا اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ دریائے بلمند کا...... پانی ناخوشگوار نہیں تھا۔ میں اس میں اتر گیا۔ میرے ذہن میں کوشلیا کا شرمایا چہرہ بسا ہوا تھا۔ یہ چہرہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ یہ انداز انوکھا اور دلکش تھا۔ احمق لڑکی نے نہ جانے مجھ سے کون کون سی امیدیں قائم کر لی ہیں۔ میں اس کا ساتھ کس طرح دے سکوں گا۔ میری زندگی دوسروں کی پابند ہے۔ میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔ ٹھیک ہے۔ اگر وہ مالی طور پر مستحکم ہے یا پھر ہم دونوں آوارہ گردوں کی طرح زندگی گذار سکتے ہیں۔ لیکن مجھے اس کے مالی استحکام سے کیا۔ اب وہ وقت نہیں رہ گیا تھا کہ میں ان لائنوں پر سوچتا۔ اب تو صورت حال ہی دوسری تھی۔ کوشلیا کو دھوکہ دے کر میرا دل دکھ رہا تھا لیکن میں اس کے لئے مجبور تھا۔

تب مجھے کرسٹی، میگاں اور دوسری بہت سی لڑکیاں یاد آئیں۔ یہ لوگ بھی میرے ساتھ اس طرح رہی تھیں کہ میں نے ان سے بہت سی امیدیں قائم کر لی تھیں اور پھر انہوں نے خاموشی سے مجھے چھوڑ دیا۔ اُفوہ ----- کیا مجھ میں اور ان میں کوئی فرق تھا۔ وہ حالات سے مجبور ہو کر میرے پاس آئی تھیں۔ اور پھر چلی گئیں۔ میں حالات سے مجبور ہو کر کوشلیا کے ساتھ ہوں۔ اور کسی دن خاموشی سے اسے چھوڑ دوں گا۔ ممکن ہے ان لڑکیوں کی مجبوریاں بھی مجھ سے مختلف نہ ہوں۔ پھر مجھے ان کے ساتھ وہ سلوک کرنے کا کیا حق تھا' جو میں کر چکا ہوں۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے ان پر زیادتی کی ہے۔ مجھے اپنی اور ان کی مجبوریوں کو یکساں سمجھنا چاہئے تھا۔

مجھے شدت سے ان تمام باتوں کا احساس ہوا اور میں اداس ہو گیا۔ میں نے سوچا میگاں مجھے مل جائے تو میں اس سے معافی مانگ لوں۔ ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ کھنڈرات میں واپس جاؤں۔ میگاں کو اٹھا کر سینے سے لگا لوں۔ اس سے اپنے رات کے الفاظ کی معافی مانگ لوں اور اسے بتاؤں کہ میگاں میں بھی تمہاری طرح مجبور ہوں۔ ہم کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ بلکہ ایک معنی میں تم مجھ سے عظیم ہو۔ تم نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر کچھ فیصلے کر لئے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ اگر میں تمہیں اپنا لوں تو تم یہ زندگی چھوڑ دو گی۔ چرس ترک کر دو گی۔ ایک شریف عورت بن کر زندگی گذارو گی' لیکن میں درفشانہ کے لئے یہ سب کچھ نہیں کر سکا۔ میں نے اس بے سہارا لڑکی کو تنہا

چھوڑ دیا۔ میں کوشلیا کے لئے بھی یہ نہیں کر سکتا۔ وہ لڑکی، جس کے چہرے پر حسین مستقبل کی شفق لہرا رہی ہے۔ وہ میرے ساتھ زندگی گذارنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ جب اس کا دل ٹوٹے گا تو کیا ہو گا۔ بیشک ہم سب مجبور ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو فریب دیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

"کب تک نہاتے رہو گے نواز۔ آؤ۔ ناشتہ تیار ہے۔" مجھے۔ کوشلیا کی کوئل جیسی آواز سنائی دی۔ اور میں چونک پڑا۔ دوسرے لمحے میں نے خیالات جھٹک دیئے۔ اور دریا سے باہر نکل آیا۔ لباس وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد میں کوشلیا کے نزدیک پہنچ گیا۔ جو کینوس کی فولڈنگ میز پر ناشتہ سجائے میرا انتظار کر رہی تھی۔

"ارے تم نے تو بڑا اہتمام کر ڈالا۔" میں نے بھری ہوئی میز دیکھتے ہوئے کہا اور کوشلیا اس طرح مسکرانے لگی جیسے کسی محبت کرنے والی بیوی کے شوہر نے اس کے پکائے ہوئے کھانوں کی تعریف کر دی ہو۔ ہم دونوں نے ناشتہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد فارغ ہو گئے۔ کوشلیا برتن سمیٹ کر رکھنے لگی۔

"اب کیا پروگرام ہے کوشلیا۔؟" میں نے پوچھا۔

"بس یہاں سے ہرات چلیں گے اور پھر افغانستان کی سرحد پار کر کے ایران میں داخل ہو جائیں گے۔ چند روز ایران میں گذاریں گے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ جائیں گے۔ میں کہہ چکی ہوں نواز کہ میں تمہارے دنیا دیکھنے کے پروگرام میں حارج نہیں ہوں گی۔"

"میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ چند منٹ خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

"کیوں۔ تمہیں اس پروگرام سے اختلاف ہے۔؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "لیکن ----- رات کو تم مجھے اپنے کچھ راز بتانے جا رہی تھیں۔"

"ہاں۔" کوشلیا اچانک سنجیدہ ہو گئی۔

"پھر۔؟"

"میں نے پروگرام تھوڑے دن کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔"

"کیوں۔؟"

"بس ایران چل کر تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی اور اس کے بعد کے ----- پروگرام تمہاری مرضی سے بنائے جائیں گے۔ بھگوان کے لئے مجھے کچھ اور بتانے پر مجبور نہیں کرنا۔" اس نے التجا کی۔

"ٹھیک ہے کوشل ----- تم اطمینان رکھو۔" میں نے بڑے خلوص سے کہا۔ میں اس سے کچھ پوچھنے کا حق بھی کیا رکھتا تھا جب کہ میں خود صاف دل نہیں رکھتا تھا۔ وہ بے چاری بھی میرے بارے میں کیا جانتی تھی۔

"تو پھر سامان سنبھالیں؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل" میں نے جواب دیا۔ اور کوشلیا روانگی کے انتظامات کرنے لگی اس بار ڈرائیونگ

میں نے سنبھال لی تھی۔ اور کوشلیا میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اور ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ شاید میری قربت سے وہ بہت خوش تھی اور میرا دل کٹ رہا تھا اس کی یہ خوشی عارضی ہے اور جب اسے میری حقیقت کا علم ہو گا۔ تو شاید ----- وہ بھی دنیا سے میری طرح بیزار ہو جائے۔ ہر شخص اسے فریبی نظر آنے لگے گا۔

کار ایک خشک پہاڑی کو عبور کر کے ایک ہری بھری وادی میں داخل ہو گئی۔ دریائے ہری اسی وادی سے گذرتا ہے۔ دریا کے پار سڑک پر دو رویہ چیڑ کے درختوں کی قطار تھی۔ اس خوبصورت سڑک نے تھوڑی دیر کے لئے ہمیں اپنی زندگی سے بیگانہ کر دیا۔ ایسا خوبصورت منظر کم ہی نگاہوں سے گذرتا ہے۔ تاحد نگاہ سبزہ ہی سبزہ۔ کار کی رفتار خود بخود کم ہو گئی۔ کوشلیا بھی کھڑکی سے منہ نکالے بیٹھی تھی وہ بھی ماحول سے بیگانہ معلوم ہوتی تھی۔

دس بارہ میل لمبی سڑک کا یہ ٹکڑا ہم نے بہت ست روی سے طے کیا۔ لیکن پھر بھی اس کا اختتام ہو گیا۔ ہر خوبصورت چیز ناپائیدار ہوتی ہے۔ سڑک کا اختتام ایک تنگ دروازے پر ہوا، یہاں سے گذر کر ہم ہرات میں داخل ہو گئے۔ اور حسن کا سحر ٹوٹ گیا۔ کوشلیا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ چند لمحات خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"کتنا حسین علاقہ تھا۔"

"ہاں۔" میں نے مختصراً کہا۔

"کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ زندگی پر بوجھ نہ ہوتے۔ رسمیں نہ ہوتیں ----- وہی پتھروں کا ماحول ہوتا، انسان آزاد ہوتا۔ جہاں دل چاہتا رہتا۔ ان پہاڑوں اور جنگلوں میں زندگی کتنی حسین ہے۔ کیا انسان نے ترقی کے نام پر خود کو محدود نہیں کر دیا ہے۔ کیا زمانہ قدیم کا انسان ہم سے زیادہ مدبر نہیں تھا۔؟ پھر انسان کو ترقی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ تم نے کبھی اس بارے میں غور کیا ہے نواز -----"

"ہاں۔ لیکن انسان اتنا آگے نکل گیا ہے کہ اب واپسی اس کے بس میں نہیں رہی ہے۔" میں ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"سچ کہتے ہو۔" کوشلیا نے اداسی سے گردن ہلائی پھر چونک کر بولی۔ "یہ اداسی ہمارے ذہنوں میں کیوں رینگ آئی۔"

"شاید اس حسین وادی کے سبز نہ ہونے کی بناء پر ----- میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"دلوں میں زندگی کی امنگ ہو تو ہر جگہ حسین ہو جاتی ہے آؤ۔ ہرات کی سیر کریں۔" کوشلیا نے کہا۔ اور میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ ہرات کے بڑے بازار میں ہم نے کار کھڑی کر دی اور کوشلیا اسے لاک کر کے باہر نکل آئی۔ ہم دونوں بے تکلفی سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ گئے۔ بازار میں اور بھی غیر ملکی سیاح نظر آ رہے تھے۔ کبھی کبھی کچھ آوارہ گرد بھی نظر آ جاتے۔ ماحول سے لاپرواہ اپنی دھن میں مست۔ لیکن ان میں کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔

ہم تنگ دوکانوں کے سامنے سے گذرتے رہے۔ خوبصورت پوستین اور جانوروں کی حسین کھالیں۔ قالین اور نہ جانے کون کون سی مصنوعات سیاحوں کے لئے بے حد دلکش تھیں۔ بعض دوکانوں پر خاصی بھیڑ تھی۔ کوشلیا نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک دوکان کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے افغانی دوکاندار سے ایک پوستین طلب کی تھی۔

دوکاندار پوری طرح متوجہ ہو گیا۔ اس نے کئی خوبصورت پوستینیں نکال کر ہمارے سامنے پیش کر دیں۔ ان میں سے ایک نفیس پوستین کوشلیا نے پسند کیا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"پہن کر دیکھو۔۔۔۔۔"

"مگر۔۔۔۔۔ اس کی کیا......" میں نے کہنا چاہا لیکن کوشلیا نے میرا جملہ پورا نہ ہونے دیا۔ اس نے پوستین خود مجھے پہنانا شروع کر دی۔ اور میں نے مسکراتے ہوئے اسے پہن لیا۔ دوکاندار اسے میرے جسم پر فٹ کر رہا تھا۔ پوستین درحقیقت خوبصورت تھی اسے پہن کر میں نے ایک بڑے آئینے میں خود کو دیکھا۔

"بہت خوبصورت ہے۔" کوشلیا نے پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر دوکاندار سے مخاطب ہو کر بولی۔ "کتنی قیمت ہے۔؟"

"ڈھائی ہزار افغانی۔"

"بہت زیادہ ہیں۔ کم کرو۔" بہرحال دو ہزار افغانی میں سودا طے ہو گیا اور پوستین خرید لی گئی۔" پہنے رہو۔۔۔۔۔" کوشلیا نے مجھ سے فرمائش کی اور میں نے اس کی فرمائش کی تعمیل کی۔ لیکن مجھے بھی اس کا قرض اتارنا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دور چل کر۔ میں نے ایک دوکان پسند کی اور دوکاندار سے فر کے۔۔۔۔۔ خوبصورت کوٹ طلب کئے۔ ایک کوٹ' دستانے اور خوبصورت ٹوپی میں نے کوشلیا کے لئے خریدی اور اس کی قیمت چار ہزار افغانی دوکاندار کو ادا کی۔ کوشلیا ان چیزوں کو پہن کر بہت خوش نظر آ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر تھوڑی سی حیرت بھی تھی۔ اسے شاید گمان نہیں تھا کہ میرے پاس اتنی کرنسی بھی ہو سکتی ہے۔

بہرحال اس نے تمام چیزیں بڑے شوق سے پہن لیں اور بہت خوش نظر آنے لگی۔ کافی دیر تک ہم ہرات کے بازاروں میں گھومتے رہے۔ ایک ایک چیز کو حیرت و دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ کوشلیا نے اور بھی بہت سی چیزیں خریدی تھیں۔ میرے لئے' اپنے لئے۔ اور پھر ہم واپس پلٹ پڑے۔

"کیا خیال ہے۔ ہرات میں ایک رات گذاری جائے۔ بڑا تاریخی شہر ہے کیا تمہیں اس کی تاریخ معلوم ہے۔؟"

"صرف کتابوں کی حد تک۔" میں نے جواب دیا۔

"کتابیں ہی تو تاریخ عالم سے روشناس کراتی ہیں میں نے ان جگہوں کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل کی ہیں جن سے میں نے گذرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ ہرات بڑی تاریخی حیثیت کا شہر ہے۔ تاریخ کے عظیم کردار اس شہر سے انوکھے مذاق کر چکے ہیں۔ تین سو ستائیس قبل

مسیح' سکندر اعظم نے اسے آرتاکونا کا نام دیا' اور اس کے بالمقابل ایک نیا شہر اسکندریہ آباد کیا۔ 651ء میں اسے عبداللہ بن امیر نے فتح کیا اور یہ ایران کی مسلم سلطنت کا ایک حصہ کہلایا۔ غزنوی سلطانوں اور سلجوقی ترکوں کے بعد یہ شہر خوارزم کے سلطانوں کے زیر نگیں آ گیا۔ سمرقند' بخارا' دمشق اور دہلی کے تاجروں کے لئے یہ جنت تھا لیکن پھر چنگیز خاں کے ہاتھوں اس کا حسن اجڑ گیا۔ چنگیز خاں کے خوفناک حملوں میں پندرہ لاکھ سے زیادہ شہری قتل ہوئے اور ہرات کھنڈر بن گیا۔ لیکن غوری سلطانوں کے دور میں ایک بار پھر اس پر حسن آ گیا اور یہ چمن ایشیا کہلانے لگا لیکن ایک بار پھر اس پر تباہی نازل ہوئی۔ امیر تیمور کے بیٹے شاہ رخ نے اسے اپنا دارالسلطنت بنا لیا۔ شاہ رخ اور اس کی ملکہ گوہر شاد نے اس شہر کے حسن کو چار چاند لگا دیئے۔ پھر شاہ رخ کا بیٹا ہو گیا۔ کیونکہ حسین مرزا کو فنون لطیفہ سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ غرض یہ خوبصورت شہر اپنے سینے میں نہ جانے کون کون سی داستانیں چھپائے ہوئے ہے۔

میں تعجب سے اس حسین لڑکی کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اسے تاریخ سے اس قدر دلچسپی ہو گی اور اس کی یادداشت ایسی عظیم ہو گی مجھے گمان بھی نہیں تھا۔

ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری کار کھڑی ہوئی تھی۔ خریدا ہوا سامان کار میں رکھ دیا گیا۔ اور کوشلیا ایک انگڑائی لیتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"فیصلہ نہیں کیا؟" اس نے اسی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"کس بات کا؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں ایک رات قیام کیا جائے۔"

"ضرور۔۔۔۔۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جیسا پسند کرو۔"

"تب آؤ۔ بھوک لگی رہی ہے کچھ کھائیں گے۔" اس نے کہا۔ اور ایک بار پھر ہم دونوں چل پڑے۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ "کار میں قیام کریں یا کسی ہوٹل میں۔"

"ہوٹل میں کمرہ لئے لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا جس میں سرور پنہاں تھا۔ میں اس کی سرور بھری آواز سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم گوشت کھاتی ہو۔؟" میں نے پوچھا۔

"انتہائی شوق سے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تب پھر تندور پر بھنا ہوا گوشت اور نان کھائیں گے۔ میں نے راستے میں دیکھا تھا۔" میں نے کہا اور وہ تیار ہو گئی۔ بلاشبہ اس میں ایک عمدہ ساتھی بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں اور تندور تک کا راستہ طے کرتے کرتے میں نے اپنے فیصلے میں تھوڑی تبدیلی کی۔ میں نے سوچ لیا۔ اب جب اس نے اس موضوع پر بات چھیڑی تو میں اسے ایک پیش کش کروں گا اور وہ پیش کش یہ ہو گی کہ اگر وہ میرے معاملات میں حارج نہ ہو تو میں اس کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ اس وقت تک جب تک وہ چاہے ہم دو دوستوں کی حیثیت سے زندگی گذاریں گے۔ کسی بھی حالت میں ایک دوسرے

سے جدا نہ ہوں گے ہاں جس دن وہ مجھ سے اکتاہٹ محسوس کرے مجھے اسے روکنے کا کوئی اختیار نہیں ہو گا۔

تندور پر پہنچ کر ہم نے دوکاندار کو گوشت بنانے کے لئے کہا۔ تندوری گوشت اور روٹیوں نے خوب مزہ دیا تھا۔ بھوک بھی زور دار لگ رہی تھی۔ اس لئے ذرا زیادہ ہی کھا گئے۔ لیکن کار تک واپسی کے پیدل سفر نے پیٹ کی حالت درست کر دی دروازہ کھول کر ہم اندر بیٹھ گئے۔ غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ہم نے خاموشی سے آنکھیں بند کرلیں۔ کار کی چھوٹی سی سیٹ پر بیزاری کی کیفیت تھی۔ لیکن پھر بھی کافی سکون مل رہا تھا۔ کافی دیر ہم نے وہیں گذار دی۔

سورج سفر طے کر رہا تھا پھر جب دھوپ کا رنگ زرد ہونے لگا تو ہوٹل شاد کا رخ کیا۔ اور اس صاف ستھرے ہوٹل میں ایک کمرہ حاصل کر لیا۔ کرایہ پیشگی ادا کر دیا گیا تھا۔ کمرہ خوبصورت سمت تھا۔ اس کے عقب میں ایک بڑی کھڑکی کھلتی تھی جس سے ہرات کی خوبصورت مسجد جامی کے گنبد صاف نظر آتے تھے۔ خیال تھا کہ تھوڑی دیر آرام کے بعد شہر کے کچھ دوسرے حصے دیکھیں گے۔ لیکن یکایک آسمان پر بادل جمع ہونے لگے اور پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔

یہ موسم بھی استقبالیہ تھا۔ باہر جانے کا تصور چھوڑ دیا۔ کوشلیا نے دو کرسیاں کھڑکی کے نزدیک ڈال لیں۔ اور وہیں بیٹھ گئی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اس کے گہرے گہرے کش لینے لگا۔ بارش دلوں میں امنگ پیدا کر دیتی ہے۔ خاص طور سے تو اس وقت موسم کے حسن کا کیا کہنا جب کوئی پسندیدہ حسین ساتھی بالکل نزدیک موجود ہو۔ تنہائی ہو خوشگوار ماحول ہو۔ بارش کی ننھی ننھی بوندیں کھڑکی کے راستے اندر آکر ہمارے کپڑے بھگو رہی تھیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کے صبر کو آزما رہے تھے۔ بالآخر کوشلیا نے ہار مان لی۔ وہ اٹھی اور میری کرسی پر میری گود میں آبیٹھی۔ میں نے دونوں بازو اس کے گرد لپیٹ کر اس کی پشت کو اپنے سینے سے چپکا لیا اور کوشلیا نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر اپنی بانہیں الٹ کر میری گردن میں حمائل کر دیں۔ تب میں جھکا۔ اور میں نے اس کے سلگتے ہوئے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

زور کی گرج ہوئی اور تاریکی اس طرح اُمڈ آئی جیسے سیاہ ہاتھیوں کا کوئی غول بالکل نزدیک آگیا ہو۔ اندھیرا چھانے لگا اور پورا ماحول پانی میں بھیگ گیا۔ کوشلیا کے چہرے پر دھنک بکھر گئی تھی۔ ماحول نے اس کی آنکھوں میں امنگوں کی قندیلیں روشن کر دی تھیں۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "اب تو کہیں جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"ہاں یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم نے اس ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ ورنہ کار میں شاید ہم اس بارش سے اچھی طرح لطف اندوز نہ ہو سکتے۔" میں نے کہا۔ اور کوشلیا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہوں میں گھٹائیں امنڈ رہی تھیں۔ پلکیں بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن ابھی رات دور تھی۔ ہم دونوں رات کا انتظار کرنے لگے اور بادل امنڈ امنڈ کر برستے رہے۔ تب رات ہو گئی۔ کھانے وغیرہ ۔ فارغ ہونے کے بعد ہم بہت خوش تھے۔ رات جو آ گئی تھی۔

اور اس رات سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے ہم نے یہ کیا کہ کمرے کا بستر اس

کھڑکی کے قریب کھینچ لیا جس سے ننھی ننھی بوندیں اچھل کر اندر آجاتی تھیں اور پھر لباس تبدیل کرکے ہم بستر پر آگئے۔ کوشلیا بھی بے تکلفی سے میرے میرے بازوؤں میں آکر لیٹ گئی۔ اس کا چہرہ چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ دیوانی تو دل سے مجھے اپنا سب کچھ مان چکی تھی۔ پھر کسی حجاب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا' بقول اس کے میں اس کی زندگی کا پہلا مرد تھا۔ اور وہ اس پہلے مرد سے بخوبی واقف ہو جانا چاہتی تھی۔

کمرے کی روشنی ہم نے گل کر دی تھی' لیکن آسمان پر چمکنے والی روشنی کبھی کبھی کوشلیا کے چمکدار جسم کو اور چمکا دیتی۔ اور میں اس چاندی کے بدن کو خود میں سمونے کی دیوانہ وار کوشش کرنے لگتا۔

بارش نہ تھکی۔ ہم تھک گئے۔ اور تھکنے کے بعد سو گئے۔ ننھی بوندیں نہ جانے کب تک ہمارے جسموں کو گدگداتی رہیں۔ البتہ صبح جب آنکھ کھلی تو آسمان پہلی رات کی سہاگن کی طرح غسل کرکے نکھر چکا تھا۔ اس کی حسین نیلاہٹیں فیروزے کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ میں نے کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھا اور پھر اپنی آغوش میں کسمساتی کوشلیا کو ------ وہ بھی جاگ اٹھی تھی لیکن میری طرح شاید اس کا بھی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

لیکن باہر ہونے والے شور' برتنوں کی آواز' قدموں کی چاپ نے ہمیں احساس دلا دیا کہ یہ ہماری کوٹھی کا بیڈ روم نہیں بلکہ ہوٹل ہے اس لئے ہم اٹھ گئے پہلے کوشلیا نے غسل کیا' پھر میں نے ہم دونوں کے چہرے مسرت میں ڈوبے ہوئے تھے اس لئے رات کی کسی بات کا کوئی تذکرہ بے سود تھا ان کہی باتیں پڑھی جا سکتی تھیں۔ میں نے بیرے کو بلا کر ناشتہ طلب کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کیا خیال ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"چلیں گے۔" کوشلیا نے مختصراً جواب دیا۔ اور ہم اپنا مختصر سامان سنبھالنے لگے۔ نیچے آئے۔ بل ادا کیا اور پھر اپنی کار تک پہنچ گئے۔ کوشلیا نے ڈکی کھولی۔ میں نے سامان رکھا اور پھر کوشلیا کو پیٹرول کا ایک بیرل اٹھاتے دیکھ کر جلدی سے روک دیا۔

"یہ تکلیف کیوں ------؟" میں نے پوچھا اور وہ ہنس دی۔

"تھوڑا سا پیٹرول ڈال لیں۔" اس نے کہا۔ اور میں بیرل اٹھا کر پیٹرول انڈیلنے لگا جو کوشلیا نے کار کی ٹنکی میں لگا دیا تھا۔ ٹینکی فل کرنے کے بعد بیرل پیچھے رکھا اور ڈکی وغیرہ بند کرنے کے بعد ہم کار میں آبیٹھے۔ اس بار اسٹیرنگ کوشلیا نے سنبھالا تھا اور میں اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔

کار ہرات کی خوبصورت سڑکوں کو الوداع کہنے لگی۔ سڑکیں پانی سے بھیگی ہوئی تھیں لیکن دو طرفہ سبزہ نکھر آیا تھا اور آنکھوں کو بے حد بھلا محسوس ہو رہا تھا شہر سے باہر گوہر شاد کے مقبرے سے گذرتے ہوئے ہم نے شیخ بقارا کے مدرسے کے بلند مینار دیکھے جو آج زمانے کی تبدیلیوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

شہر سے نکلنے کے بعد صاف ستھری اور مضبوط سڑک ملی تو کوشلیا نے کار کی رفتار تیز کر دی۔

وہ خاصی چاق و چوبند نظر آرہی تھی۔ یوں بھی وہ ڈرائیونگ کی ماہر تھی کیونکہ اتنا طویل سفر طے کر چکی تھی۔ ظاہر ہے معمولی بات نہیں تھی۔ ویسے جب بھی کوشلیا کے بارے میں غور کرتا مجھے حیرت ہونے لگی۔ عجیب متضاد لڑکی تھی۔ ایک طرف اتنی نڈر اور بیباک کہ تن تنہا' اس کار پر بھروسہ کرتے ہوئے دُنیا کے سفر پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے مرد اس طرح اکیلے سفر کرنے سے گھبراتے ہیں۔ چہ جائیکہ وہ تو لڑکی تھی۔ وہ بھی نوجوان اور خوبصورت کسی بھی وقت کسی بھی جگہ غلط ہاتھوں میں پھنس کر زندگی اور عزت گنوا سکتی تھی۔ لیکن اس نے ان باتوں کی پرواہ نہیں کی تھی۔ اور اپنے شوق کی تکمیل کو نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اسے سادہ اور بے وقوف بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے سفر کے ایک ایک نکتے سے واقف تھی وہ بہترین تاریخ داں تھی' بقول اس کے اس نے جس لائن پر سفر کا منصوبہ بنایا تھا اس کے بارے میں بخوبی جانتی تھی۔ اور افغانستان کی تاریخ اس نے جس انداز میں بتائی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے۔

اس کے برعکس ------ اس کی زندگی مرد کے قرب سے دور تھی۔ گویا وہ کنواری تھی۔ اس میں مشرقیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دریائے ہلمند کے کنارے اور ہوٹل کے خوبصورت کمرے میں اس کی جن کیفیات کا اظہار ہوا تھا' اس سے انداہ ہوتا تھا کہ اس نے اس معاملے میں بھی غلط نہیں کہا ہے۔ بیشک وہ ایک نوخیزہ اور الھڑ لڑکی تھی۔ ان تمام باتوں کے ساتھ اس نے اپنے کسی راز کا بھی ذکر کیا تھا جو ہنوز سربستہ تھا۔ میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خود میرے دل میں بھی چور تھا۔ ممکن ہے اس کا راز معلوم کرنے کے بعد میرا ضمیر بھی مجھے کچھ کہنے پر اکساتا۔ لیکن عقل کہہ رہی تھی کہ اپنی حقیقت کو پوشیدہ ہی رہنے دوں وہ لوگ جنھوں نے مجھ پر ہزاروں روپے خرچ کئے تھے۔ آسانی سے میری جان چھوڑنے پر تیار نہ ہوں گے۔ پھر کیا فائدہ نہ اسے حاصل کر سکوں گا نہ زندہ رہ سکوں گا۔ زندگی اس طرح ضائع کر دینے والی چیز نہیں ہے۔ مصائب سے گھبرا کر انسان اس بارے میں سوچتا ضرور ہے۔ لیکن۔

خیالات کی رو یہیں تک پہنچی تھی کہ کار کی رفتار سست ہوتی محسوس کی۔ سامنے دیکھا۔ دو ہپی نوجوان سڑک کے کنارے کھڑے زور زور سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ شکلیں ضرور بگڑی ہوئی تھیں لیکن لباس صاف ستھرے اور قاعدے کے تھے۔

"کیا خیال ہے نواز ------؟" کوشلیا نے پوچھا۔

"دیکھ لو ------" میں نے جواب دیا۔ اور کوشلیا نے رفتار سست کرتے کرتے ان کے قریب کار روک دی۔ قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ ان میں ایک عورت ہے اور ایک مرد ------ لیکن عورت کا قد بھی پونے چھ فٹ سے کسی طرح کم نہیں تھا ------ وہ پوستین پہنے ہوئے تھی اور اس کے لمبے سفید بال پوستین کے نیچے تھے جس سے اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ مرد ہے یا عورت۔

ستے ہوئے چہرے والا نوجوان کار کے قریب آیا اور شستہ انگریزی میں لجاجت سے بولا۔ "براہ کرم آپ ہمیں کچھ دور تک لفٹ دے دیں گے؟"

"کہاں جاؤ گے؟" کوشلیا نے پوچھا۔

"ایران ------"

"تمہیں معلوم ہے ایران میں نشہ آور اشیاء رکھنا ناقابل معافی جرم ہے۔ کیا تم ہمارے لئے ------ مصیبت تو نہیں بن جاؤ گے ------؟" کوشلیا نے صاف لہجے میں پوچھا۔

"ہمارے پاس کچھ نہیں ہے"۔ اس بار لڑکی نے کہا۔

"تب بیٹھ جاؤ ------!" کوشلیا نے کہا اور وہ دونوں شکریہ ادا کر کے جلدی سے عقبی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کوشلیا نے کار آگے بڑھادی۔ ان دونوں کی آمد سے ماحول میں کچھ اجنبیت سی پیدا ہو گئی تھی جس کا احساس ہمیں تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی ہو گیا۔ لیکن بہرحال اب جو قدم اٹھالیا تھا اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد نوجوان نے کہا۔

"آپ لوگ بھی سیاح ہیں۔؟"

"ہاں ------!" میں نے جواب دیا۔

"کیا آپ ایران سے آگے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔؟"

"بہت آگے۔!"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ------ ایران میں آپ کہاں قیام کریں گے۔؟!"

"کسی بھی مناسب جگہ۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ ------ میرا نام کیسٹر ہے اور یہ میری بیوی جولیا ------ ہم دونوں بھی دنیا گردی کے لئے نکلے ہیں۔ کیا آپ دونوں بھی شوہر اور بیوی ہیں۔ میرا مطلب ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے ------" میرے بجائے کوشلیا نے جواب دیا۔ اور وہ دونوں مسکرانے لگے۔ پھر کیسٹر نے کہا۔

"میرا اندازہ ہے کہ آپ لوگوں کی شادی کو زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ بہرحال میری دعا ہے کہ آپ دونوں کامیاب شوہر اور بیوی ثابت ہوں۔" اس کے لہجے میں ایک عجیب سا خلوص تھا' جس سے ہم دونوں متاثر ہوئے اور تھوڑی سی اجنبیت کی فضا دور ہو گئی۔

"آپ لوگ کہاں تک جائیں گے۔؟" میں نے پوچھا۔

"بس کوئی پروگرام طے نہیں ہے۔ جہاں تک پہنچ سکے۔" کیسٹر کے لہجے میں اداسی تھی۔ نہ جانے کیوں۔ میں نے اس کی صورت دیکھی ------ لیکن ظاہر ہے میں اس سے اس اداسی کی وجہ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی یا تو بہت خاموش طبع تھی یا پھر زیادہ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے خدوخال خاصے پرکشش تھے۔ جسامت کے ساتھ تندرست بھی خاصی تھی اس لئے دلکش لگتی تھی۔ سفر جاری رہا اور پھر دور سے عمارت کے آثار نظر آنے لگے۔ ہم اسلام قلعہ پہنچ رہے تھے۔ اس کی چوکی کے دوسری طرف ایک ویران علاقہ ہے جو آزاد حیثیت رکھتا ہے اور اس پر کسی ملک کا دعویٰ نہیں ہے۔ ہاں اس کے بعد ایران کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اسلام قلعہ کی سرحدی چوکی پر متعین کسٹم کے افسران نے ہماری کار گھیر لی۔ بظاہر کوئی خاص بات نہیں تھی' لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ کسٹم حکام ہمیں گہری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ میرے دل میں دھکڑ پکڑ ہونے

گئی۔ کیا ہربنس کا جادو یہاں بھی چل گیا ہے۔ ممکن ہے اس کا ساتھی مر گیا ہو۔

بہرحال میرے چہرے کی تبدیلیاں نوٹ نہیں کی جاسکیں۔ کار میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو قابل اعتراض ہوتی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمیں فراغت مل گئی۔ اور اس بار اسٹیئرنگ میں نے سنبھال لیا تھا۔ ہمارے ہم سفر ہمارے ساتھ تھے۔

"مسٹر کیسٹر ہے۔؟" اچانک میں نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

"جی-----!" وہ مستعدی سے بولا۔

"آپ کی آنکھیں، ہونٹ اور چہرے کا رنگ بتاتا ہے کہ آپ چرس اور دوسری نشہ آور اشیاء کے عادی ہیں۔!"

"آپ کا خیال درست ہے----- آپ جولیا کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ بہت اداس ہے کیونکہ اس نے پچھلے بیس گھنٹے سے انجکشن نہیں لیا۔"

"تب آپ ایران میں کیسے گزارہ کریں گے۔؟"

"گزارا-----؟" کیسٹر نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "گزارا تو ہو ہی جاتا ہے مسٹر نواز----- بے شک ایران بہت خشک جگہ ہے ہم لوگوں کے لئے----- لیکن----- وہاں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہمارے جیسے لوگ کے کام آجاتے ہیں۔"

"اوہ-----" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "گویا وہاں بھی ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں۔؟"

"کہاں نہیں ملتیں۔ تلاش ضروری ہے۔"

"تب میرے دوست، مجھے ان میں سے کسی اڈے کا پتہ بتا دو۔ ممکن ہے کچھ وقت وہاں صرف کرنا پڑ جائے۔ تھوڑے دن تو گزار سکتا ہوں۔ لیکن، زیادہ وقت مشکل ہے۔"

"خوب----- خوب----- میں نے بھی تمہارے بارے میں یہی سوچا تھا۔ لیکن تمہاری وائف----- شاید وہ تمہاری عادت چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔" کیسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں----- وہ میری تمام بری عادتیں چھڑائے دے رہی ہے۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کوشلیا کی طرف دیکھا اور نہ جانے کیوں میں نے کوشلیا کے چہرے پر کسی قدر زردی دیکھی، اس کی آنکھوں میں بے چینی کے آثار صاف پڑھے جاسکتے تھے۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا----- اور پھر میں نے اس سے اردو میں پوچھا۔

"کیا بات ہے کوشلیا----- تم کچھ پریشان نظر آرہی ہو۔؟"

"اوہ----- نہیں نواز----- ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" کوشلیا نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر میں محسوس کر رہا ہوں۔ اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔" میں نے ہپی جوڑے کی

طرف اس خیال سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ کہیں وہ اردو سمجھتے تو نہیں۔ لیکن ان کے انداز سے پتہ چل گیا کہ وہ اردو سے بالکل نابلد ہیں۔

"پوچھو-----" کوشلیا نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"میرے ان لوگوں کی طرف متوجہ ہونے سے تم ناخوش تو نہیں ہو؟"

"ارے نہیں-----" کوشلیا نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اب میں ایسی تنگ دل اور اتنی بدگمان بھی نہیں ہوں۔ یقین کرو کوئی بات نہیں ہے۔!"

اور میں مطمئن ہو گیا----- مجھے اپنا تصور صرف وہم معلوم ہونے لگا۔ ہمارے دونوں ساتھی خاموش بیٹھے ہماری بکواس سن رہے تھے۔ سفر طے ہوتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد یوسف آباد کے آثار نظر آئے۔ یوسف آباد چھوٹا سا قصبہ تھا۔ تھوڑی سی آبادی پر مشتمل، لیکن خاصا صاف ستھرا تھا۔ اس کی کسٹم چیک پوسٹ خاصی عمدہ بنی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں میں نے یہاں بھی خصوصی چیکنگ محسوس کی۔ لیکن اس بار میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاید اس علاقے میں دونوں سمت سخت چیکنگ ہوتی ہے۔ سرخ و سفید ایرانی کسٹم آفیسران نے ہمارے کاغذات دیکھے اور پھر ہم سے نیچے اتر آنے کے لئے کہا۔

"معاف کیجئے۔ آپ کو کچھ وقت صرف کرنا ہو گا۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"میں حاضر ہوں۔!" میں نے فارسی میں کہا اور ایرانی افسر اپنی انگریزی کا جواب فارسی میں سن کر حیران رہ گیا۔ اس کی خصوصی توجہ میری طرف ہو گئی تھی۔

"یہ آپ کے ساتھی ہیں۔؟" اس نے دونوں ہپیوں کی طرف اشارہ کرکے فارسی میں پوچھا۔

"نہیں صرف ہم سفر----- ایران تک کے لئے لفٹ مانگ لی تھی۔"

"اور خاتون۔؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ مسز نواز ہیں۔ مذہب و ملت سے الگ۔!"

"اوہ----- حیرت انگیز بات ہے۔ آپ پاکستانی ہیں؟"

"ہاں-----!"

"آیئے----- میرے ساتھ ایک کپ پیالی کافی پی لیجئے۔ آپ سے کچھ گفتگو کرنی ہے۔ لیکن معاف کیجئے گا۔ خاتون اور آپ کے دوستوں کے لیے کافی یہیں بھجوادی جائے گی۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔! شکریہ۔" میں نے کوشلیا کی طرف رخ کرکے کہا اور پھر اس سے اردو میں بولا۔ "کوشلیا مجھے کچھ دیر کو اجازت دو۔!" اور کوشلیا نے گردن ہلا دی۔ نہ جانے کیوں میں نے اس کا چہرہ اترا اترا سا دیکھا تھا۔ کسٹم آفیسر مجھے لئے ہوئے کسٹم کی عمارت کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گیا۔!

"آپ لوگ سیاحت کے لئے نکلے ہیں؟" ایک کرسی پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرکے، اس نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔!" میں نے جواب دیا۔

"یہ جوڑا آپ کو کہاں ملا تھا؟"

"ہرات کے راستے میں۔"

"کیا آپ پہلی بار سفر پر نکلے ہیں۔؟"

"جی ہاں۔!"

"اوہ۔۔۔۔۔ تب آپ کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ یہ لوگ ناجائز منشیات کی تجارت کرتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن میری بیوی نے ان سے اس بارے میں پوچھ لیا تھا۔ تاہم اگر ان کے پاس سے کچھ برآمد ہوا تو ہم بری الذمہ ہوں گے' آپ ان کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔"

"ہوں۔۔۔۔۔!" کسٹم افسر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ایک آدمی کو بلا کر تین کپ کافی وہاں اور دو کپ یہاں طلب کی' اور جب وہ شخص چلا گیا' تو اس نے کہنیاں میز پر ٹکائیں اور آگے جھک آیا۔ "آریہ مہر کی خصوصی ہدایات کے تحت ایران میں منشیات کی تجارت کرنے والوں کیلئے انتہائی سخت قانون ہے۔ لیکن سماج دشمن عناصر اس پر بھی باز نہیں آتے۔ کچھ علاقوں میں ناجائز منشیات کا کاروبار کرنے والے گرفتار ہوئے ہیں اور ان سے معلوم ہوا ہے کہ جرائم پیشہ افراد یہاں بھی باقاعدہ اپنا کام کر رہے ہیں۔ ان کی نشاندہی پر بہت سے گروہوں کا صفایا کر دیا گیا ہے' لیکن باہر سے آنے والے۔۔۔۔۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ یہ راستہ استعمال کریں۔ چنانچہ ان کے لئے بھی خصوصی پروگرام بنایا گیا ہے۔ جو کافی سخت ہے۔!"

"جی۔۔۔۔۔!" میں نے گردن ہلائی۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کسٹم افسر کیا کہنا چاہتا ہے۔ ایسے وہ آنکھوں سے بے حد چالاک آدمی معلوم ہوتا تھا۔

"ہمیں خصوصی ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ منشیات ایران کے راستے لائی جا رہی ہیں۔ اطلاع دینے والوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ایک ٹورسٹ کار میں اسمگلنگ کی جا رہی ہیں۔ اس لئے ہر کار میں خاص نگاہ رکھی جا رہی ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے خصوصی طور پر آپ کو کیوں تکلیف دی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔۔۔۔۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پاکستان اور ایران کے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں بڑی خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ میری اور میری بیوی کی اور کار کی خوب اچھی طرح تلاشی لے لی جائے' تاکہ کوئی شبہ نہ رہے۔"

"میں اس تعاون پر شکر گزار ہوں۔ ویسے اس سفر میں آپ کی ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے تو نہیں ہوئی جن پر میرے شبے کا اطلاق ہوتا ہو۔"

"میرا خیال نہیں۔!" میں نے جواب دیا۔ کافی آگئی تھی۔ کسٹم آفیسر نے مجھ سے کچھ اور سوالات کئے اور پھر کسی کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔ ایک آدمی اندر آگیا۔

"کار کی تلاشی ہو گئی۔؟"

"جی ہاں۔!"

"سب ٹھیک ہے۔؟"

"بالکل۔۔۔۔۔!" اس نے جواب دیا اور کسٹم آفیسر مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوستانہ انداز میں میرا ہاتھ پکڑا۔۔۔۔۔ اور پھر ہم وہاں پہنچ گئے جہاں ہپی جوڑا اور کوشلیا موجود تھے۔ کوشلیا ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا اور اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔!

"اوہ۔۔۔۔۔ کیا بات ہے کوشی۔۔۔۔۔" میں نے پیار سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ چکر آگیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"مجھے تمہاری طبیعت پہلے ہی خراب معلوم ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے ہم اب مزید سفر نہیں کریں گے' یوسف آباد میں کوئی قیام کا انتظام ہے۔" میں نے آخری جملے کسٹم افسر سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

"ہاں۔۔۔۔۔ لیکن کوئی باقاعدہ ہوٹل نہیں ہے۔ سرائے کئی ہیں' آپ کو وہاں باآسانی جگہ مل جائے گی۔"

"شکریہ۔۔۔۔۔ اب ہم جائیں۔؟" میں نے پوچھا۔

"ضرور۔۔۔۔۔!" کسٹم افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس دوران اس نے کئی بار کوشلیا کو دیکھا تھا اور اس سے اظہار ہمدردی کیا تھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور ہپی جوڑا پھر ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ کسٹم افسر نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ پھر جب ہم کسٹم ہاؤس سے کافی دور نکل آئے تو اچانک کوشلیا نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"نواز۔۔۔۔۔؟"

"ہوں۔۔۔۔۔ اب کیسی طبیعت ہے کوشل۔؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"تھکن ہو گئی ہے۔ سرائے میں آرام تو نہ مل سکے گا! لیکن بہرحال....."

"نہیں نواز۔۔۔۔۔ یہاں سے نکلو چلو۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ آگے تربت جام ہے۔ اس سے آگے فریمان' ہم مشہد پہنچنے کی کوشش کریں گے اور نہ پہنچ سکے تو فریمان میں قیام کریں گے۔ خاصا صاف ستھرا شہر ہے۔"

"لیکن۔۔۔۔۔!" میں نے کہنا چاہا۔

"چلتے رہو نواز۔۔۔۔۔ مجھے اس ہپی جوڑے سے بھی وحشت ہو رہی ہے۔ نہ جانے یہ کب تک ہمارے ساتھ رہے۔"

"ہم جامی کے شہر میں اتر جائیں گے خاتون۔۔۔۔۔ آپ بے فکر رہیں۔" عقب سے کیسٹر کی آواز سنائی دی اور ہم سناٹے میں آگئے۔ کوشلیا منہ پھاڑ کر رہ گئی تھی۔ میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر لرزنے لگے تھے۔ بمشکل میں نے خود کو سنبھالا اور نہ جانے کیوں مجھے ان دونوں پر غصہ آنے لگا! اگر وہ اردو سے واقف تھا تو اسے پہلے یہ بات بتا دینی چاہئے تھی۔ وہ خاموشی سے ہماری گفتگو سنتا رہا۔ میں

اس گفتگو پر غور کرنے لگا جو ہم نے راستے میں کی تھی۔ اس میں بہت سے قابل اعتراض الفاظ تھے، لیکن شکر ہے ایسی کوئی بات نہیں تھی جو ہمارے لئے خطرناک ہوتی۔ تاہم مجھے اس کی یہ بات پسند نہیں آئی۔

"تو تم اردو جانتے ہو۔؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں دنیا کی بہت سی زبانیں جانتا ہوں۔ لیکن براہ کرم میری اردو دانی سے آپ کوئی غلط اثر قبول نہ کریں۔ میں------ آپ کے اس کرم کا شکر گزار ہوں۔" اس نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔ کیسٹر کی ساتھی لڑکی جولیا اب بھی خاموش تھی۔ بہرحال میں نے بہتر یہی سمجھا کہ کم از کم تربت جام تک ضرور پہنچ جاؤں تاکہ ان لوگوں سے پیچھا چھوٹ جائے۔ اور میں نے کار کی رفتار تیز کردی۔ نہ جانے کوشلیا کو کیا ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر پہلے جیسی رونق نہیں نظر آرہی تھی۔!

دھوپ ڈھل چکی تھی، جب ہم تربت جام کے قریب سے گزرے اور کیسٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے کار کی رفتار سست کردی اور کیسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا واقعی تم یہاں اتروگے۔؟"

"ہاں------ تمہارا شکریہ دوست۔!" اس نے نیاز مندی سے کہا اور کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ اس کی ساتھی لڑکی بھی نیچے اتر گئی تھی۔ تب کیسٹر نے کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ جولیا نے بھی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خدا حافظ کہا تھا۔ اور پھر دونوں آگے بڑھ گئے۔!

میں نے خاموشی سے کار آگے بڑھادی اور تھوڑی دیر تک بڑی غیر فطری سی خاموشی چھائی رہی۔ کوشلیا کی اب بھی وہی کیفیت تھی جسے اس نے تھوڑی دیر کے بعد محسوس کرلیا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی اور پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کمزور آواز میں بولی۔

"شاید------ تم ان لوگوں کے ساتھ اس سلوک پر ناراض ہو۔؟"

"ایں۔" میں چونک پڑا۔ "نہیں------ میں ناراض تو نہیں ہوں البتہ تمہاری اچانک بگڑ جانے والی طبیعت پر غور کررہا ہوں۔"

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس اچانک اضمحلال کا حملہ ہوا ہے، تھوڑی دیر میں ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن میں اس کے اردو سمجھنے اور بولنے پر حیران تھی۔"

"اونہہ------ ٹھیک ہے۔ زیادہ سے زیادہ دل میں برا مان گیا ہوگا۔ ہمیں کونسی اس سے راہ و رسم بڑھانی ہے۔ لیکن عجیب و غریب جوڑا تھا۔ تم نے اس کی ساتھی لڑکی پر غور کیا تھا۔؟"

"ہاں------!" کوشلیا نے کہا۔

"کچھ عجیب نہیں محسوس ہوئی تھی۔؟"

"ہوئی تھی۔!"

"شاید ان کے تعلقات ٹھیک نہ ہوں۔ شاید وہ دونوں میاں بیوی نہ ہوں۔ بہرحال ہم نے یہ حماقت کرتو ڈالی تھی۔ لیکن میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ان کے پاس سے کچھ برآمد نہ ہوجائے۔ میں نے

کسٹم افسر سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر ان کے پاس سے کچھ ملتا ہے تو انہیں ضرور گرفتار کرلیا جائے۔ ہمارا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

کوشلیا نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر بولی۔ "کسٹم افسر تمہیں اندر کیوں لے گیا تھا۔؟"

"یہی معلوم کرنے کے لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز تو نہیں ہے جو قابل اعتراض ہو۔ ایران میں منشیات کا کاروبار کرنے والوں کیلئے سخت قانون ہے۔!"

"پھر تم نے کیا جواب دیا۔؟"

"ظاہر ہے۔ کیا جواب دے سکتا تھا۔ میں نے پر خلوص پیشکش کی کہ کار کی اور ہمارے سامان کی تلاشی لے لی جائے۔"

"انہوں نے بڑی سخت تلاشی لی تھی۔ کار کی ایک ایک سیٹ جھاڑ کر دیکھ لی گئی۔ پٹرول کے بیرل میں لوہے کے تار ڈال کر دیکھے گئے۔ غرض ایسی ہر جگہ دیکھ ڈالی جہاں کسی چیز کے پوشیدہ ہونے کے امکانات ہوسکتے تھے۔"

"ہاں۔ اصل میں انہیں ایک خاص گاڑی کی تلاش ہے جس میں منشیات اسمگل کرکے لائی جارہی ہیں۔ ان کے مخبروں نے اطلاع دی تھی۔"

"اوہ------ تو انہیں ہمارے اوپر شبہ ہوا تھا۔؟"

"شبہ تو ہونا ہی چاہئے تھا لیکن بہرحال شبہ رفع ہوگیا۔ البتہ ایک بات کا مجھے تردد تھا۔"

"کیا------؟" کوشلیا نے چونک کر پوچھا۔

"میں نے تمہیں اپنی بیوی بتایا تھا اس لئے کہ تم نے------ اور پھر کسٹم آفیسر نے مجھ سے کچھ سوالات کئے تھے------ مجھے خطرہ تھا کہ علیحدگی میں وہ تم سے سوالات نہ کرے اور ہمارے بیان میں تضاد ہوجائے۔"

"میرا خیال ہے تمہارا پاکستانی ہونا کام آیا------!" کوشلیا نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ اس کے چہرے کی رونق واپس آتی جارہی تھی۔

"شاید------!" میں نے کہا۔ "لیکن اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"بہتر محسوس کررہی ہوں۔ سوچ رہی تھی۔ تنہا ہوتی تو کیا کرتی ان حالات میں ڈرائیونگ تو مشکل ہی تھی۔" اس نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا!

اس وقت روشنیاں جل اٹھی تھیں جب ہم فریمان میں داخل ہوئے۔ صاف ستھرے شہر کو دیکھ کر طبیعت کو عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔ کشادہ بازار، پھولوں اور سفیدے کے درختوں سے لدے ہوئے۔ ہر دوکان کے سامنے سبزہ۔ سلیقے سے ترتیب دی ہوئی دوکانیں، خوش پوش لوگ------ تروتازہ سے------ ان سب کو دیکھ کر ہی سفر کی تھکان دور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تاہم سست رفتاری سے چلتے ہوئے ہم نے دور سے ایک قہوہ خانہ دیکھا۔ اور اس کے سامنے کار روک دی۔

کار میں بیٹھے بیٹھے ہی میں نے قہوہ طلب کیا۔ اور ایک صاف ستھرے ملازم نے شیشے کے صراحی نما نازک گلاسوں میں قہوہ پیش کر دیا۔ گرم گرم خوش ذائقہ مشروب نے تھکن جیسے جسم سے نچوڑ لی۔ کوشلیا کے چہرے کی بحالی لوٹ آئی تھی اور اب پھر اس کی آنکھوں میں پہلے جیسی چمک تھی!

قہوے سے فارغ ہو کر ہم کسی مناسب قیام گاہ کی تلاش میں چل پڑے۔ ایرانی کرنسی کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ رات ہو چکی تھی اس لئے کرنسی تبدیل کرانا مشکل کام تھا۔ تاہم ہمیں یقین تھا کہ یہاں سب افغان کرنسی قبول کر لیں گے۔ چائے والے نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

کافی دور نکلنے کے بعد ہوٹل قنطارہ کے نیون سائن نظر آئے جس کے نیچے قیام گاہ کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا اور ہم نے کار اسی طرف موڑ دی قنطارا کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے ایرانی نوجوان نے ہمیں مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا اور یہاں بھی میری فارسی دانی نے کمال دکھایا' ایرانی نوجوان ہماری ہر امداد کے لیے تیار ہو گیا میں نے اسے پوری کرنسی بدلوانے کیلئے دے دی۔ کوشلیا نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ باقی اس کے پاس ٹریولر چیک بھی تھے جنہیں اس نے میرے مشورے سے پڑا رہنے دیا!

قنطارہ کی پہلی منزل پر ہمیں کمرہ مل گیا۔ دو بستروں کا یہ کمرہ زیادہ کشادہ تو نہیں تھا لیکن صاف ستھرا اور گوارہ تھا۔ بہر حال ایک رات یہاں گزارنی تھی۔

ہم کمرے میں آ گئے ------! اور کوشلیا تھکے تھکے سے انداز میں بستر پر گر پڑی۔

"اگر تم کہو تو میں ڈاکٹر تلاش کروں۔!" میں نے کوشلیا کو تسلی دیتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ اب میں ایسی کمزور بھی نہیں ہوں۔ بس یقین کرو وہ صرف خفقان تھا۔ اس بیہی جوڑے سے طبیعت زیادہ خوش نہیں ہوئی تھی اور دل پر ایک بوجھ سا تھا کہ خانخواہ ہم نے اسے سر پر مسلط کر لیا۔ وہ لوگ چلے گئے' اب میں خوش ہوں۔"

"چلو ------ ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے ------!" میں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور جواب میں کوشلیا بھی مسکرانے لگی۔

"نہیں جناب۔ میرے آرام کرنے کے دن ہیں۔"

"کیا مطلب ------؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"مطلب میں نہ سمجھا سکوں گی۔ کوشلیا نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے کوشل ------ یقین کرو میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اب تم بدھو ہو تو میں کیا بتاؤں۔" کوشلیا نے میرے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔ "چند روز کے لئے ہم شجر ممنوعہ بن گئے ہیں۔!" اس نے عجیب سی ادا سے کہا اور لفظ "چند روز" نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا۔ میں مضحکہ خیز انداز میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کوشلیا ہنسنے لگی! تاہم میری سمجھ میں اس کی اداسی اور اس کے چہرے کی بے رونقی کی وجہ آ گئی تھی۔

غسل کرنے کو دل چاہ رہا تھا' لیکن ایران میں غسل خانوں کا رواج نہیں ہے۔ وہاں حمام ہوتے ہیں' ہر گلی کوچے میں' لوگ گھروں سے تیار ہو کر حمام میں آ جاتے ہیں اور غسل اور مالش کے

بعد یہیں سے سیدھے دفتر یا کاروبار پر چلے جاتے ہیں۔ رات کو پارٹی ہو تو مہمانوں کو کھانے سے پہلے اعلیٰ درجے کے حماموں میں مدعو کیا جاتا ہے۔ حمام ایرانی تہذیب کا جزو لازم ہیں۔ بہر حال بھوک لگ رہی تھی' اس لئے کھانا طلب کیا۔ تھکن کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے کھانے کے بعد بستر میں ٹھس گئے! کوشلیا نے لباس تبدیل کیا اور میرے پاس آ گھسی۔ اس کے بال میرے سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ خاموش تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے کوشل۔؟" میں نے اس کے ریشمی بالوں کو سنوارتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ------ لیکن تم ناراض ہو۔!"

"کیوں ------؟ ناراضگی کی کیا بات ہے؟"

"بس ہے۔!"

"مجھے نہیں معلوم۔!" میں نے اس کی آنکھوں کو چومتے ہوئے کہا۔ "بتا دو۔"

"بس میں نہیں بتاؤں گی۔"

"بھئی میں ناراض ہی نہیں ہوں۔ کوئی وجہ تمہارے ذہن میں ہو تو نکال دو۔" میں نے اسے بھینچ کر پیار کرتے ہوئے کہا اور وہ مسکرانے لگی۔

"ویسے تم نے میرے اوپر اعتبار نہیں کیا ہے نواز۔؟" چند منٹ کے بعد اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"عجیب باتیں کر رہی ہو۔ اب اُس کی وجہ بھی بتا دو۔"

"کیا مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے؟" اس نے شکایتی انداز میں کہا۔ "جبکہ میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکی ہوں۔"

"اوہ ---- میرے اندر کوئی خاص بات نہیں ہے کوشل پنجاب کے ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ نہ حاصل کر سکا تو آوارہ گردی کی ٹھانی۔ کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا اس لئے تن بہ تقدیر چل پڑا۔ اور چھوٹے چھوٹے نقصانات کا سہارا لیتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا۔ بس یہ میری داستان ہے۔"

"تم اور زبانیں بھی جانتے ہو۔؟"

"ہاں۔ میں نے سفر کرنے سے قبل کئی زبانیں سیکھی ہیں۔"

"تمہارے پاس پستول بھی۔؟"

"اوہ ---- تم نے کہاں دیکھ لیا۔؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"تمہارے سامان میں۔"

"ہاں ---- یہ خود حفاظتی کے لئے ساتھ رکھ لیا تھا۔ لیکن اس کا لائسنس موجود ہے۔"

"ایرانی کسٹم والے اسے نظر انداز کر گئے تھے۔ کیا اس کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں ہو سکتی تھی۔؟"

"اگر وہ پوچھتے تو میں لائسنس دکھا دیتا۔ اگر وہ اسے میرے ساتھ نہ رہنے دینا چاہتے تو مجھے

اس کی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن تم یہ سوالات کیوں کر رہی ہو۔؟"

"سچ بتادوں۔؟"

"ہاں۔ بالکل سچ۔"

"جب تم نے ایرانی کسٹم افسر سے اس کی زبان میں باتیں کی تھیں۔ تو میں نے تمہارے بارے میں نئے انداز سے سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید تمہارا تعلق بین الاقوامی پولیس سے ہے۔ اور تم منشیات کی ناجائز اسمگلنگ کے انسداد کے لئے نکلے ہو۔ جب وہ تمہیں اپنے ساتھ بلا کر لے گیا تب میرا یقین اور پختہ ہو گیا تھا۔"

"پھر۔۔۔۔ اگر میں ہوتا تو تمہارے کیا احساسات ہوتے۔ تم منشیات کی اسمگلر تو نہیں ہو۔؟"

"اگر ہوتی تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔؟"

"تمہیں گرفتار کر کے اپنے دل کی گہرائیوں میں قید کر لیتا۔" میں نے پیار سے اسے بھینچتے ہوئے کہا۔ اور وہ ہنسنے لگی۔

"نہیں۔۔۔۔ بس مجھے یہ دکھ ہوا تھا کہ اگر ایسی بات ہے تو تم نے مجھ سے چھپائی کیوں۔۔۔۔ کیا تم مجھے ناقابل اعتبار سمجھتے ہو۔؟"

"نہیں صاحب۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا۔" میں نے اس کا گال تھپتھپایا۔ اور اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے لگا۔ کیونکہ حقیقت تو میں نے اب بھی اسے نہیں بتائی تھی۔

کوشلیا ہنستی رہی۔ اور جب اسے نیند آنے لگی تو وہ میرے سینے میں منہ چھپا کر سو گئی۔

دوسری صبح ہم فریمان سے چل پڑے۔ موسم خنک تھا۔ دھوپ بے حد خوشگوار لگ رہی تھی۔ کوشلیا اب بالکل ٹھیک تھی۔ راستے میں ہم مختلف باتیں کرتے رہے۔ اور پھر ایک طویل سفر کر کے مشہد پہنچ گئے۔ کوشلیا نے مشہد میں رکنے کی مخالفت کی۔ اور سفر برابر جاری رہا۔

"ہم تہران چل کر چند روز قیام کریں گے۔ اور وہاں مکمل تھکن اتارنے کے بعد آگے بڑھنے کا پروگرام بنائیں گے۔" اس نے کہا اور میں ایک گہری سانس لے کر تیار ہو گیا۔ لیکن۔۔۔۔ میرے ذہن میں ایک پھانس سی چبھنے لگی تھی۔ اس دوران میں نے کام کیا کیا تھا۔ سوائے تفریح کرنے کے۔۔۔۔ پرنس کے بارے میں میں نے درفشانہ سے ملنے والی رپورٹ دے دی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک خاصا وقت گذر چکا تھا۔ لیکن نہ تو غلام سیٹھ کا کوئی آدمی ملا تھا۔ اور نہ ہی میں نے ان کے لئے کچھ کیا تھا۔

آئندہ کیا ہو گا؟۔۔۔۔ اگر ہم تہران پہنچ گئے تو کیا وہاں غلام سیٹھ کے آدمی مجھے ملیں گے۔ درحقیقت اب تک انہوں نے جتنی رقم میرے اوپر خرچ کی تھی میں نے اس میں سے ایک چوتھائی رقم کا کام بھی نہیں کیا تھا۔ شریف کے لئے میرے پاس کوئی پتہ بھی نہیں تھا۔ گویا اس وقت تک میں فارغ تھا جب تک ان کا کوئی آدمی مجھ سے رابطہ قائم کر لے۔ لیکن۔۔۔۔ یہ کیا بات

ہوئی؟۔۔۔۔ ایک طرح سے وہ لوگ مجھے پرورش کر رہے تھے۔ آخر اس قدر رقم خرچ کرنے کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ اور جو کچھ وجہ بتائی گئی تھی۔ وہ کچی بات یہ ہے کہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی کام ہوا۔ میں خود ابھی تک لڑکیوں میں کھیل رہا تھا۔ مجھے خود پر ہنسی آ گئی۔ کیسی عجیب زندگی ہے میری بھی۔۔۔۔ دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہوں۔ کوئی میرے اوپر مسلط نہیں ہے۔ لیکن۔۔۔۔ اس کے باوجود ایک ملحد مجھے دوسروں کا محکوم کئے ہوئے ہے۔ بہرحال اس محکومی میں ہی بھلا تھا۔ دیکھا جائے گا۔ فی الحال کوشلیا ساتھ ہے۔ اس کے پاس کافی رقم ہے۔ چھوڑو ضمیر کی باتیں۔۔۔۔ جس طرح بن پڑے عیش کرو۔ حسین ساتھی' دولت اور جگہ جگہ کا سفر۔۔۔۔ اور کیا چاہئے؟۔۔۔۔ قسمت نے جس انداز سے آگے بڑھایا ہے وہی سہی۔۔۔۔

طویل سفر نیشاپور پر ختم ہوا کیونکہ رات ہو گئی تھی۔ عمر خیام کا شہر نیشاپور' میری آنکھوں کے سامنے بکھرا ہوا تھا حسین رباعیاں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔ ایک رات نیشاپور میں گذاری۔ خنک اور بے کیف رات۔۔۔۔ جس میں کوشلیا کے نرم و گرم جسم کا لمس تو ضرور تھا لیکن اس کو نسوانیت کی دلکشی شجر ممنوعہ تھی۔ اس رات نے ذہن پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ اور دوسرے دن حسب معمول سفر جاری ہو گیا۔ راستے میں کار کی ٹنکی پھر بھرنی پڑی۔ اور میں نے برق رفتاری سے سفر شروع کیا۔ کوشلیا بالکل پر سکون تھی۔ اسے اس تیز رفتاری پر ذرا بھی تردد نہیں تھا۔

اور اس وقت شام کے چار بجے تھے جب ہم تہران میں داخل ہوئے کئی دن سے مسلسل سفر ہو رہا تھا۔ اس لئے ایک رات کی تھکن دور نہ ہوتی اور دوسری صبح ہو جاتی۔ تہران میں داخل ہونے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا اور کسی عمدہ سے ہوٹل کی تلاش میں چل پڑا۔

ساڑھے چار بجے تھے لیکن سورج مرجھا گیا تھا۔ بازاروں میں خاص رونق ہو گئی تھی۔ اور بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میدان سپاہ کو پار کر کے خیابان فردوسی پر آ گئے۔ جہاں فردوسی کا حسین مجسمہ شاہنامے کی جلد تھامے کھڑا تھا۔ منی اسکرٹ اور پشک میں ملبوس لڑکیاں مٹرگشت کر رہی تھیں۔ سروں سے ریشمی رومال باندھے دل گدگدا دینے والے خدوخال لئے' جدید ترین سوٹوں میں ملبوس نوجوان' سینما۔۔۔۔ نائٹ کلب' کابرے۔۔۔۔!

تہران پوری آب و تاب سے ہمارے سامنے تھا۔ لیکن تھکن نے ان تمام چیزوں میں دلچسپی نہ لینے دی۔ بالاخر' سیل نو" کے خوب صورت لان میں داخل ہو کر ہم نے کار پارک کر دی۔ فوراً ہی ایک پورٹر ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے ہمارا جائزہ لیا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے انگریزی میں ہم سے سوال کیا۔

"کیا آپ یہاں قیام کرنا چاہتے ہیں جناب۔؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔

"تشریف لائیے۔" اس نے ادب سے کہا۔ اور پھر ڈکی کھول کر ہمارا بے تکا سامان نکالنے لگا۔ تاہم اس نے سامان کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر ہم نے اپنا نام مسٹر اور

مسز راجہ نواز اصغر لکھوایا اور ہمیں ایک خوبصورت کمرہ مل گیا۔ وسیع اور کشادہ کمرے کو دیکھ کر دل خوش ہو گئی تھی۔ صاف ستھری دیواریں۔ اعلیٰ پائے کا قالین دروازوں پر پڑے ہوئے حسین پردے نرم گدوں والی مسہریاں۔ کوشلیا نے ایک طرف لگی ہوئی چوڑی کھڑکی کھول دی۔ اور باہر کا منظر دیکھنے لگی۔

"زندگی رواں دواں تھی۔ دور سے فردوسی کا مجسمہ نظر آرہا تھا۔ کوشلیا گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"کیا پروگرام ہے جان من۔؟" کوشلیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ پھر ہم نے رات کا کھانا طلب کیا۔ لذیذ ایرانی کھانا کھانے کے بعد کافی پی۔ اور پھر ہم نرم بستر میں دراز ہو گئے۔ کوشلیا آج میرے پاس ہی تھی۔ لیکن اسے شاید سخت نیند آرہی تھی۔ اس نے میرے سینے میں منہ چھپا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اور پھر مجھے بھی نیند آگئی۔

میں زیادہ کچی نیند میں نہیں تھا۔ لیکن ------- اس وقت تھکن کے باوجود آنکھ کھل گئی شاید کسی قسم کے کھٹکے کی آواز ہی تھی۔ میں نے نندرسی آنکھوں سے روشنی کے نیلے بلب کو دیکھا اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوشلیا میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے دوسرے بستر پر دیکھا۔ وہ خالی تھا۔

شاید باتھ روم میں ہو۔ لیکن اسی وقت نگاہ کمرے کے دروازے پر جا پڑی۔ اور میں چونک پڑا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ باہر کی روشنی میں کچھ سائے اندر پڑ رہے تھے۔

میں حیرت سے اچھل پڑا۔ کیا قصہ ہے؟۔ کوشلیا کہاں گئی؟ دوسرے لمحے میں پھرتی سے اٹھ گیا۔ میرے ذہن میں تجسس جاگ چکا تھا۔ دوسرے لمحے میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا اور ٹھٹھک گیا۔ وہ آواز کوشلیا ہی کی تھی ------- سرگوشیوں کا انداز ------- کون تھا؟ --- کس سے باتیں کر رہی تھی وہ؟ ------- میں غور سے سننے لگا۔ رات کے سناٹے میں سرگوشی صاف سنائی دے رہی تھی۔

"یہ آنے کا وقت ہے۔؟"

"ہم آپ کے لئے بے حد مضطرب تھے مادام۔" ایک مردانہ آواز نے کہا۔ زبان اردو تھی۔

"لیکن جب تمہیں علم ہو گیا تھا کہ میں پہنچ گئی ہوں تو پھر انتظار کیوں نہیں کیا۔"

"اس میں کوئی حرج نہیں ہے مادام۔ یہاں دن رات آمد و رفت رہتی ہے۔ ہماری آمد کسی نے شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہوگا۔"

"لیکن ------- تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

"زیادہ پریشانی ہمیں اسی کی تھی۔ ہم نے سوچا کہ آپ اس کی وجہ سے کسی الجھن میں گرفتار نہ ہوں۔"

"ہونہہ ------- الجھن ------- اس کی وجہ سے میں الجھن سے نکل گئی۔ ورنہ پھنس جاتی۔"

"اوہ! وہ کیسے مادام۔؟"

"مخبری ہو گئی تھی۔ سخت چیکنگ تھی۔"

"تعجب ہے۔ لیکن یہ -------"

"میں کہتی ہوں اس وقت چلے جاؤ۔ اگر وہ جاگ گیا تو میری پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ بس اب جاؤ۔"

"کار لے جائیں مادام۔؟" پوچھا گیا۔

"ابھی نہیں ------- اسے شک ہو جائے گا۔ میں صبح نورو کے ساتھ آؤں گی۔"

"جیسی مادام کی مرضی ------- لیکن ٹھاکر پسند نہیں کریں گے کہ آپ کسی کو راز دار بنائیں۔"

"میں براہ راست ٹھاکر کو جواب دہ ہوں۔" کوشلیا نے کہا۔

"ہم تو حکم کے بندے ہیں۔" جواب ملا۔

"بس ٹھیک ہے۔ جاؤ۔" کوشلیا نے کہا۔ اور میں پھرتی سے اپنے بستر پر واپس آگیا۔ لیکن ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ جسم سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ کار کا کیا راز ہے؟۔ تو یہ لڑکی شروع سے بے وقوف بنا رہی ہے۔ ہونہہ ------- بن کس طرح رہی تھی۔ بڑے کردار کی مالک بن رہی تھی۔ لیکن ------- کیا یہ بھی منشیات کی...... اسمگلنگ کا قصہ ہے۔؟۔ میں تو بڑے خطرے میں پھنس گیا تھا۔

اور پھر کسٹم افسر کے الفاظ یاد آگئے۔ اس نے کہا تھا کہ اسے اطلاع ملی ہے کہ کوئی چیز اسمگلنگ کر کے ایک کار کے ذریعہ لائی جا رہی ہے۔ کیا یہ وہی کار تھی؟۔ لیکن اس کی تو تلاشی ہو گئی تھی۔ کیا چیز پوشیدہ ہے اس میں۔؟

کوشلیا اندر آگئی تھی۔ اور اب وہ میرے قریب کھڑی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سمجھا کہ شاید میرے سینے پر لیٹنے سے میری آنکھ کھل جائے گی۔ اس لئے وہ دوسرے بستر پر جا لیٹی اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس وقت کوشلیا سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اگر وہ خود کو باکردار لڑکی ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتی تو شاید مجھے اس پر غصہ نہ آتا۔ ایسی تو بہت سی لڑکیاں مل چکی تھیں۔

اور دوسری لڑکیاں ------- وہ ان سے جدا کب تھی۔

لیکن گھاٹے میں میں بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے کون سی حقیقت بتا دی تھی۔ میں نے بھی تو اسے اپنے بارے میں تاریکی میں رکھا تھا۔ نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا ذہن بے شمار خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کوشلیا سو گئی۔ لیکن میں جاگتا رہا۔ مختلف خیالات ذہن میں چکرانے لگے۔ مجھے یاد آیا ------- ایک رات اس نے ٹھاکر کا نام لیا تھا۔ اور پھر میگاں کے آنے کی وجہ سے بات ادھوری

رہ گئی تھی۔

ذہن میں تھوڑی سی نرمی پیدا ہوئی۔ اس نے مجھے اپنا کوئی راز بتانے کے لئے بھی کہا تھا۔ کیا وہ یہی راز تھا؟ بڑی کشمکش میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایک دل کہہ رہا تھا کہ خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں۔ کسی مصیبت میں نہ گرفتار ہو جاؤں لیکن پھر اچانک ذہن میں ایک اور خیال آیا۔

غلام سیٹھ نے مجھے سروے کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ گو ایران منشیات کی تجارت سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن ------ اگر مجھے کچھ اشارے مل رہے ہیں تو کیوں نہ معلومات کروں۔ کیسٹر کے الفاظ ذہن میں آئے۔ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہو ہی جاتی ہے۔ یہ ضرورت کہاں سے پوری ہوتی ہے۔؟ دیکھوں تو سہی۔ تاکہ غلام سیٹھ کو یہاں کے بارے میں بھی اطلاع دے سکوں۔ اور یہ آخری خیال ہی زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ بالکل اجنبی بنا رہوں گا۔ کوشلیا سے تعاون کروں گا اور مکمل معلومات حاصل کروں گا۔ اس دوران اگر کوئی خطرہ در پیش ہوا تو اس سے بھی نپٹ لیا جاسکے گا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ذہن میں کھولن ہو رہی تھی۔ اس معصوم صورت نے مجھ سے سب کچھ چھپایا تھا۔ اس کی شخصیت میں بھی راز تھے۔ یہ بھی دوسروں کے تابع تھی۔ اور بس اس کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔ ٹھیک ہے مس کوشلیا۔ تم میرے دل سے اتر چکی ہو۔ لیکن ------ میں نے بھی تمہیں کون سی حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔ جو پوزیشن تمہاری ہے وہی میری بھی ہے۔ تم مجھے بے وقوف بنا کر زیادہ خوش نہ ہو گی۔ فکر مت کرو۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

بہر حال صبح ہو گئی۔ لیکن مجھے نیند نہیں آئی جبکہ کوشلیا گہری نیند سو گئی تھی۔

صبح کو اٹھ کر میں نے لباس وغیرہ تبدیل کیا۔ اور تیار ہو کر اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا جو ملازم نے دروازے کے نیچے کی جھری سے ڈال دیا تھا۔ یہ انگریزی اخبار تھا۔ میری نگاہیں اخبار کی سرخیوں پر تھیں۔ لیکن ذہن آئندہ اقدامات میں ہی الجھا ہوا تھا۔ کوشلیا کی اب میری نگاہوں میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کافی دیر کے بعد کوشلیا کی آنکھ کھلی۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا زیادہ وقت ہو گیا۔؟" اس نے ایک طویل انگڑائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ------ نو بجے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ارے۔" وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اور پھر اس نے بھی منہ ہاتھ دھویا بال سنوارے، لباس تبدیل کیا۔ اور میرے سامنے بیٹھتی ہوئی بولی۔ "ناشتہ منگواؤ۔"

"بہت ------ بہتر۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور بیرے کو بلانے کے لئے گھنٹی بجا دی۔ بیرے کے آنے پر میں نے اسے ناشتے کا آرڈر دیا۔ اور پھر اخبار پر نگاہیں جما دیں۔

"کوئی خاص خبر ہے۔؟" کوشلیا نے میرے کندھے پر منہ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ------ دیکھو۔" میں نے اخبار اس کی گود میں ڈال دیا۔ کوشش کے باوجود میں خود پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ لیکن شکر ہے کوشلیا نے یہ بات محسوس نہیں کی۔ ناشتہ آ گیا اور پھر ہم دونوں نے

ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران کوشلیا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن کہہ نہیں پا رہی۔ ایک بار میں نے خود اس کی یہ مشکل حل کر دی۔

"کیا بات ہے کوشلیا ------ تم اچانک سنجیدہ ہو گئیں؟"

"میرے کچھ سوالات کے جواب دو گے نواز ------؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ضرور ------" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم ------ تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔؟"

"ایک حسین ساتھی ------"

"بس ------"

"ایک بہترین دوست ------ ایک خوب صورت ہم سفر زندگی۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر تمہیں کبھی یہ احساس ہو جائے کہ میں ایک اچھی عورت نہیں ہوں، تو تمہارا کیا رد عمل ہو گا۔؟"

"اچھی عورت نہ ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"فرض کرو مجھ سے کوئی ایسی غلطی ہو جائے جو تمہاری نگاہ میں قابل معافی نہ ہو۔"

"میں تمہیں معاف کر دوں گا۔" میں نے کہا۔

"وعدہ کرتے ہو نواز۔؟" اس نے اداسی سے پوچھا۔

"مگر غلطی کیا ہے۔؟"

"پہلے وعدہ کرو ------"

"چلو وعدہ ------" میں نے ہنس کر کہا۔

"نواز۔ میں ایک دکھی عورت ہوں۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا نواز۔ تم میری زندگی میں پہلے مرد ہو جس سے میں متاثر ہوئی ہوں۔ لیکن میری پچھلی زندگی بہت کٹھن ہے۔ میں نے ناساعد حالات کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ میرا باپ منشیات کا اسمگلر تھا۔ اس نے پوری زندگی یہی کام کیا۔ میں اس کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس نے مجھے تعلیم دلائی۔ لیکن پھر جب وہ بوڑھا ہو گیا۔ تو اس نے مجھے اپنی لائن پر لگا دیا۔ اس نے مجھے اپنے بڑھاپے کے واسطے دیئے اور مجھ سے کہا کہ وہ میری عزت کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اس نے تمام حالات میرے سامنے کر دیئے۔ وہ لاکھوں روپے کا مقروض تھا۔ اور ان خوفناک حالات کے ہاتھوں میں بے بس ہو گئی۔ میں نے وہی کام کرنا شروع کر دیا جو وہ کرتا رہا تھا۔ اور جو وہ چاہتا تھا۔ میں اس گروہ میں شامل ہو گئی۔ میں نے باپ کا تمام قرض ادا کر دیا۔ میری ماں مر چکی تھی۔ اب صرف باپ زندہ تھا۔ اور جب میں بھرپور طور پر کام کرنے لگی تو میرا باپ بھی مر گیا۔ لیکن میں ٹھاکرے گروہ سے نہیں نکل سکی۔ اور آج تک اس کے لئے کام کر رہی ہوں۔ اس بار ایک لمبا کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے مجھے امریکہ تک کا طویل سفر کرنا ہے۔ میں منشیات لے کر ہی ایران میں داخل ہوئی ہوں۔ تمہیں میں نے ایک عام آدمی سمجھ کر ہی لفٹ دی تھی۔ لیکن

تمہارا کردار میرے ذہن کو بھا گیا۔ میں نے تمہارے ساتھ اپنا جیون نتھی کر لیا اور تمہیں اپنا سب کچھ سونپ دیا' تب میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔ اور پھر تم سے مدد چاہوں گی۔ تم اگر کہو گے تو اس گروہ کے لئے ہم دونوں کام کریں گے۔ اور تم منع کرو گے تو میں بھی یہ زندگی چھوڑ دوں گی اور تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم بے حد نیک انسان ہو اس لئے میں تمہیں سب کچھ بتاتے ہوئے ڈرتی رہی ہوں۔ اس رات میں دریائے ہلمند کے کنارے سب کچھ بتانے جا رہی تھی کہ وہ بپی لڑکی آ گئی۔ اور ہمت پھر ٹوٹ گئی۔ یقین کرو نواز' اس کے بدلے آج تک میرے ضمیر نے کہا کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں۔ لیکن میری ہمت نہ پڑی۔ میں نے سوچا کہ یہ کام پورا کر دوں اس کے بعد خود کو تمہارے سپرد کر دوں گی۔ تم جو چاہو میرے ساتھ سلوک کرو۔ اور اب میں یہاں پہنچ گئی ہوں۔ تمہیں یاد ہے جب کسٹم افسر تمہیں اندر لے گیا تھا تو میرا چہرہ اتر گیا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ کہیں تم بین الاقوامی پولیس کے آدمی نہ ہو۔ اور اس کے بعد سے جو میں بے قابو ہوئی اس کی وجہ بھی یہی تھی۔ لیکن بھگوان کا شکر ہے تم وہ نہ نکلے۔"

"یہ میری کہانی ہے نواز۔ اور اب میں تمہاری عدالت میں ہوں میرے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔" وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی کہانی بھی درفشانہ سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی بے سہارا تھی۔ لیکن درفشانہ اب بھی اس سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ وہ زیادہ مظلوم تھی۔ اور پھر وہ میری ہم مذہب تھی۔ جب میں نے اس کے معاملے میں دل سخت کر لیا تھا تو یہ کیا چیز تھی۔ میں خاموشی سے اسے آنسو بہاتے دیکھتا رہا۔ گو اس نے دل کھول کر سامنے رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک ایک حقیقت کہہ دی تھی۔ لیکن میرا دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہوا تھا۔ اگر صاف بھی ہو جاتا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے میں بھی اسی کی طرح مجبور تھا۔ میری زندگی تو خود دوسروں کے رحم و کرم پر تھی اور میں اس کے لئے دل میں کوئی خاص جذبہ نہیں رکھتا تھا۔ تاہم ابھی کچھ وقت اور گزارنا تھا۔ اور ——— غلام سیٹھ کے لئے اس سے معلومات بھی مہیا کرنا تھیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

"تو ——— کیا' تمہارے پاس منشیات موجود ہیں۔؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن کسٹم میں تو تلاشی ہو چکی تھی۔"

"یہ کار مخصوص قسم کی ہے۔ اس کے ضروری پرزوں کے ساتھ ساتھ بے شمار فالتو پرزے بھی لگے ہوئے ہیں۔ جو اندر سے خالی ہیں اور ان میں ہیروئن کی بہت بڑی مقدار چھپی ہوئی ہے۔"

"اوہ ———" میرے لہجے میں سرسراہٹ تھی۔ "یہ ٹھاکر کون ہے۔؟"

"ایک خطرناک انسان ———. جس کا کاروبار کھٹمنڈو سے امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔"

"کیا وہ ایران میں مقیم ہے؟"

"نہیں ———"

"پھر وہ کہاں ہے۔؟"

"اس کا قیام دہلی میں ہے۔ میں دہلی سے ہی آ رہی ہوں۔"

"یہاں اس کا باقاعدہ اڈہ ہے۔"

"ہاں ——— وہ واحد آدمی ہے جو یہاں پر اس خطرناک ماحول میں بھی کھلے دل سے کاروبار کرتا ہے۔ ورنہ ایران میں بڑے بڑے جیالے اس کاروبار سے جان چراتے ہیں۔ یہاں منشیات رکھنے والے کی سزا موت ہے۔"

"اور اگر میں وہاں نہیں جاؤں تو۔؟"

"ہم ہیروئن ان کے حوالے کرنے کے بعد آزاد ہوں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور اگر اس سے پہلے پھنس گئے۔"

"ٹھاکر ذمہ دار ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہمیں بچا لے گا۔"

"پھر اب؟ ——— تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔؟"

"معافی ——— صرف معافی ——— میری یہ پہلی اور آخری خطا ہے مجھے معاف کر دو میں نے تم سے صرف یہی جھوٹ بولا ہے۔ اس کی وجہ بھی تمہیں بتا چکی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

"ٹھیک ہے کوشلیا ——— میں خود ٹوٹا ہوا انسان ہوں۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔" میں نے کہا اور وہ سکتے میں رہ گئی۔ چند منٹ پاگلوں کی طرح مجھے دیکھتی رہی اور پھر اچانک اس کے چہرے پر بے پناہ مسرت کے آثار پیدا ہوئے اور وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے میرے چہرے اور گردن کے بے پناہ بوسے لے ڈالے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ اپنی مسرت کا اظہار کرتی رہی۔ اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا تھا اور میں ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

بے وقوف لڑکی۔ دنیا نے مجھے اتنے دھوکے دیئے ہیں کہ اب نیکی اور حمیت کا تصور بھی میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ تو مجھ لٹے ہوئے انسان سے حمیت کی بھیک مانگ رہی ہے۔ دنیا نے تو یہ لفظ حرف غلط کی طرح میرے سینے سے مٹا دیا ہے۔ میں تجھے کچھ نہ دے سکوں گا سوائے دھوکے کے کہ یہی میرے پاس رہ گیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔

کوشلیا آئینے کے سامنے اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ پھر اس نے میری طرف مڑ کر کہا۔ "مجھے تھوڑی دیر کے لئے اجازت دو گے نواز؟"

"کہاں جا رہی ہو ———؟"

"کار خالی کرا لاؤں۔ اس کے بعد میرا کام ختم ہو جائے گا۔ ہاں' آئندہ کے لئے کیا بات کروں؟"

"اس کا فیصلہ بعد میں کر لوں گا۔ کیا یہاں سے فوری واپسی ضروری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔"

"تب پھر اپنا کام کر کے واپس آ جاؤ۔ اس کے بعد فیصلہ کر لیں گے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ پھر وہ جھکی اور میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر میرے

ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔

"یقین نہیں آتا کہ اتنی بڑی الجھن کا اتنا آسان حل نکل آیا ہے نواز ـــــ یہ خیال میری جان لئے لے رہا تھا کہ جب تمہیں میری حقیقت معلوم ہو گئی تو تمہارا میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا یقین کرو میرے لئے یہ بہت بڑا اطمینان تھا۔ تم بے حد عظیم ہو۔ تم بے حد وسیع القلب انسان ہو۔ اس نے دوبارہ میرے ہونٹوں کو چوما اور پھر باہر نکل گئی۔

میں کئی منٹ تک اپنی عظمت اور وسیع القلبی پر غور کرتا رہا۔ اور پھر ایک قہقہہ خود بخود حلق سے آزاد ہو گیا۔ کیسا دلچسپ لطیفہ ہوا تھا۔ اسے میری عظمت کا احساس اس وقت ہو گا جب میں اس کے ساتھ سیرو تفریح کرنے کے بعد کہیں اچانک غائب ہو جاؤں گا۔ اور پھر وہ زندگی بھر مجھے تلاش کرتی رہے گی۔ اسے میری وسیع القلبی کا پتہ اس وقت لگے گا جب غلام سیٹھ ٹھاکر کے اڈے کو تباہ کرنے کے لئے ایران پولیس کو اس کی نشاندھی کرلے گا۔ یہ کام میں بھی کر سکتا تھا۔ لیکن میرے آقاؤں کی طرف سے ایک دوسرا کام میرے سپرد کر دیا گیا تھا۔ مجھے صرف اتنا ہی کرنا تھا۔ باقی کام ان لوگوں کا تھا۔ ہاں' کوشلیا سے غلام سیٹھ کے اڈے کی پوری تفصیل معلوم کرنا میرا کام تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" بیرے نے دروازے پر دستک دی۔ شاید ناشتے کے برتن لینے آیا تھا۔

"آ جاؤ۔" میں نے کہا اور آرام کرسی پر پاؤں پھیلا لئے۔ تب دروازہ کھلا اور بہت سے بھاری قدم اندر آ گئے۔ یقیناً وہ بیرا نہیں تھا۔ میں نے چونک کر گردن گھمائی۔ چار سادہ پوش تھے اور ان کے عقب میں ایرانی پولیس کی وردی نظر آ رہی تھی۔

"میں تعجب سے کھڑا ہو گیا۔

"آپ ہی مسٹر نواز ہیں۔؟" ایک سادہ لباس لیکن بارعب شخص نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔ ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن نے مجھے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ ضرور گڑبڑ ہو گئی۔ اور اب مجھے اس گڑبڑ سے نپٹنا تھا۔

"جی ہاں ـــــ" میں نے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا کر کے کہا۔ "کیا بات ہے۔؟"

"مسز نواز کہاں ہیں۔؟"

"اوہ! ـــــ خیریت ـــــ؟"

"براہ کرم میری بات کا جواب دیں۔"

"مسز نواز کا کوئی وجود نہیں ہے محترم ـــــ وہ ایک ہندو لڑکی کوشلیا ہے۔ جو خواہ مخواہ خود کو میری بیوی بتاتی ہے۔ حالانکہ میں اس پر کئی بار اعتراض کر چکا ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کون ہیں۔ اور ہم لوگوں کے بارے میں کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

"کار نمبر ڈی آر او ایک سو چودہ آپ کی ملکیت ہے۔؟"

"کوشلیا کی ہے۔ لیکن میں پھر وہی سوال کروں گا۔" میں نے کہا۔

"تم لوگ یہاں سے دور چلے جاؤ۔ اور دور سے کمرے کے دروازے پر نگاہ رکھو۔ ہم وہاں

گفتگو کریں گے۔" اس نے پولیس کانسٹیبلوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور پھر اپنے دو سادہ لباس آدمیوں کو بھی ان کے ساتھ بھیج دیا۔ اب صرف وہ افسر اور اس کا ایک قوی ہیکل اور اسمارٹ ساتھی اندر رہ گئے تھے لمبے تڑنگے قد اور قوی ہیکل جسم کا مالک شخص دروازے کے قریب کرسی گھسیٹ کر اور اس پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دوسرا آدمی میرے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کی تیز نگاہیں میری پیشانی کی ہڈی توڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"آپ کا پورا نام کیا ہے۔؟"

"راجہ نواز اصغر۔"

"کیا آپ مجھے اپنے کاغذات دکھائیں گے۔؟"

"ضرور ـــــ لیکن پہلے میں آپ کے بارے میں جاننا پسند کروں گا۔" میں نے کسی قدر سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! ـــــ ضرور۔" اس نے میری سختی کا جواب نرمی سے دیا۔ اور پھر جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر میرے سامنے کر دیا۔ وہ ایکسائز آفیسر تھا مجھے اپنے شبہے کا یقین ہو گیا۔ شاید کوشلیا ان کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔

"شکریہ' مجھے اپنے کاغذات دکھانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے" میں نے کہا اور اٹھ کر اپنے سامان سے اپنے کاغذات نکالے اور اس کے سامنے ڈال دیئے۔ اس نے میرے کاغذات دیکھے اور چونک پڑے۔

"ارے ـــــ آپ پاکستانی ہیں۔"

"بحمد اللہ ـــــ" میں نے کہا۔

"لیکن وہ ہندوستانی ہے۔ آپ لوگ ـــــ؟" اس نے بڑی حیرت سے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی اور اس کی پوری کہانی سنا دوں اس طرح آپ کو آسانی ہو گی۔ لیکن میری سمجھ میں یہ سب کچھ نہیں آیا ہے۔"

"یہ معلوم کر کے کہ آپ پاکستانی ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ پاکستانیوں کی ہمارے دل میں عزت اور حمیت ہے۔ لیکن براہ کرم آپ اپنی پوری کہانی سنا کر اپنی پوزیشن ضرور صاف کر دیں۔"

"بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "میں سرائے عالمگیر کا باشندہ ہوں۔ سیاحت کا شوق بچپن سے تھا۔ کوشش کرتا رہا۔ اور بالآخر اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ پشاور سے کابل اور پھر افغانستان کے دوسرے خوب صورت شہروں کو دیکھتا ہوا آ رہا تھا کہ قندھار کے راستے میں وہ مل گئی۔ میں نے اس سے لفٹ مانگی اور پھر ـــــ ہم نے دریائے ہلمند کے کنارے ایک رات گذاری۔ اور معاف کیجئے۔ بقول اس کے وہ مجھ سے محبت کرنے لگی۔ میں نے یہ سوچ کر بہرحال ایران تک کے لئے ایک حسین ساتھی مل جائے گا' اس کی محبت قبول کر لی۔ دوران سفر ہمارے درمیان کے تمام پردے ہٹ گئے۔ ایک اور ہپی جوڑا ہمارے ساتھ ہو گیا۔ جسے ہم نے جام تربت میں چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ سیاح ہے اور ہندوستان سے آئی ہے۔ یہاں سے ہم

دونوں کا علیحدہ ہو جانے کا پروگرام تھا۔ لیکن اس نے چند روز اور میرے ساتھ گذارنے کی فرمائش کی۔ اس طرح ہم دونوں نے ایک ہی ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ یہ مختصر' لیکن مکمل تفصیل ہے۔"

ایکسائز افسر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ لیکن اس کی نگاہیں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آرہے تھے۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"آپ کی ساتھی اس وقت کہاں ہے۔ مسٹر نواز۔"

"اسے کچھ چیزیں خریدنی تھیں۔ ایک گھنٹے میں واپسی کے لئے کہہ کر گئی ہے۔"

"یقیناً وہ اپنی کار پر گئی ہوگی۔"

"میں اس کے ساتھ نیچے نہیں گیا۔ لیکن یقیناً وہ کار لے گئی ہوگی۔ براہ کرم اب تو بتا دیں کیا قصہ ہے۔ میں سخت الجھن میں گرفتار ہو گیا ہوں۔" میں نے پریشان ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ اور ایکسائز افسر گردن ہلانے لگا۔

"یقیناً آپ سخت پریشانیوں میں پڑ گئے ہیں مسٹر نواز اصغر۔ آپ کی ساتھی لڑکی منشیات کے اسمگلروں کے ایک خطرناک گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔" ایکسائز افسر نے کہا۔ گو بات میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ لیکن صورت حال خراب ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں حواس باختہ ہو گیا۔ ایکسائز افسر بغور میری کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ بات میرے حق میں ہی جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تاہم" اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کے بیان پر غور کیا ہے۔ آپ پاکستانی ہیں۔ ہمارے بھائی۔ میں دیکھوں گا کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ براہ کرم آپ میرے ساتھ چلئے۔"

"میں تیار ہوں۔ لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اگر مجھے ذرہ برابر شبہ ہو جاتا کہ وہ اسمگلر ہے' تو میں سب سے پہلا فرد ہوتا جو ایران پولیس کو اس بات کی اطلاع دیتا۔" میں نے انتہائی شریفانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے" افسر نے کہا۔ اور پھر کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں کمرے کی تلاشی لے لوں۔ یقیناً آپ کے سامان میں لڑکی کا سامان بھی ضرور ہوگا۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا اور ایکسائز افسر نے اپنے ایک آدمی کو اندر بلا لیا۔ ان دونوں نے مل کر نہایت پھرتی سے میرے سامان کی تلاشی لی۔ کوشلیا کے سامان میں کپڑوں وغیرہ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میرے سامان میں بھی کوئی مشتبہ چیز نہیں تھی۔ سوائے پستول کے میں نے پستول کا لائسنس بھی افسر کے حوالے کر دیا' جسے اس نے دیکھنے کے بعد پستول سمیت قبضے میں کر لیا۔

"اس کے بارے میں ضروری کارروائی کرنے کے بعد اسے آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"ایک بات بتا دیں تو شکرگزار رہوں گا۔"

"ہاں۔ ہاں فرمایئے؟" افسر کے لہجے میں اب نرمی آگئی تھی۔

"کیا لڑکی گرفتار کر لی گئی ہے؟"

"ابھی نہیں۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ گرفتار کر لی جائے گی' اس کی کار کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ پورے شہر میں اس کار کو تلاش کیا جارہا ہے۔"

"اوہ۔" میں نے گردن ہلائی اور پھر میں ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہوٹل کے باہر ایکسائز کی پک اپ کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے پک اپ میں بیٹھنے کی پیشکش کی گئی اور پھر پک اپ اسٹارٹ ہو کر چل پڑی' ایک خوبصورت عمارت میں مجھے کئی افسروں کے سامنے لے جایا گیا۔ میرے ساتھ آنے والے افسر نے اپنی رپورٹ اور میرے کاغذات ان افسروں کے سپرد کر دیئے۔ اور افسران کاغذات کو دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے آپس میں مشورہ کے بعد کوئی فیصلہ کیا اور مجھے وہاں سے ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔

"اسے لاک اپ تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کیونکہ یہ لاک اپ کے انداز میں نہیں بنا ہوا تھا۔ لیکن باہر سے دروازہ بند کر دینے کے بعد اس کی شکل لاک اپ ہی کی سی ہو گئی۔ ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر میں نے جوتے اتارے اور دراز ہو گیا۔ یہ میری زندگی کا ایک نیا دور تھا۔ میں پولیس کی حراست میں تھا۔ ایک غیر ملک میں۔ یہاں میرا کوئی نہیں تھا۔ اور کہیں بھی میرا کوئی نہیں تھا۔ ایک تنہا' لاوارث انسان۔ گھر والوں کا تصور ہی ذہن سے نکل گیا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی تھی کہ کبھی میرا کوئی گھر بھی تھا۔ گھر۔ کیسی انوکھی چیز ہوتی ہے۔ کیسا دلکش تصور ہوتا ہے۔ لیکن یہ میرے جیسے لوگوں کے لیے تو نہیں ہوتا۔ نہ میں اس کے لائق ہوں' میں۔ جو اپنے وطن کو کچھ نہ دے سکا تھا۔ میں' جس کی شخصیت ہر ایک کے لیے بیکار ثابت ہوئی تھی۔

تنہائی تھی ------ ذہن پریشان تھا ------ ایسے میں وقت گزاری کا یہی ذریعہ ہو سکتا ہے کہ اپنے ------ یا کسی اور کے بارے میں سوچو' اپنے انجام کی مجھے کیا فکر ہو سکتی ہے ------ مجھے ایران میں منشیات کی تجارت کرنے والے لوگوں کے لیے قانون معلوم تھا۔ منشیات کے اسمگلروں کو یہاں گولی مار دی جاتی ہے۔ اگر چھٹانک بھر سیسہ۔ میرے بدن کے کسی حصے میں اتر کر میری کہانی بھی ختم کر دے تو کیا فرق پڑے گا۔ زندگی کا یہ بوجھ جس وقت بھی میرے کاندھوں سے اتر جائے۔ کیا حرج ہے۔ اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر آجائے گی۔ اور بس ------ کچھ جاننے والے اپنے ذہنوں کو ٹٹولیں گے کہیں ہمدردی کی رمق ہوگی۔ کہیں طنز بھری مسکراہٹ۔ خس کم جہاں پاک ------ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور میں نے منہ پھاڑ کر ایک طویل جماہی لی۔ ہا ------ میرے منہ سے آواز نکلی ------ میں نے ذہن میں ایک عدالت ترتیب دی۔ خود کو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ ایک فرضی وکیل تیار کیا' ایک جج۔ اور اپنا مقدمہ ان کی عدالت میں پیش کر دیا۔

"یور آنر ------" میرے وکیل نے کہا۔ "ملزم نواز اصغر ایک سیدھا سادا دیہاتی۔ جس کے باپ نے اس جذبے کے تحت اسے تعلیم دلائی تھی کہ وہ تعلیم یافتہ ہو کر ایک باعزت شہری کی

زندگی بسر کرنے کے ساتھ ملک و ملت کی حسب توفیق خدمت کرے۔ جناب والا۔ ملزم نے اسی جذبے کے تحت تعلیم حاصل کی۔ وہ مستقبل کے بارے میں بڑے بڑے خواب دیکھتا رہا۔ لیکن جب اس نے مستقبل میں قدم رکھا۔ تو اس کا ایک خواب بھی پورا نہ ہوسکا۔ اسے مایوسیوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ لیکن' ملزم کے قدم اس وقت بھی نہ بھٹکے۔ اس نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ تب ـــــــ کچھ غلط انسانوں نے اسے اپنا آلہ کار بنالیا۔ ایک ایسا شخص یور آنر۔ جو زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرچکا ہو' موم کے ڈھیر کی مانند ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی جدوجہد ختم کرچکا ہوتا ہے ـــــــ اس کی اپنی شخصیت ختم ہوچکی ہوتی ہے۔ چنانچہ موم کے اس ڈھیر کو ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ کیا آپ اسے قصوروار سمجھیں گے جناب والا۔"

"یور آنر ـــــــ" میرے مخالف وکیل نے دخل اندازی کی۔" ملزم ایک ناکارہ نوجوان تھا۔ ٹھیک ہے۔ اس نے کسی اچھے جذبے کے تحت تعلیم حاصل کی۔ اس نے ایک اچھی زندگی اپنانا چاہی اور اسے اچھی زندگی نہ مل سکی' لیکن ـــــــ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ جرائم کی طرف راغب ہوجائے۔ دنیا میں کتنے لوگ ہیں' جو بہت کچھ ہوتے ہیں لیکن منزل نہ ملنے پر سامنے کی چیز سے سمجھوتہ کرلیتے ہیں۔ ملزم نے اپنا ایک معیار کیوں مقرر کرلیا تھا۔ وہ کسی کارخانے' کسی مل میں مزدوری کرکے بھی زندگی بسر کرسکتا تھا۔ کیا کھیتوں میں ہل چلانے والے' کارخانوں میں مشینیں چلانے والے' گودی پر وزن اٹھانے والے مزدور باعزت نہیں ہوتے۔ یور آنر ـــــــ جو شخص محنت کرکے روزی کمائے' وہ ایک باعزت شہری ہے' کیونکہ نہ تو وہ جرائم کرکے ملک کی مشکلات میں اضافہ کرتا ہے۔ نہ وہ وطن کے لیے بوجھ بنتا ہے ـــــــ ممکن تھا ملزم ابتدائی زندگی گزارنے کے بعد اپنی منزل پالیتا ـــــــ لیکن وہ ایک ناکارہ انسان تھا۔ اس کی ناکارگی۔ غلط سوچ پہلے اسے خودکشی کی منزل کی طرف لے گئی ـــــــ پھر وہ جرائم کی دنیا میں داخل ہوگیا ـــــــ ایسے نوجوان ملک کے لیے بہت بڑا بوجھ' بہت بڑا خطرہ ہیں۔ معاشرے کو اس ذہنیت سے پاک ہونا چاہیے ـــــــ کوئی انسان اپنے لیے ایک راہ نہ مقرر کرلے۔ اسے صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے ملک کو دفتر کی کرسی پر بیٹھ کر احکامات چلانے والے افسروں ہی کی ضرورت نہیں بلکہ خون پسینہ ایک کرکے محنت کرنے والے مزدوروں کی بھی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب ہے اسے صرف اپنے آپ سے محبت ہے' ملک و ملت سے نہیں۔ یور آنر۔ نوجوان ذہنوں سے یہ خیال ہٹ جانا چاہیے کہ وہ تعلیم صرف اس لیے حاصل کریں کہ کسی دفتر میں افسر ہوں ـــــــ تعلیم حاصل کرکے کھیتوں میں ہل چلانے والے زیادہ اناج اگاسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ زمینوں کے بارے میں بہتر طور سے جانتے ہوں گے۔ زندگی کے ہر شعبے میں وہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے کام کرکے ملک کو کہیں سے کہیں لے جاسکتے ہیں۔ ہر شخص صرف یہ دیکھے کہ اس کی زندگی اور اس کے ملک کو کس شعبے میں کس شخص کی ضرورت ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی ملک کے حوالے کردے' اپنی انا کو ختم کردے تو ملک کہاں سے کہاں پہنچ سکتا ہے۔ لیکن ملزم کا انداز فکر یہ نہ تھا۔ ملزم۔"

ابھی میرا مخالف وکیل اسی قدر کہہ پایا تھا کہ میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ پھر چند لوگ اندر داخل ہوگئے۔ ان میں وہ بھی تھے جن سے تھوڑی دیر قبل' میں ملاقات کرچکا تھا۔

"کوشلیا کو سیل نو سے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ وہ اپنی کار سمیت یہاں پہنچ چکی ہے اور اب اس کی کار کی تلاشی لی جارہی ہے لیکن اس نے کوئی شاپنگ نہیں کی ہے۔ ایک افسر نے کہا۔

"میں کیا عرض کرسکتا ہوں۔" میں نے شانے ہلائے۔

"مسٹر نواز۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی سختی نہ ہو۔ ہم آپ سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بھی اس جرم میں شریک پائے گئے تو بہرحال آپ کے سفارت خانے کے تعاون سے ہم آپ کو بھی سزا دینے پر مجبور ہوں گے۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ آپ لڑکی کے جرم میں شریک نہیں ہیں ـــــــ اگر یہ درست ہے تو پھر ہماری مکمل ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔ ہم درخواست کریں گے کہ آپ ہماری مدد کریں۔ دوسری شکل میں بھی ہم کوشش کریں گے کہ آپ پر سے بوجھ کم ہوجائے۔"

"میں کیا مدد کرسکتا ہوں ـــــــ مجھے بتائیے۔" میں نے کہا۔

"آپ کوئی اندازہ لگاسکتے ہیں کہ اس نے یہ وقت کہاں گزارا ہوگا؟"

"یقین کیجئے ـــــــ میں کوئی اندازہ نہیں لگاسکتا۔" میں نے کہا۔

"ہوں۔" کسٹم افسر کسی سوچ میں گم ہوگیا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے دوسرے لوگوں سے کہا۔ "ٹھیک ہے مسٹر نواز اصغر' اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کرنا چاہتے' ہمیں خود ہی کام کرنا ہوگا! شکریہ مسٹر نواز۔" اور پھر وہ سب ایک ایک کرکے کمرے سے نکل گئے۔ میرا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا تھا۔

کیا کوشلیا کو میری گرفتاری کا علم ہوگیا ہے؟ ہو ہی گیا ہوگا۔ ظاہر ہے وہ کمرے میں واپس آئی ہوگی اور اسے کسٹم افسروں نے چھاپ لیا ہوگا۔ لیکن اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کوشلیا نے آخری وقت میں اپنا راز مجھ پر ظاہر کردیا تھا۔ بہرحال اس کے خلوص پر اب میں کوئی شک نہیں کرسکتا تھا ـــــــ لیکن ـــــــ مجھے کسی کا خلوص کونسا چاہئے تھا۔ افغان رقاصہ بھی میرے رحم کی ملتجی تھی۔ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ میگاں ـــــــ اگر میں اسے سہارا دیتا تو ممکن تھا اس نے جو کچھ کہا تھا وہ کر دکھاتی۔ ایک بھٹکنے والی لڑکی کو راہ راست پر لے آنا بہت بڑا ثواب تھا۔ ان دونوں کی بہ نسبت کوشلیا تو پھر بھی اپنی حیثیت رکھتی تھی۔

اور پھر میں بذات خود کیا تھا ـــــــ احمق لڑکیاں مجھے ستون سمجھتی ہیں' حالانکہ میں ایک کھوکھلا ستون ہوں' جس کا سہارا کسی بھی وقت تباہی لاسکتا ہے۔ مجھے خود اپنی سلامتی کی فکر کرنی چاہیے۔ جہنم میں جائیں کوشلیا اور دوسرے۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا! خود میرا کردار کیا ہے۔ ایک بے ضمیر انسان۔ جو زمین کے سینے پر ایک ناسور کی حیثیت سے ابھر آیا ہے۔ اپنی کریہہ اور تکلیف دہ شخصیت کو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا ہے۔ ابھی تو مجھے خود اپنے آپ کو دیکھنا تھا۔ غلام سیٹھ ـــــــ میرا باس ـــــــ میرا آقا ـــــــ اسے میری گرفتاری نہ جانے کس قدر مہنگی پڑے! بیکار ہے کسی کے

بارے میں کچھ سوچنا۔ بیکار ہے۔ صرف وہ کرو جس میں اپنی بچت ہو۔

اور میں ایک خود غرض انسان بن گیا۔ گناہ ثواب۔ جو کچھ کرچکا ہوں اس کے سامنے اب ان الفاظ کی کیا اہمیت رہتی ہے۔ میرا دل سخت ہو گیا۔۔۔۔۔ کوشلیا کا چہرہ میرے لیے اجنبی بن گیا۔ میں اطمینان سے کرسی میں دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے لیے کافی آئی اور میں نے اطمینان سے کافی پی۔

وہ رات مجھے اسی کمرے میں گزارنی پڑی۔ کسی قسم کی کوئی تکلیف مجھے نہیں ہوئی تھی۔

دوسرے دن ناشتے کے وقت مجھے کمرے سے نکالا گیا اور اسی عمارت کے دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں کئی آدمی موجود تھے۔ اور ان میں وہ کسٹم افسر بھی تھا جس سے میری سرحد چوکی پر ملاقات ہوئی تھی۔

اسے دیکھ کر میں چونک پڑا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ان سب نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا تھا اور بڑے اہتمام سے مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی گئی۔ میں بیٹھ گیا تو ملازم قسم کے لوگوں نے ناشتہ لگا دیا اور ہم نے نہایت خاموشی سے ناشتہ کیا۔ اس دوران ان لوگوں کے رویئے پر میرا ذہن الجھتا رہا۔ خود کو ان کے سوالات کے لیے تیار کرتا رہا۔ اور جب ناشتہ ختم ہوا تو میں ان سے گفتگو کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

پھر ناشتہ ختم ہو گیا۔ "ایک کپ کافی اور۔" ایک افسر نے مجھے پیشکش کی اور میں نے انکار نہیں کیا۔

"یہ جمشید عظمی ہیں۔ مقامی افسر نے سرحدی کسٹم افسر کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"جی۔" میں نے گردن ہلا دی۔

"غالباً آپ لوگوں کی پہلے ملاقات ہو چکی ہے۔"

"جی ہاں۔ میں ان کے ساتھ کافی پی چکا ہوں۔"

"خوب۔۔۔۔۔ تو مسٹر نواز۔ جمشید عظمی صاحب کا کہنا ہے کہ سرحد پر انہوں نے آپ کی کار کی تلاشی لی تھی اور آپ سے گفتگو بھی کی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"آپ نے اس ہندو لڑکی کو اپنی بیوی بتایا تھا۔"

"جی۔"

"آپ اعتراف کرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے گردن جھکا کر جواب دیا۔

"آپ کے ساتھ دو حضرات اور بھی تھے؟"

"جی۔"

"وہ کہاں گئے؟"

"جام تربت میں اتر گئے۔"

"کیا اب بھی آپ نہیں بتائیں گے مسٹر نواز۔ کہ لڑکی سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

"میں حقیقت عرض کر رہا ہوں۔ آپ کو تحقیق کا حق ہے۔ وہ صرف میری ہم سفر تھی۔۔۔۔۔ دوران سفر ہم اس قدر بے تکلف ہو گئے تھے کہ ہمارے درمیان سے تمام پردے ہٹ گئے تھے۔ میں جذباتی طور پر اس سے بے حد متاثر تھا۔ بے پناہ ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔۔۔۔۔ اس نے خود کو سیاح بتایا تھا۔ پھر اس نے پیشکش کی کہ وہ پوری زندگی میرے ساتھ بسر کرنا چاہتی ہے اور میں نے جذباتی طور پر یہ پیشکش قبول کر لی۔ اسی جذبے کے تحت میں نے اسے اپنی بیوی بتا دیا تھا۔"

"اوہ۔" افسروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہی افسر بولا۔

"کیا اب بھی آپ اسی جذبے پر قائم ہیں مسٹر نواز؟"

"اگر وہ لڑکی جرائم پیشہ ہے تو پھر میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ میں صرف ایک سیاح ہوں۔ اس کی قابلیت نے مجھے متاثر کیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ بہرحال وہ ایک عمدہ رفیق سفر بن سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ جرائم پیشہ ہے تو پھر میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"آپ۔۔۔۔۔ مذہبی رشتے سے ہمارے بھائی ہیں مسٹر نواز۔ کیا آپ ہماری اخلاقی مدد کر سکتے ہیں؟" افسر نے پوچھا۔

"میں نہیں سمجھ سکا۔"

"دراصل۔۔۔۔۔ ہم نے تحقیقات کی ہے۔ ہمارے بین الاقوامی مخبروں نے جس لڑکی کی خبر دی تھی وہ سو فیصدی اسی لڑکی کے بارے میں تھی۔ لیکن اس کی پوری کار کھول دی گئی۔ اس میں کوئی چیز نہیں ملی ہے۔ ہم اس وقفے کے متلاشی ہیں جو اس نے شاپنگ کے بہانے باہر گزارا اور ہمارا خیال ہے کہ اس دوران منشیات کہیں اتار دی گئیں۔ کہاں؟ کس جگہ "اس کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چل سکا! لڑکی نے انتہائی کوشش کے باوجود اعتراف نہیں کیا۔ ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے تحت یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس کے ساتھ آپ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس طرح ہمیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا ہے کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے درست ہے۔ ہمیں جو غلط فہمی ہوئی ہے اس کے لیے ہم معافی چاہتے ہیں اور آپ سے مدد کی درخواست کرتے ہیں۔"

"شکریہ۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"لڑکی آپ سے متاثر ہے۔ آپ یہاں چند روز قیام کریں، اس پر نگاہ رکھیں۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلا دیں اور پھر اس سے اس کے مقامی ٹھکانے کے بارے میں چالاکی سے معلوم کریں اور ہمیں اطلاع دے دیں۔۔۔۔۔ ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گے اور حکومت ایران کی طرف سے آپ کو انعام بھی پیش کیا جائے گا۔ میں گردن جھکا کر ان کی پیشکش پر غور کرنے لگا۔ بظاہر ان کی امداد بے مقصد تھی۔۔۔۔۔ مجھے کسی انعام کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ ہی میں اخلاقیات کا معلم تھا۔۔۔۔۔ مجھے حالات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ بہرحال ان لوگوں سے بگاڑنا بھی درست نہیں تھا۔۔۔۔۔ وعدہ کر لینے میں کیا حرج تھا۔ ظاہر ہے بعد میں، میں ناکامی کا اعتراف کر سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "ٹھیک ہے، جناب! حالانکہ لڑکی کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد میں اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ لیکن بہرحال میں آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ مسٹر نواز ——— ہم آپ کے بے حد مشکور ہیں۔" کسٹم آفیسرز نے باری باری مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ وہ سب خوش ہو گئے تھے۔

"پروگرام یہ ہے کہ ہم لوگ، آپ دونوں کو معذرت کرنے کے بعد رہا کردیں گے۔ آپ اطمینان سے واپس اپنے ہوٹل جائیں۔ سیرو تفریح کریں۔ آپ کے ہوٹل میں ہمارا ایک نمائندہ موجود ہوگا۔ جو ہر رات گیارہ بجے آپ سے رابطہ قائم کرے گا۔ روم نمبر ایک سو گیارہ۔ اس کمرے میں اس کا قیام ہوگا۔ براہ کرم جلد بازی سے کام نہ لیں، لڑکی بہت چالاک ہے۔ مشکل ہی سے راہ راست پر آئے گی۔ آپ کافی احتیاط سے اس سے معلومات حاصل کریں گے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ اب میں اتنا بے صلاحیت بھی نہیں ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شکریہ مسٹر نواز۔" افسروں نے کہا۔ "ہم آپ کو ابھی دفتر میں طلب کریں گے۔ لڑکی بھی وہیں ہوگی۔ آپ دونوں سے اظہار معذرت کیا جائے گا۔"

"بہتر ہے۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور کسٹم افسر ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کرکے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میرے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے ایک آرام دہ کرسی میں گر کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے اپنا ذہن آزاد چھوڑ دیا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ اس طرح گزر گئے۔ پھر دو آدمی میرے پاس آئے۔

"تشریف لائیے۔" ان میں سے ایک نے کہا اور میں ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آفیسرز کے دفتر میں تھا۔ وہاں کوشلیا بھی موجود تھی۔

"نواز۔" وہ مجھے دیکھ کر بے ساختہ بول پڑی اور میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اس کا کندھا تھپتھپانے لگا! تب کسٹم آفیسر نے گردن ہلائی اور انگلش میں بولا۔

"سوری فرینڈز۔ ہم لوگ شرمندہ ہیں کہ آپ دونوں کو تکلیف دی۔ دراصل ہمیں اطلاعات ملی تھیں کہ ایسی ہی ایک کار میں کچھ منشیات لائی جارہی ہیں۔ اطلاعات، کچھ اس قدر آپ لوگوں پر فٹ ہوتی تھیں کہ ہم یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوئے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری مجبوریوں کا احساس کرتے ہوئے ہمیں معاف کردیں گے۔"

"ٹھیک ہے آفیسر ——— ویسے آپ نے ہمارے کچھ بہترین لمحات ضائع کردیے۔" نے کہا۔

"ہمیں واقعی افسوس ہے۔" آفیسر نے شرمندگی سے کہا۔

"پھر اب کیا حکم ہے؟"

"آپ لوگ جاسکتے ہیں۔" آفیسر نے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے کوشلیا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ باہر کوشلیا کی کار موجود تھی۔ میں نے اس کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور کوشلیا میرے نزدیک آبیٹھی۔ کار کسٹم ہاؤس کی عمارت سے نکل آئی۔ اور سڑک پر دوڑنے لگی۔ کوشلیا نے تھکے تھکے انداز میں میرے شانے پر سر ٹکا دیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا۔ اس نے آسودہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"ہم ایک بڑی مصیبت سے نکل آئے ہیں نواز۔" اس نے تھکی تھکی سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ حالات نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ اگر کار خالی نہ ہو جاتی تو ہم بری طرح پھنس جاتے۔ لیکن کام بروقت ہوگیا۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل پہنچ گئے! ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کوشلیا مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے بھینچ لیا۔

"تم نے ——— تم نے میری بہت مدد کی ہے نواز۔ میں۔ میں تمہاری بے حد احسان مند ہوں۔ بے حد احسان مند ——— اگر تم انہیں میری حقیقت بتادیتے تو۔ تو مجھے گولی ماردی جاتی۔"

"لیکن اس احسان کا صلہ کب ملے گا حضور؟" میں نے ایک صوفے میں گرتے ہوئے کہا۔ کوشلیا بھی میرے اوپر گر پڑی تھی' اس نے میرے سینے میں منہ چھپا کر شرماتے ہوئے کہا۔

"صرف دو دن اور۔ میں۔ میں شرمندہ ہوں نواز۔ صرف دو دن اور صبر کرلو۔" وہ میرے جسم میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ لیکن اس وقت اس کی یہ گرمجوشی' یہ محبت میرے لیے بیکار تھی۔ الٹی مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ اس وقت جب وہ میرے پہلو میں منہ چھپائے گہری نیند سو رہی تھی' میں کچھ فیصلے کر رہا تھا میں سوچ رہا تھا کہ اب اس سے پیچھا چھڑالوں۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ ایران پولیس کے لیے کام کروں۔ میں ایک سیاح تھا۔ مجھے ان جھگڑوں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھیں یہاں سے مجھے ترکی جانا تھا۔ کافی رات گئے تک میں اس سلسلے میں پروگرام بناتا رہا۔ اور پھر مجھے بھی نیند آگئی۔

دوسری صبح جب آنکھ کھلی تو کوشلیا ایک صوفے میں دراز اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ نکھرا نکھرا تھا۔ غسل کرکے آئی تھی' خوبصورت بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شاید اس نے انہیں ٹھیک سے خشک نہیں کیا تھا۔ چونکہ وہ اخبار میں مصروف تھی اس لیے مجھے جاگتے نہ دیکھ سکی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔

نہ جانے کیوں اس وقت کوشلیا مجھے بہت حسین نظر آئی۔ سبک نقش و نگار' حسین گردن' گداز شانے' سانچے میں ڈھلا ہوا جسم' بلاشبہ وہ ایک حسین عورت تھی۔ ساڑھی میں پوشیدہ اس

جسم کے ایک ایک نقش سے مجھے واقفیت تھی۔ یہ سب کچھ میری دسترس میں تھا۔ ان سب کا حصول میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ پھر۔ کیا اس خوبصورت جسم کو اتنی جلدی چھوڑ دوں؟ کیا اس نعمت سے منہ پھیر کر گزر جاؤں؟ یہ تو بے وقوفی ہوگی۔ یہ تو حماقت ہے۔ چند روز اور سہی۔ کیا حرج ہے۔ میں کونسا مصروف آدمی ہوں۔ وہ بھی آزاد ہے۔ اس کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اور رات کے کیے ہوئے فیصلے میں نے فوری طور پر ملتوی کر دیئے۔ اور پھر میں ایک طویل انگڑائی لے کر اٹھ گیا۔

کوشلیا نے جلدی سے اخبار رکھ دی۔ اٹھی۔ حسین ساڑھی میں وہ بالکل ایک گھریلو عورت لگ رہی تھی' اس کی پیار بھری مسکراہٹ بڑی دلاویز تھی۔ میں اس مسکراہٹ کا کیا جواب دوں میں کیسا انسان ہوں۔ میرا ذہن اس قدر بھٹکا ہوا کیوں ہے۔ پوری دنیا ایک فریب ہے۔ ہم ایک دوسرے کے فریب سے واقف ہیں------ لیکن فریب کھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ہم جان بوجھ کر کیوں فریب کھاتے ہیں؟ یہ لڑکی دنیا کی سب سے پارسا عورت نہیں ہے۔ میں اس کی وقتی ضرورت ہوں------ یہ میری وقتی ضرورت ہے------ ہم دونوں اس ضرورت کو دائمی ظاہر کر کے ایک دوسرے کو فریب دے رہے ہیں۔ فریب کھا رہے ہیں۔

لیکن کیا میں بھی فریب کھانے والوں میں شامل ہوں؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ اور جواب نفی میں ملا۔ نہیں۔ میں تو صرف فریب دے رہا ہوں۔ میں دل سے کب چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کو اپنی زندگی کا ساتھی بناؤں۔ سوچتا بھی کیوں------ کس برتے پر۔ کیا میں یہ حیثیت رکھتا ہوں۔

وہ کچی ہے------ مجھ پر ظاہر ہوگئی------ لیکن میں ابھی تک ایک بند کتاب ہوں۔ وہ میرا ایک صفحہ بھی نہیں پڑھ سکی ہے------ اور اس کی عدم واقفیت ہی مناسب ہے'------ مجھے اپنی فطرت کے اس کمزور پہلو کو درست کرنا ہوگا۔ میرا ضمیر ابھی تک گناہ ثواب کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ اور یہ گناہ ثواب کا چکر ایک روز مجھے لے ڈوبے گا۔ نہیں میں ڈوبنا نہیں چاہتا۔ آخر کونسی کمی ہے مجھ میں------ دنیا فریب پر زندہ ہے۔ میں بھی ایک ذہین آدمی ہوں------ میں نے خود کو کچل کیوں دیا ہے' جب میں نے اپنی پسند کی زندگی اپنانے کی کوشش کی تھی------ تو دنیا نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے موت کی منزلوں تک پہنچا دیا۔ اگر میں مرجاتا تو اس دنیا میں کونسا انقلاب آجاتا------ ممکن ہے سمندر سے میری لاش بھی برآمد نہ ہوتی------ میں مچھلیوں کی خوراک بن جاتا۔ یا اگر لاش مل بھی جاتی تو کیا ہوتا------ اخبارات میں ایک آدھ دن تصویر چھپ جاتی اور پھر میری لاش میڈیکل کالج کے طلباء کے کام آتی۔ وہ چیر پھاڑ کرتے۔ اور اس طرح میری زندگی کی کہانی ختم ہو جاتی۔

لیکن۔ پھر دنیا نے مجھے اپنی پسند کی زندگی دی۔ میں نے اس زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔ تو پھر میں اس دنیا کی بھلائی کا بوجھ کیوں سمیٹے پھروں؟ مجھے تو ایک بے ضمیر انسان ہونا چاہیے۔ ایک ایسا انسان جس کا دل میڈیکل کالج کی لیبارٹری کے کسی جار میں محفوظ ہو۔ بیکار ہے۔ مکاری کرو۔ زندگی گزار دو۔ نوچ پھینکو بدن سے ان شرافت کے لبادوں کو------ ایک خود غرض' فریبی اور مکار

انسان' جسے صرف خود سے ہمدردی تھی۔ دوسروں کی جس کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہ تھی۔

اور یہ حقیقت ہے جناب------ کہ اس دن سے میری زندگی بدل گئی۔ میں نے ضمیر کے آخری کانٹے کو بھی نکال پھینکا۔ اور اس فریبی دور کا فریبی انسان بن گیا------ چنانچہ کوشلیا کی پیار بھری مسکراہٹ کے جواب میں اس سے زیادہ پیار بھری مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آگئی تھی۔

"کیا سوچ رہے تھے نواز؟" اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔

"خود پر یقین کر رہا تھا۔"

"میں نہیں سمجھی؟"

"تم بے حد حسین ہو کوشلیا۔ میں خود کو یقین دلا رہا تھا۔ کہ تم میری ہو۔ میری اپنی۔ مگر دل کمبخت نہیں مان رہا تھا۔ وہ وسوسوں کا شکار تھا۔"

کوشلیا مجھ سے لپٹ گئی۔ "میرا رواں رواں تمہارا ہے نواز۔ میرا ایک ایک انگ تمہارا ہے۔ تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔ تم خود کو کسی سے کمتر کیوں سمجھتے ہو۔ تم بھی تو ایک عظیم انسان ہو۔ مردانہ خوبیوں کا مرقع۔ تم نے مجھے معاف کر دیا۔ مجھ فریبی کو۔ تم نے میگاں کو ٹھکرا دیا۔ کیونکہ تم مرد ہو۔ عورت کے بھرپور حقدار' کوئی آبرو باختہ تمہیں کیوں پسند آئے۔ میں تمہارے قدموں میں رہ کر زندگی کی ہر منزل پالوں گی۔ میں اب اپنی آئندہ زندگی کا پروگرام تمہاری مرضی سے بناؤں گی۔"

اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور پھر ایک طویل بوسے سے فارغ ہو کر میں نے اس سے باتھ روم میں جانے کی اجازت چاہی۔ غسل سے فارغ ہو کر میں نے ناشتہ منگوایا۔ اور ہم دونوں ناشتہ کرنے لگے' پھر ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے کوشلیا سے آج کا پروگرام پوچھا۔

"میں متردد ہوں نواز------ جاننا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھیوں کو بھی میری گرفتاری کی اطلاع ملی تھی یا نہیں؟"

"ہاں------ یہ تشویش کی بات ہے۔ انہوں نے ابھی تک تمہاری خیریت نہیں دریافت کی۔"

"اگر انہیں علم ہوگیا ہے تو وہ کسی طور یہاں آنے کی کوشش نہیں کریں گے------ انہیں خطرہ ہوگا کہ کسٹم والے میری نگرانی نہ کر رہے ہوں۔ نہ ہی وہ فون کریں گے۔"

"اوہ۔ پھر؟"

"حالات ٹھیک ہو جانے کی اطلاع دینے کے لیے مجھے خود ہی باہر نکلنا ہوگا! اس کے علاوہ ان سے رقم بھی لینی ہے۔ اور آئندہ کا پروگرام بھی بنانا ہے!"

"دوپہر تک کی اجازت دے دو۔ یہاں سے جاؤں گی اور اندازہ کروں گی کہ میرا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ پھر یقین ہونے کے بعد کسی پبلک کال بوتھ سے فون کروں گی اور انہیں صورت حال کی اطلاع دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میری ضرورت ہو تو------!"

"نہیں نواز۔ وہ لوگ ابھی تمہیں برداشت نہیں کریں گے' تم آرام کرو۔ میں دوپہر تک

واپس آجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"تم اگر کہیں جانا چاہو تو جاسکتے ہو۔"

"مجھے کہاں جانا ہے۔ یہیں آرام کروں گا۔" میں نے کہا اور کوشلیا اٹھ گئی۔ اس نے مجھے پیار کیا اور اپنا پرس لے کر باہر نکل گئی ----- میں اسے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد کافی دیر تک میں یونہی خالی الذہن بیٹھا رہا' اور پھر میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا۔ بیرا ہوگا' چنانچہ میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی' لیکن اندر آنے والے کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔ درمیانے جسم کا ایک اسمارٹ سا آدمی تھا۔ مقامی ہی معلوم ہوتا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے مجھے سلام کیا۔ اور پھر جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر میرے سامنے کردیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی' کسٹم کا آدمی تھا۔

"تشریف رکھیے۔"

"روم نمبر ایک سو گیارہ کے مکین کے بارے میں آپ کو اطلاع دے دی گئی ہے جناب۔" اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ----- لیکن کیا اس کا تعاقب کیا جارہا ہے؟" میں نے ایک دم پوچھا۔

"نہیں ----- یہ مناسب نہیں سمجھا گیا ----- اگر اسے شک ہوگیا تو کام بگڑ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مکمل طور سے آپ پر بھروسہ کیا گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ مناسب ہے۔ تعاقب کا شبہ اسے بھی ہوگا اور وہ اس کا خیال رکھے گی۔"

"بہت خوب۔ لیکن وہ اس وقت کہاں گئی ہے؟"

"مجھ سے شاپنگ کے لیے ہی کہہ گئی ہے۔"

"آپ نے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی؟"

"یقیناً ----- لیکن کیا فوری طور پر یہ سب کچھ ممکن ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اوہ نہیں ----- نہ ہی میرے اس سوال کا یہ مقصد تھا۔ بس میں نے سوچا آپ سے تعارف حاصل کرلیا جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔"

"اجازت۔" وہ کھڑا ہوگیا اور پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ایک گہری سانس لی اور مسکراتا ہوا آرام کرسی میں گھس گیا۔ ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک بار پھر دستک ہوئی اور میں چونک پڑا۔ اس بار میں خود ہی دروازے تک گیا تھا۔ لیکن دروازے کے باہر بیرا کھڑا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ اور اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے حیرت سے لفافہ کھولا۔ اندر ایک چھوٹا سا پرزہ رکھا ہوا تھا جس پر صرف ایک لائن درج تھی۔

"روم نمبر چھتیس میں پہنچو۔ غلام۔"

"میرے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بیرا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔

چنانچہ میں نے جلدی سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

اور وہ سلام کرکے چلا گیا۔ میں نے تحریر پھر پڑھی۔ کیا درحقیقت یہ غلام سیٹھ کی تحریر ہے؟ لیکن وہ یہاں کہاں؟ بہرحال دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے لباس درست کیا۔ لفافہ جیب میں رکھا اور کمرے سے نکل آیا۔ کمرے کو لاک کرکے میں سیڑھیوں کے ذریعے نیچے پہنچ گیا۔ روم نمبر چھتیس پہلی منزل پر تھا۔ اس دوران میں نے خیال رکھا تھا کہ کسٹم کا نمائندہ کہیں میری ہی تو نگرانی نہیں کررہا کیا ضروری تھا۔ کہ انھوں نے میرے اوپر اعتماد کرہی لیا ہو۔ لیکن خیریت ہی تھی۔ میں نے کمرہ نمبر چھتیس تلاش کیا اور آہستہ سے اس کے دروازے پر دستک دی۔

"آجاؤ۔" اندر سے غلام سیٹھ کی آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔ میں ایک گہری سانس لے کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر غلام سیٹھ موجود تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک اور شاندار آدمی تھا۔ بے شکن سوٹ پہنے ہوئے ایک طویل القامت آدمی جس کی گھنی قلمیں سفید تھی باقی بال سیاہ۔ اس کا چہرہ بھی سرخ و سفید تھا اور اس پر بھرپور زندگی رقصاں تھی۔

"دروازہ بند کردو نواز؟" غلام سیٹھ نے کہا اور میں نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ویسے میں نے آنے والے لمحات کے لیے خود کو تیار کرلیا تھا۔ نہ جانے غلام سیٹھ کس مقصد کے لیے یہاں آیا ہے اور یہ شاندار آدمی کون ہے؟ دروازہ بند کرکے میں ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔

"کیسے ہو؟" غلام سیٹھ نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔

"شکریہ جناب۔ بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ان سے ملو۔ یہ میرے دوست ناصر یمانی ہیں۔ ہمارے مقامی کارندے۔" غلام سیٹھ نے کہا اور طویل القامت آدمی نے گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر غلام سیٹھ نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی یمانی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"مسٹر یمانی سے مجھے تمہارے ساتھ پیش آنے والے موجودہ واقعات کا پتہ چلا اور میں خود ہی یہاں پہنچ گیا۔ درحقیقت اتفاقیہ طور پر ایک بہترین موقع ہاتھ آگیا۔ میں نے سوچا اس وقت تم سے براہ راست گفتگو مناسب رہے گی۔"

"جی؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔

"ہاں۔" غلام سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے تم سے کہہ دیا تھا نواز ----- کہ تمہیں کسی بھی علاقے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہر جگہ میرے آدمی موجود ہیں۔ تمہیں شاید میری بات پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔"

"مجھے حیرت ہوئی ہے غلام سیٹھ۔" میں نے اعتراف کیا۔

"چپے چپے پر تمہاری حفاظت کی گئی ہے نواز۔ یوں بھی بلاشبہ تم ہمارے بہترین کارکن ثابت ہوئے ہو۔ تمہاری اب تک کی کاوشوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ تم ہمارے معیار پر پورے اترے ہو۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ تمہیں ترقی دے دی جائے۔" غلام سیٹھ نے کہا۔ مجھے درحقیقت شدید حیرت تھی۔ حالانکہ میں نے ایکبار بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ کچھ پراسرار لوگ میری نگرانی کر رہے تھے۔ آخر وہ کہاں پوشیدہ تھے۔ نہ ہی میرے خیال میں' میں نے اب تک کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا تھا جو بڑی حیثیت کا حامل ہو۔ کہیں غلام سیٹھ مجھ پر طنز تو نہیں کر رہا؟ لیکن غلام سیٹھ کے لہجے سے ایسی کوئی بات مترشح نہیں تھی۔

بہرحال سب سے پہلے موجودہ حالات پر گفتگو کرلی جائے۔" غلام سیٹھ نے کہا۔

"جی۔" میں نے طویل سانس لی۔

"ویسے اس دوران تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یہ احساس رہا کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"اوہ۔ کیوں؟" تم نے ایسا کیوں سوچا۔ میرا تو خیال ہے کہ تم نہایت سلیقے سے اپنا کردار انجام دے رہے ہو۔ تمہاری رپورٹیں بھی انتہائی جامع تھیں۔ ہم پورے طور پر تم سے مطمئن ہیں۔"

"شکریہ۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"لڑکی کے بارے میں مفصل حالات بتاؤ۔ کیا وہ تم سے کچھ کھلی ہے؟"

"ہاں۔ وہ ہیروئن لائی تھی' جو کار کے مخصوص پرزوں میں پوشیدہ تھی۔ لیکن وہ مال اڈے پر پہنچا چکی ہے۔"

"کس کے لیے کام کر رہی ہے؟"

"ٹھاکر کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔ اور غلام سیٹھ اچھل پڑا۔ یمانی بھی حیرت زدہ انداز میں پہلو بدل رہا تھا۔

"اور تم کہہ رہے ہو کہ ابھی تم نے کوئی کام نہیں کیا۔ ارے یہی کام تم نے لاکھوں روپے کیا ہے۔ کیوں یمانی میرا اندازہ غلط تھا؟"

"حیرت انگیز جناب۔۔۔۔۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ ٹھاکر نے یہاں اتنی احتیاط سے قدم جمائے ہوئے ہیں۔" یمانی نے متعجب لہجے میں کہا۔

"میرے پاس بہت دن کی اطلاعات تھی۔ لیکن بس کوئی داؤ نہیں لگ رہا تھا۔ ویسے یار ہوشیار آدمی ہے۔ یہ ماننا پڑے گا۔ ایران میں دھندہ کرنا معمولی دل گردے کا کام نہیں ہے۔" غلام سیٹھ تعریفی انداز میں بولا۔ پھر میری طرف رخ کر کے اس نے کہا۔ "لڑکی تم پر اعتماد کرتی ہے۔ نواز؟"

"ہاں۔"

"اس نے تمہیں اور کیا بتایا؟"

"بس اس سے زیادہ نہیں۔"

"اڈے کا پتہ بتا سکتی ہے؟"

"میں کوشش کر سکتا ہوں جناب۔" میں نے جواب دیا۔

"خیر۔ کسٹم والوں سے کیا بات چیت ہوئی؟" غلام سیٹھ نے پوچھا۔ اب کسی بات پر حیرت بیکار تھی۔ میں جان گیا تھا کہ حیرت انگیز طریقے پر میرے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی رہی ہیں۔ چنانچہ میں نے کسٹم ہاؤس کی پوری کہانی سنا دی۔ غلام سیٹھ کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ یمانی بھی دلچسپی سے میری رپورٹ سن رہا تھا۔

میرے خاموش ہوتے ہی غلام سیٹھ نے خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "ونڈر فل نواز۔ تم ضرورت سے زیادہ شاندار آدمی نکلے۔ کیوں یمانی۔۔۔۔۔ آخر میرے آدمی نے ٹھاکر کو چت کر دیا نا۔ بس نواز۔۔۔۔۔ اب آخری چوٹ اور لگا دو پیارے۔ تم بہت چالاکی سے لڑکی سے اڈے کے بارے میں معلومات حاصل کرو اور پھر کسٹم والوں کو اس کی اطلاع دے دو بس۔۔۔۔۔ تمہارا کام یہاں سے ختم۔ اس کے بعد جب تمہیں اطمینان ہو جائے کہ کسٹم والے تمہاری طرف متوجہ نہیں ہیں تو یمانی سے مل لینا۔ تمہیں آئندہ کے لیے ہدایات مل جائیں گی۔ ممکن ہے میں بھی دوبارہ تم سے ملاقات کروں۔ بس اب تم جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ایک کپ چائے بھی نہیں پی سکتا۔ ممکن ہے لڑکی جلد واپس آ جائے۔"

"اوکے باس؟" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ ہی وہ دونوں بھی اٹھے اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں کمرے سے نکل آیا۔ اور چاروں طرف دیکھتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کا دروازہ میں نے اندر سے بند کرلیا اور ایک صوفے پر گر پڑا۔ میری عجیب حالت ہو رہی تھی کچھ انکشافات' کچھ دوسرے خیالات۔ میرے اوپر اس قدر گہری نگاہ رکھی جا رہی ہے۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا۔ اگر کسی وقت میں لوگوں سے اکتا کر کوئی اور قدم اٹھانے کی کوشش کرتا تو یقیناً مجھے روکا جا سکتا تھا۔ اور پھر کوشلیا۔ تو اس بدنصیب لڑکی کی بربادی بھی میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔

ٹھیک ہے۔ میری کون لگتی ہے سسری کہیں کی۔ لیکن۔ کم از کم ایک دو راتیں اور مل جائیں۔ تاکہ میں اس کے حسن سے سیراب ہو جاؤں۔ اس میں کیا حرج ہے۔ میں مطالبہ کرنے والوں کو ٹال بھی تو سکتا ہوں۔

کوشلیا کی واپسی ایک بجے ہوئی۔ اس کا چہرہ اترا اترا تھا "خیریت کوشلیا؟" میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔ خاصی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔"

"اوہ۔ کیا تمہارا اندیشہ درست نکلا؟"

"نہیں۔ کسٹم والے میری طرف سے شاید مطمئن ہو چکے ہیں۔" کوشلیا نے کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔ وہ جھک کر جوتے اتار رہی تھی۔

"ان لوگوں سے ملاقات ہوئی؟"

"ہاں۔" کوشلیا نے مختصراً کہا۔ پھر بولی۔ "بھوک لگ رہی ہے نواز۔ کھانا منگواؤ۔"

میں نے اٹھ کر بیرے کو بلانے کے لیے گھنٹی بجادی۔ اور کوشلیا باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ پھر جب بیرا کھانا لے کر آیا تو وہ واپس آچکی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ تاہم میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ البتہ میں نے بھی کسی قدر سنجیدگی اختیار کرلی تھی، جسے کھانے کے دوران کوشلیا نے محسوس کرلیا۔

"کیا سوچ رہے ہو نواز؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ شاید کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا پسند نہیں کرتیں۔"

"نہیں نواز۔ اب تم سے کونسی بات چھپی رہ گئی ہے۔ میں نے خود کو تم پر عیاں کردیا ہے۔ اب کونسی بات تم سے چھپاؤں گی۔"

"لیکن میں تمہارے چہرے پر کچھ خاص باتیں نوٹ کررہا ہوں۔"

"میں نے مطمئن ہونے کے بعد انہیں فون کیا۔ مقامی مینجر نے مجھ سے ملاقات کی اور پھر اطمینان ہونے کے بعد مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس سے کافی تلخ کلامی ہوئی۔" کوشلیا نے بتایا۔

"اوہ۔ کیوں؟"

"موضوع تم ہی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمہاری وجہ سے کسٹم والوں کو شبہ ہوا۔ تب میں نے ان گدھوں کو بتایا کہ تمہاری وجہ سے مجھے کامیابی نصیب ہوئی ورنہ کھیل بگڑ چکا تھا۔"

"اوہ۔ پھر؟"

"بس۔ وہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میری حیثیت اس سے بڑی ہے اس لیے کوئی بدتمیزی تو نہیں کرسکتا۔ میں نے مینجر کو کافی برا بھلا کہا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ ٹھاکر کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ ٹھاکر کل صبح تک پہنچ جائے گا۔ وہی مجھ سے بات کرے گا۔"

"اوہ۔" میں نے ہونٹ سکوڑ لیے۔ "یہ تو اچھا نہیں ہوا کوشلیا کہیں وہ لوگ تم سے ناراض نہ ہوجائیں۔"

"میں اسی لیے پریشان ہوں نواز۔ بہرحال، اب جو کچھ ہوگا۔ بھگتوں گی، تم مجھے ایک بات بتاؤ۔" اس نے کہا اور میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں یہ کام جاری رکھوں یا چھوڑ دوں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں کوشل؟" میں نے کہا۔

"میں وہی کروں گی جو تم کہو گے۔ یوں سمجھ لو۔ ہم یہاں سے آگے بڑھیں گے۔ ترکی جائیں گے، پھر وہاں سے آگے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ صرف تھوڑی احتیاط سے کام کرنا ہے اور بس۔ دولت کی کوئی کمی نہیں۔ جہاں جائیں عیش کریں۔ دراصل میں ٹھاکر سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر میں اسے تمہارے اوپر اعتماد دلانے میں کامیاب ہوگئی تو پھر میں اس سے کہوں گی کہ

تمہیں بھی گروہ میں شریک کرلیا جائے۔ اور اگر وہ تمہارے اوپر اعتبار کرنے پر تیار نہ ہوا تو پھر میں بھی یہ گروہ چھوڑ دوں گی۔ اور ہم کسی دوسرے طریقے سے زندگی گزارنے کے بارے میں سوچیں گے۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر ٹھاکر تیار ہوجائے تو کیا تم بھی تیار ہوجاؤ گے۔"

"میں تم سے الگ کہاں ہوں کوشل۔ میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا اور وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

"تم نے میری تمام الجھن دور کردی نواز۔ اب مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے بس اب ٹھاکر سے صاف صاف بات ہوگی۔ اسے میری نجی زندگی پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"خود تمہیں میرے اوپر مکمل اعتماد ہے کوشل؟" میں نے پوچھا

"یہ پوچھنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے نواز؟" کوشلیا نے محبت بھرے انداز سے کہا۔

"تب مجھے چند باتیں بتاؤ۔"

"ضرور پوچھو۔" کوشلیا نے مستعدی سے کہا۔

"پہلی بات۔ کیا ٹھاکر میرے سلسلے میں تمہارے ساتھ سختی بھی برت سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے وہ تمہیں اس کے لیے مجبور کرنا چاہے کہ تم مجھے چھوڑ دو۔ اور تم اس سے انکار کردو تو کیا وہ تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک کرسکتا ہے؟"

"امکانات تو نہیں ہیں نواز۔ لیکن برے لوگ، بری بات۔ ہوسکتا ہے۔" کوشلیا نے کہا۔

"دوسری بات۔ اگر تم گروہ سے علیحدگی کا فیصلہ کرلو۔ تو کیا وہ لوگ تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ انہیں خطرہ رہے گا کہ تم گروہ کے راز افشاء نہ کردو۔"

"اس کے امکانات ہیں نواز۔ لیکن بہرحال میں بھی انہی سے تعلق رکھتی ہوں اور ان سے کسی طرح کم نہیں ہوں۔ پھر میں ٹھاکر سے صرف معاملے کی بات کروں گی، میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اسے ایک ممبر دوں گی گروہ میں کسی نئے ممبر کی شمولیت کے لیے کوئی بھی پرانا ممبر ضمانت دے سکتا ہے۔ یہ گروہ کا قانون ہے۔ پرانے ممبر کو نئے ممبر کی پوری پوری ذمہ داری لینی پڑتی ہے، سو وہ ذمہ داری میں لے لوں گی، ٹھاکر کو اور کیا چاہیے۔"

"ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ اور پھر گردن ہلاتے ہوئے میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے کوشل۔ اپنے معاملات تم خود بہتر سمجھتی ہو۔ لیکن میں تم سے ایک درخواست ضرور کروں گا۔"

"کیا؟" کوشلیا نے میرے رخسار سے اپنا گال رگڑتے ہوئے محبت سے کہا۔

"ٹھاکر سے ملاقات کرنے جاؤ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلنا۔"

"کیوں؟"

"خطرناک لمحات میں، میں تم سے دور نہیں رہنا چاہتا۔"

"اوہ۔ نواز۔ میری زندگی۔ میں تمہاری محبت پر فخر کرتی ہوں۔ تم فکر نہ کرو میری روح۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے ورنہ میں تمہیں ضرور ساتھ لے چلتی۔"

"کیا مناسب نہیں ہے۔"

"کسی بھی نئے آدمی کو اس وقت تک گروہ کی برانچ کے بارے میں نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ جب تک وہ قابل اعتماد ممبر نہ بن جائے۔ شروع میں نئے ممبروں کو برانچ کا پتہ بھی نہیں بتایا جاتا۔ ان سے صرف ہوٹلوں میں رابطہ قائم کیا جاتا ہے اور وہیں معاملات نپٹا لیے جاتے ہیں۔ اگر یہ قدم اٹھاؤں گی تو گروہ کے قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔"

"گویا خود تمہیں بھی ابھی میرے اوپر اعتماد نہیں ہے۔"

"مجھے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے تو اپنے آپ سے زیادہ تم پر اعتماد ہے نواز۔ لیکن یقین کرو یہ مناسب نہ ہوگا۔ ورنہ میں منع نہ کرتی۔"

"اچھا تو مجھے اس جگہ کا پتہ ہی بتادو۔ اگر تمہیں ذرا بھی دیر ہوگئی تو میں بیمار ہو جاؤں گا کوشلیا۔"

"نواز۔ میرے نواز۔ تمہاری محبت اس قدر شدید ہے' مجھے گمان نہیں تھا۔ میں اپنی قسمت پر جس قدر ناز کروں کم ہے۔ میں اپنے طور پر تمہیں پتہ بتائے دیتی ہوں۔ لیکن عمارت سے دور رہنا۔ ممکن ہے بہت جلد میں تمہیں ٹھاکر سے ملاؤں۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے تمہیں کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ لیکن کم از کم مجھے یہ تو معلوم رہنا چاہیے کہ تم خطرناک لوگوں سے گفتگو کرنے کہاں گئی ہو۔ تاکہ اگر تم خطرے میں پھنس جاؤ۔ تو میں صرف تمہارا انتظار ہی کرتا رہوں۔"

"تمہاری تشویش بجا ہے۔ لیکن اس کے امکانات صرف پانچ فیصد ہیں۔ تاہم عمارت کا پتہ نوٹ کرلو تاکہ تمہیں تشویش نہ رہے۔ وہ نریمان چیمبر کے نام سے مشہور ہے۔ فیلر اسٹریٹ پر واقع ہے۔ بہت بڑی عمارت ہے' پوری بلڈنگ انہیں کے قبضے میں ہے۔ بظاہر یہاں الگ الگ خاندان رہتے ہیں' جو مختلف دفاتر اور فرموں میں کام کرتے ہیں لیکن صرف دکھانے کے لیے۔ ان کا اصل کام یہی ہے۔ سب ٹھاکر کے آدمی ہیں۔" کوشلیا نے بتایا۔

"کافی ہے۔" میں نے اسے آغوش میں بھینچتے ہوئے کہا اور پھر میں عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر نشیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔"

"کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"بس بتانے کی نہیں۔ سمجھنے کی بات ہے۔" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ اور میرے سینے میں منہ چھپالیا۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لیکن اس کی سرمگیں مسکراہٹ اور آنکھوں میں تیرتے ہوئے نشے سے کچھ اندازہ ہوا۔

"بتا بھی دو ڈارلنگ۔ میں نہیں سمجھ سکا" میں نے کہا۔ اس نے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔ آنکھوں سے دل کی بات کہی اور پھر مجھے بدھو سمجھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے گداز سینے پر رکھ لیا۔

"اوہ۔" میں خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ گویا یہ آخری رات محرومی کی رات نہیں ہے۔ یقیناً اس رات سے جس قدر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اٹھالیا جائے۔ کیونکہ اس کے بعد کوئی رات نہیں آئے

گی۔ اور میں نے اس رات کو جاوداں کرلیا۔ صبح کی روشنی کی کرنیں کمرے کے دروازے اور کھڑکیوں کی جھری سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگیں تو میں نے کوشلیا کو سونے کی اجازت دے دی۔ اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی اور میری کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔

دوسرے دن تقریباً بارہ بجے ہم دونوں جاگے۔ حالت خراب تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ کوشلیا کی مسکراہٹ میں حیا تھی اور میری مسکراہٹ فاتحانہ۔

"نواز۔" اس نے ناز سے کہا۔

"جانم۔"

"اب اٹھو بھی۔" اس نے سسکی لی۔

"میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہوچکا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور وہ ہنس پڑی۔

"تب پھر بیرے کو بلانے کے لیے گھنٹی کون بجائے۔ بیرا آئے تو ہم اس سے کہیں کہ ہمارے لیے ایک ایک وہیل چیئر کا بندوبست کردے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تجویز معقول ہے۔ دیکھو میں کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اور ایک گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔ ڈگمگاتے قدموں سے میں باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ منہ کا مزا خراب تھا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ کپڑے اتار کر باتھ روم کے نل کے نیچے بیٹھ گیا اور ٹھنڈے پانی کی موٹی پھوار سر پر پڑنے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا تب جاکر دماغ اصل حالت پر آیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد میں باہر نکل آیا کوشلیا اسی طرح ایک چادر لپیٹے پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں' ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس نے گلابی آنکھیں کھول دیں اور پھر وہ ایک گہری سانس لے کر چادر بدن پر درست کرتی ہوئی اٹھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم ناشتہ کر رہے تھے۔ دونوں کے چہرے سے تھکن کے آثار ہویدا تھے۔ ناشتہ بھی خوب ڈٹ کر کیا گیا۔ اور اس کے بعد کوشلیا ایک آرام کرسی میں دراز ہوگئی۔ میں مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور وہ شرماتی رہی۔

"کوشل۔" میں نے اسے آواز دی۔ اور اس نے میری طرف دیکھا۔ "ناراض ہو؟" میں نے پوچھا۔ اور اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھی اور مسہری پر میرے پاس آگئی۔

"بیرا برتن لینے آئے گا۔" میں نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"برتن اٹھا کر باہر رکھ دو۔" وہ مسہری پر لیٹ گئی۔

"اوہو۔ یہ دم خم؟" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ اور مسہری سے چھلانگ لگا دی۔ پھر میں نے برتن سمیٹ کر دروازے کے باہر رکھے اور دروازہ بند کرکے واپس مسہری پر آگیا۔

"ہاں تو جناب۔ چیلنج قبول کرلیا گیا۔" میں نے کہا اور اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"نواز۔ نہیں۔ دوسری رات بھی آئے گی۔"

"گزرے ہوئے لمحات کبھی نہیں آتے ڈارلنگ۔" میں نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔

"اب تو۔" اس نے میرے طویل بوسے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "اب تو زندگی

کی ہر رات اپنی ہے۔"

"لیکن اس رات کا خمار ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"یہ رات۔ تمہارے صبر کا انعام تھی۔ دن کی روشنی اخلاق کی امین ہوتی ہے۔ رات تمہاری ہوگی میرے محبوب۔" اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"پھر؟" میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"آؤ سو جائیں۔ رات کی نیند پوری کر لیں۔" اس نے کہا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ میں جانتا تھا کہ مال غنیمت میں جو ہاتھ لگ رہا ہے اپنا ہے۔ پھر وہ سرکاری تحویل میں چلا جائے گا لیکن بہرحال ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ زیادہ کھانے سے بدہضمی لازمی ہے۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔ نیند آنکھوں پر ٹوٹ رہی تھی۔ ہم دونوں فوراً سو گئے اور خوب سوئے۔ تقریباً ساڑھے تین بجے آنکھ کھلی۔ طبیعت پر بوجھ بدستور تھا۔ لیکن بہرحال نیند پوری ہو گئی تھی۔

کوشلیا نے لباس تبدیل کیا اور بال وغیرہ درست کرنے لگی، پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ نیچے چل کر تھوڑی سی چہل قدمی کی جائے اور کمرے کو تالا لگا کر نیچے اتر آئے۔ باہر کا موسم معاون تھا۔ چہل قدمی میں خاصا لطف آیا۔ ہم بہت دور نکل آئے۔ بازاروں کی رونق بڑھتی جا رہی تھی، لوگ خریداری اور سیر سپاٹے کو نکل آئے تھے۔ راستے میں میں نے کوشلیا سے پوچھا۔

"وہاں کس وقت جاؤ گی کوشل؟"

"ساڑھے سات بجے۔"

"کیا ٹھاکر آ گیا ہوگا؟"

"امکان تو یہی ہے۔ آؤ سامنے فون بوتھ میں چل کر اس کے بارے میں معلوم کر لیں۔" اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ تب ہم دونوں ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گئے۔ میں نے سکے نکال کر کوشلیا کو دیئے اور اس نے ریسیور اتار کر فون نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیئے۔ میں نے نہایت چالاکی سے یہ نمبر ذہن نشین کر لیے تھے۔ چند منٹ کے بعد دوسری طرف سے فون ریسیور کر لیا گیا۔

"کے۔ پی۔" کوشلیا نے کہا۔ دوسری طرف کی آواز میں نہیں سن سکا تھا۔ چند ساعت کے بعد کوشلیا نے پھر کہا۔ "ہاں۔ چیف کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ہاں ہاں۔ میں وقت پر پہنچ جاؤں گی۔ فکر مت کرو۔ تمہارا دماغ درست کر دیا جائے گا۔" اس نے ایک جھٹکے سے ریسیور ہک میں لٹکا دیا۔

"کیوں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"آؤ۔" وہ بولی۔ اور ہم بوتھ سے نکل آئے۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ "اگر ٹھاکر نے بھی دماغ درست رکھ کر بات نہ کی نواز۔ تو میں گروہ چھوڑ دوں گی اور اب تو میں اس سے یہ مطالبہ بھی رکھوں گی کہ مقامی مینجر کو فوراً معزول کیا جائے۔ بدتمیز آدمی ہے۔"

"کیا ٹھاکر آ چکا ہے؟"

"سات بجے کی فلائیٹ سے آ رہا ہے۔" اس نے جواب دیا اور میں ایک گہری سانس لے کر

رہ گیا۔ "مجھے کچھ پہلے جانا ہوگا میں خاموشی سے ایئرپورٹ جاؤں گی اور ان میں شامل ہو جاؤں گی تاکہ مینجر ٹھاکر کے کان نہ بھر دے۔"

"یہ مناسب ہوگا۔" میں نے تائید کی۔

"آؤ۔ واپس چلیں۔" اس نے کہا اور ہم دونوں ٹہلتے ہوئے واپس ہوٹل آ گئے۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہم نے کافی پی۔ دوپہر کا کھانا گول ہو گیا تھا، بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے کچھ اسنیکس بھی منگائے۔ اور ان سے شغل کرتے رہے۔ ساڑھے پانچ بجے وہاں سے اٹھے اور واپس کمرے میں آ گئے۔ کوشلیا نے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

"کچھ تردد محسوس کر رہی ہو کوشل؟" میں نے پوچھا۔

"ارے نہیں نواز۔ تمہاری محبت نے تھوڑا سا بزدل ضرور بنا دیا ہے۔ لیکن تم یہ نہ بھولو کہ میں اکیلے مال لے کر سفر کرتی ہوں، راستے میں بے شمار خطرناک لوگ ٹکراتے ہیں۔ میں کمزور عورت نہیں ہوں نواز، کمزوری کی حدیں عبور کر چکی ہوں۔" اس نے بڑے عجیب لہجے میں کہا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔

چھ بجے وہ روانگی کے لیے تیار تھی۔ میں نے اسے الوداعی بوسہ دیا۔ اس پر آخری نگاہ ڈالی۔ ایک لمحے کے لیے دل نے گڑبڑ کی، لیکن میں نے اس بے وقوف دل کو فوراً سنبھال لیا اور وہ فوراً باہر نکل گئی میں بھی اس کے پیچھے پیچھے نیچے تک آیا تھا اور جب اس کی کار نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں ایک گہری سانس لے کر پلٹ پڑا۔ لیکن اب میرا رخ اپنے کمرے کے بجائے روم نمبر ایک سو گیارہ کی طرف تھا۔ میں نے ذہن پر طاری جمود ختم کر لیا اور خود کو چاق و چوبند رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دروازے پر دستک دی اور اندر سے نمائندے کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"آ جاؤ۔" میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر نمائندے کے ساتھ ایک اور آدمی موجود تھا۔ نمائندہ مجھے دیکھ کر بے اختیار اچھل پڑا۔ "اوہ۔ مسٹر نواز؟ آپ؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"آپ ان سے تعارف کرائیں؟" میں نے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"مسٹر رونی۔ ایکسائز آفیسر۔ اسی کیس میں میرے ساتھی ہیں۔" نمائندے نے کہا۔

"اہم اطلاع دی جا سکتی ہے۔"

"اوہ۔ پورے بھروسے کے ساتھ جناب۔" نمائندے نے کہا اور پھر رونی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ ہی راجہ نواز اصغر ہیں۔"

"بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ تشریف رکھیے۔" اس دوسرے آدمی نے کہا اور ہم بیٹھ گئے۔

"میرا خیال ہے آج آپ منشیات کے اسمگلروں کے پورے گروہ کو معہ سرغنہ کے گرفتار کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا اور وہ دونوں اچھل پڑے۔

"یعنی کہ۔ یعنی کہ۔ اوہ۔" نمائندے کے منہ سے جوش کی وجہ سے پوری بات بھی نہیں

نکل سکی۔

"ہاں۔ آپ کا خیال درست تھا۔ لڑکی منشیات کی اسمگلر نکلی۔ کار کے مخصوص پرزوں کے خول میں وہ ہیروئن لائی تھی جسے اس نے اڈے پر خالی کر دیا تھا۔"

"ایک منٹ۔" نمائندہ جلدی سے اٹھا۔ اس نے ایک پیڈ اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔ "جی؟"

"میں نے چالاکی سے اسے شیشے میں اتار کر سب کچھ معلوم کر لیا اس کاروبار کا سرغنہ ایک شخص ٹھاکر نامی ہے' اس کا کاروبار کھٹمنڈو سے امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔ خود دہلی میں رہتا ہے۔ آج سات بجے کی فلائیٹ سے وہ ایران آرہا ہے۔ اسے اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دینی ہیں۔"

"حیرت انگیز۔ بخدا حیرت انگیز۔" وہ جلدی جلدی لکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ فیلر اسٹریٹ پر نریمان چیمبر نامی عمارت ان کی مقامی برانچ ہے۔ پوری عمارت میں جتنے افراد رہتے ہیں۔ سب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بظاہر وہ دوسرے کام کرتے ہیں' لیکن صرف دکھاوے کے لیے اصل کام یہی ہے۔"

"نریمان چیمبر۔" نمائندے نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "یہ عمارت پولیس کی نگاہوں میں بھی مشتبہ ہے۔ بہت خوب۔"

"ساڑھے سات بجے وہاں ایک اہم اجتماع ہو گا۔ لڑکی بھی وہیں گئی ہے۔ اس وقت سرغنہ بھی موجود ہو گا۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے۔" میں نے بتایا۔

"بہت خوب۔" نمائندے نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "کافی وقت ہے اور کچھ مسٹر نواز؟"

"بس۔ میرا خیال ہے کافی ہے۔"

"کافی سے بھی کچھ زیادہ۔ ویسے شرمندہ ہوں کہ اس وقت ایک کپ کافی بھی نہیں پیش کر سکوں گا! لیکن اس پروگرام کے بعد آپ سے نشست رہے گی۔ میرا پورا محکمہ آپ کے اس تعاون پر بے حد شکر گزار ہے۔ براہ کرم یہاں دستخط کر دیں۔" اس نے پیڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اور میں نے پیڈ لے کر اس پر دستخط کر دیئے۔

"میرا نام ہر حال میں پوشیدہ رکھا جائے گا۔ اخبارات وغیرہ میں میرے بارے میں کچھ نہ آنے پائے۔ یہ میری خصوصی درخواست ہے۔"

"بہت بہتر۔ آپ کی خواہش کا احترام کیا جائے گا۔" نمائندے نے پیڈ کا کاغذ پھاڑ کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔

نمائندہ اور اس کا ساتھی مجھ سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ اور میں تھکے تھکے قدموں سے واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ کمرے میں آکر میں مسہری پر گر پڑا۔ مسہری سے کوشلیا کی خوشبو آرہی تھی۔ میری نگاہوں میں ابتدا سے اب تک کے مناظر گھوم گئے۔ کوشلیا کی مختلف شکلیں میری نگاہوں میں آنے لگیں۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی' جو اب تک میرے ساتھ رہی تھی' پولیس کے شکنجے میں ہو گی اور ممکن ہے اسے گولی مار دی جائے' یہ اس کے پیار کی سزا ہو گی۔ ہاں۔ اس نے گناہ عشق کیا تھا۔ اس نے اپنے تمام راز مجھے سونپ دیئے تھے۔ اوہ۔ کیا میں نے برا کیا۔ کیا مجھے خاموشی سے کوشلیا

کے ساتھ یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ وہ بری لڑکی تھی' لیکن۔ میں بھی کونسا اچھا آدمی تھا۔ میں تڑپ اٹھا۔ میں نے مٹھیوں سے اپنے بال نوچ ڈالے۔ میرا ذہنی ہیجان بڑھتا جا رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا' دوڑتا ہوا ایرپورٹ جاؤں اور کوشلیا کو پوری بات سے باخبر کر دوں۔ مجھے خود پر جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ آخر میں کیا ہوں' اچھا آدمی نہیں ہوں۔ برائیوں کو روکتا پھر رہا ہوں۔ آخر مجھے کیا ضرورت تھی۔ کیا ضرورت تھی مجھے اس حسین لڑکی کی جوانی کو خاک میں ملانے کی۔ وہ جو مجھے چاہتی ہے۔ وہ جو۔ لعنت ہے مجھ پر۔ کیوں فضول باتیں سوچ رہا ہوں۔

کیا کروں؟" کیا کروں؟۔ میرے سینے میں آگ روشن ہو گئی۔ ذہنی دیوانگی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اور جب کسی طرح برداشت نہ ہو سکا تو ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔ میں نے مسہری سے اٹھ کر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ چند منٹ کے بعد بیرا آگیا۔

"وہسکی۔ دو بوتلیں۔ جلدی۔ شاباش۔" میں نے اسے کئی نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ اور بیرا حیران سا واپس چلا گیا۔ بہرحال اس نے وہسکی لانے میں دیر نہیں کی تھی۔ گلاس اور بوتل میز پر رکھنے کے بعد وہ واپس مڑا اور میں نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد جلدی سے بوتل کھولی اور منہ سے لگالی۔

جلتی ہوئی آگ سینے میں اتر گئی۔ آگ بجھانے کے لیے میں نے آگ کا سہارا لیا تھا۔ کئی گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد میں نے بوتل میز پر رکھی اور سینہ ملنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے چھت میں لگا ہوا پنکھا کھول دیا۔ تیز ہوا لگنے لگی۔ سینہ بدستور جل رہا تھا۔ میں نے بوتل اٹھا کر مزید چند گھونٹ لیے۔ میری خواہش تھی کہ جلد از جلد نشہ ہو جائے۔ ایک چوتھائی بوتل خالی کرنے کے بعد میں نے شراب گلاس میں انڈیلی' اور پھر اس کے بڑے گھونٹ لینے لگا۔

میری کوشش کامیاب رہی۔ علاج ہو گیا تھا۔ آگ سرد پڑ رہی تھی۔ سکون آتا جا رہا تھا۔ میں نے بوتل کی تلچھٹ تک گلاس میں انڈیل لی اور اسے خالی کر گیا۔ بس یہ حد تھی۔ دوسری بوتل اسی طرح بند رہی۔ اور میں اوندھا ہو گیا۔ ذہن سے تمام خیالات نکل گئے تھے۔

رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا جب آنکھ کھلی۔ پنکھا بدستور چل رہا تھا۔ کافی دیر تک آنکھوں کے سامنے گنجان دائرے رقص کرتے رہے۔ زرد روشنی آنکھوں کو بری لگ رہی تھی۔ سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کافی دیر تک کاہلوں کے سے انداز میں پڑا رہا' پھر اٹھا پنکھا بند کیا۔ روشنی گل کر کے نائٹ بلب جلا دیا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ سخت بھوک لگ رہی تھی۔ نہ جانے کیا وقت ہوا ہے۔ کھانے کو کچھ مل سکے گا یا نہیں۔

کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ چار بجے تھے۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس وقت کیا مل سکتا تھا۔ صبح تک گزارنی تھی۔ دوسری بوتل رکھی ہوئی تھی' لیکن خالی پیٹ پر تو اب سادہ پانی بھی نہیں پیا جا سکتا تھا۔ شراب تو شراب ہوتی ہے۔

اب کیا کروں ذہن کے کسی گوشے میں کوشلیا کا خیال اب بھی کلبلا رہا تھا۔ لیکن شدت نہیں

تھی۔ اونہہ جہنم میں جائے سب کچھ۔ میرا کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بائیں سمت کی کھڑکی کھولی اور سنسان سڑک کو دیکھنے لگا! دونوں سمت لگی ہوئی روشنیاں مسکرا رہی تھیں۔ سڑک خاموش تھی۔ سڑک اور مسافر! ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مسافر گزرتے ہیں۔ اس کے سینے سے' اور سڑک کا سینہ ان کے قدموں کے نشان محفوظ کرلیتا ہے۔ لیکن پھر متعدد نشانات ان نشانوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ کون' کسے یاد رکھے۔ سب مسافر ہیں۔ کسی ایک کو یاد رکھنے سے کیا ملتا ہے۔ بس جنون ہے۔ سڑک بہتر ہے انسانوں سے۔ میں بھی ایک سڑک ہوں' میرے سینے میں بھی یہی کشادگی کیوں نہیں پیدا ہو جاتی۔ کرسٹی کون تھی؟ میگاں کیا تھی۔ درفشانہ بھی تو تھی اور کوشلیا۔ ہونہہ۔ سب گزرنے والے مسافر ہیں۔ اب کسی نئے مسافر کی ضرورت ہے۔ جو پچھلے قدموں کے نشانات مٹا دے۔ بس۔ اس کے بعد کچھ نہ ہوگا! ہشت احمق گدھے۔ ہر نقش فانی ہے۔ لکیریں کیوں پیٹتا ہے۔ نئے نقش ترتیب دے۔ کیا تجھے ہر بار سمجھانے کی ضرورت ہے۔ کھانے کے لیے کچھ مل سکے گا؟ کہاں؟ مگر ابھی دیر ہے۔ ہاں صبح کی روشنی تاریکیوں کے لحاف میں چھپی ہوئی ہے۔ سردی کم ہو جائے گی تو وہ لحاف کا کونا سرکا کر جھانکے گی اور پھر مسکراتی ہوئی باہر نکل آئے گی' کوشل کی مسکراہٹ میں خلوص تھا۔ حیا تھی۔! شراب۔ شراب۔ اندر سے شور سنائی دیا۔ نہیں۔ یہ ظلم ہوگا۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ آنتوں نے چیختے ہوئے کہا۔ میں نے کوشل پر ظلم تو نہیں کیا۔ کسٹم والے اگر اسے پالیتے۔ بہرحال اس نے مجھے حالات سے بے خبر رکھا تھا۔ اور پھر وہ ہیپی جوڑا۔ لڑکی بڑی طویل القامت تھی۔ بے وقوف اردو جانتے تھے' ہماری باتیں' خوب سمجھ رہے تھے مگر۔ لڑکی کے لباس کے نیچے کیا ہوگا؟ سڈول جسم۔ سفید مخمل کی طرح۔ دریائے ہلمند کے کنارے' لباس سے بے نیاز میگاں۔ بدکار۔ اور پھر کوشلیا کی آنکھوں کی فتح مندی۔ اس نے اپنا پندار جیت لیا تھا۔ میگاں۔ لٹی ہوئی۔ چچوڑی عورت سوکھا ہوا او ہوتے۔ چور کہیں کا۔ میں ہنس پڑا۔ اور پھر میرے کانوں میں اپنی ہی بجائی ہوئی دھن گونج اٹھی۔ لعل میری پت رکھیو بھلا' اور سرور آنے لگا۔ ذہن صاف ہونے لگا۔ کاش شراب کی بوتل گٹار کی طرح بجائی جاسکے۔ لعل میری پت رکھیو۔ لیکن خالی پیٹ۔ بوتل کیسے بج سکتی ہے۔ ہاں خالی پیٹ۔ بھوک۔ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ۔

میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا۔ پیٹ دبا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اے نیند کی رانی۔ مدد کر۔ ورنہ یہ چوہے پورا چوہے دان کتر ڈالیں گے آنکھیں بند کرلیں۔ اور مہربان ماں نے چادر اڑھادی۔ صبح ہوگئی۔ جوں ہی احساس ہوا میں جھپٹ کر اٹھا' اور گھنٹی پر اس وقت تک انگلی رکھے رہا' ب تک بیرے نے دروازہ نہیں پیٹ ڈالا۔ افوہ۔ یہ دروازہ کیوں بند ہے۔ مجبوراً کھولنا پڑا۔

"یس سر۔" بیرے نے ادب سے کہا۔ کیسا نفیس انسان ہے۔ کتنا حلیم الطبع۔ ذرا بھی برا نہیں مانا۔

"بھائی۔ میرے دوست۔ کھانے کے لیے جو کچھ ہو' لے آؤ۔ جلدی۔ ورنہ یہاں تمہیں ایک لاش ملے گی جس کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔ لو۔ گردن صاف کرلو۔" میں نے رومال نکال کر بیرے کو دیا۔ اور بیرے نے دانت نکال دیئے۔

"ابھی لایا صاحب۔" اس نے کہا۔ اور واپس پلٹ پڑا۔ اس نے میرا رومال قبول نہیں کیا تھا۔ لاحول ولاقوۃ۔! ابھی تک چڑھی ہوئی ہے۔

جو آج پی ہو تو ظالم' حرام شے پی ہو
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے

گنگناتا ہوا واپس اندر آگیا۔ دروازہ کھلا رہنے دیا تھا تاکہ بیرے کو دقت نہ ہو۔ اور نفیس انسان نفیس ناشتہ لے آیا۔ ٹرے رکھنے بھی نہ پایا تھا کہ میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ بیرا ہنستا ہوا پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"بوتل اٹھالوں صاحب؟" اس نے پوچھا اور میں نے لاپرواہی سے گردن ہلا دی۔ بھلا یہ بھی کسی بات کے پوچھنے کا وقت تھا۔ نوالے حلق سے اتر اتر کر سکون کے دروازے کھول رہے تھے۔ معدے کی کوئی سلوٹ خالی نہ رہنے دی۔ خوب ڈٹ کر کھایا۔ اور پھر چائے کے چھوٹے چھوٹے دلکش' گھونٹ لینے لگا۔ تب کہیں جاکر ذہن اعتدال پر آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیرا اخبار لئے ہوئے اندر آگیا۔ اس نے اخبار سامنے رکھ دیا۔ اور برتن سمیٹنے لگا۔ ہیڈنگ پر نگاہ پڑی۔ اور جسم میں پھریری دوڑ گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"خطرناک اسمگلروں کا بین الاقوامی گروہ گرفتار۔ ناجائز منشیات کا عظیم الشان ذخیرہ پکڑا گیا۔

آنکھیں بند کرلیں۔ ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر پوری خبر پڑھنے لگا۔ نریمان چیمبر پولیس اور ایکسائز والوں کا زبردست چھاپہ بے حد کامیاب رہا۔ مجرموں نے پولیس پر فائرنگ کی تھی۔ دو پولیس والے زخمی ہوئے تھے۔ ایک ایکسائز انسپکٹر شدید زخمی ہوا تھا۔ اسی افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ گروہ کا سرغنہ ٹھاکر جگ ناتھ بھی گرفتار ہوگیا تھا۔ جو کل شام ہی کی فلائیٹ سے ایران پہنچا تھا۔

کوشلیا کا نام نہیں تھا۔ لیکن نام تو کسی کا بھی نہیں تھا۔ سوائے ٹھاکر جگ ناتھ کے۔ یقیناً گرفتار ہونے والوں میں بے شمار مقامی لوگ بھی ہوں گے اور ابھی تو ادھر ادھر سے بھی بہت سی گرفتاریاں ہوں گی۔ بہرحال میرا نام بھی اخبار میں کہیں نہیں تھا۔ پوری خبر پڑھنے کے بعد میں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اٹھا اور لباس تبدیل کرنے لگا۔ شیو بڑھ رہا تھا۔ میں نے شیو بھی نہیں بنایا۔ بس یونہی بال سنوارے اور روم نمبر چھتیس کی طرف چل پڑا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے لاک دیکھا اور مایوسی سے ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔ دروازہ لاک تھا۔ غلام سیٹھ چلا گیا۔ میں نے سوچا اور پھر مجھے ناصر یمانی یاد آیا۔

"اونہہ۔ کسی سے ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن اب کیا کروں' میں خود کو لٹا لٹا سا محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں جانے کو دل نہیں چاہا۔ ہوٹل سے باہر نکل آیا اور پیدل چل پڑا۔ سڑک دیکھی۔ اور کوشلیا یاد آگئی۔ کل ہم دونوں ساتھ ساتھ اس سڑک پر مٹرگشت کر رہے تھے اور آج میں تنہا ہوں۔ یہ تنہائی دور ہونی چاہیے کسی طرح۔

لیکن کس طرح؟ ادھر ادھر دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر "بلیک پول" نظر آیا۔ ایک خوبصورت نیون سائن لگا ہوا تھا۔ جس پر ایک شخص اوندھا لیٹا ہوا تھا اور ایک نیم برہنہ لڑکی اس کے جسم پر مالش

کر رہی تھی۔ حمام۔ میں نے پڑھا اور میرے قدم اسی طرف بڑھ گئے۔ نیون سائن اس وقت بجھا ہوا تھا ورنہ رات کو اس لڑکی کے ہاتھ چلنے لگتے تھے۔ اور پھر پوری رات اس کے ہاتھ اس آدمی کے جسم پر گردش کرتے رہتے تھے۔

ذرا دیکھو تو۔ کون ہے۔ کیسی ہے؟

ایک خوبصورت کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ کاؤنٹر کلرک نے ایک کوپن میری طرف بڑھا دیا۔ کوپن پر نمبر سترہ پڑا ہوا تھا۔ "کیا کروں اس کا؟" میں نے پوچھا۔

"سترہ نمبر پر چلے جایئے۔" کلرک نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ سیاہ پلائی وڈ کے بنے ہوئے دروازوں کی قطار میں سترہ نمبر تلاش کیا اور سرخ بٹن دبا دیا۔

اونچے اسکرٹ والی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اور پر اخلاق انداز میں مسکرائی۔ "ہیلو۔" اس کے ہونٹوں سے مترنم آواز ابھری۔ نہایت مناسب لڑکی تھی، سوائے ناک پر رکھے ہوئے سفید فریم کے سفید شیشوں والے چشمے کے۔ جو اس کی شخصیت کو خواہ مخواہ پروقار بنانے میں کوشاں تھا۔

"کوپن پلیز؟" اس نے کہا اور میں نے کوپن اس کی طرف بڑھا دیا۔ "تشریف لایئے۔" وہ شستہ انگریزی میں بولی اور میں اندر داخل ہو گیا۔

"مالش؟" اس نے پوچھا اور میں نے گردن ہلا دی۔ اس نے بھی گردن خم کی اور میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ خوب کشادہ کمرہ تھا۔ دیوار میں عجیب ساخت کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک ٹب رکھا ہوا تھا۔ دوسری طرف چوڑی سنگ مرمر کی سل سی بنی ہوئی تھی۔ ایک الماری تھی۔ لڑکی نے دیوار میں لگے ہوئے چند بٹن دبائے اور کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ بالکل دن کا سا ماحول ہو گیا تھا۔ پھر وہ الماری کی طرف بڑھ گئی اور اس میں سے کئی چیزیں نکال لائی۔ جو میرے لیے ناقابل فہم تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کونے میں رکھا ہوا لوہے کا ایک خوبصورت اسٹینڈ بھی گھسیٹ لائی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے پہیئے لگے ہوئے تھے۔ اس نے تمام سامان اسٹینڈ پر رکھ دیا اور میرے مقابل آ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت لیکن کاروباری مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

تب اس کے ہاتھ بے باکی سے میرے لباس کی طرف بڑھے اور وہ میرا لباس اتارنے لگی۔ میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ناک سے چشمہ اتار لیا اور اسے اسٹینڈ پر رکھ دیا۔ لڑکی آہستہ سے ہنس پڑی۔ یہاں تک کہ اس نے میرا پورا لباس اتار دیا۔ اور پھر وہ اپنا لباس اتارنے لگی۔ میرے لیے یہ کیفیت نئی تھی عجیب انداز تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکی کا عریاں بدن میرے سامنے تھا۔ سیاہ رنگ کی ایک پتلی سی چڈی اور باڈی اس کے حسین خطوط کو اور نمایاں کر رہی تھی۔ وہ میرے نزدیک آئی اور پھر اس نے مجھ سے سنگ مرمر کی چوڑی سل پر لیٹ جانے کی درخواست کی۔ میں اس کے اشارے کے مطابق اوندھا لیٹ گیا۔ تب اس نے ایک سائنس نما چیز سے میرے بدن پر پھواریں ماریں اور پھر انوکھے انداز میں گھٹنے موڑ کر میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ اس کے ملائم ہاتھوں نے میرے جسم کو چھوا تو میری عجیب کیفیت ہو گئی۔ میری آنکھوں میں سرخی

تیرنے لگی۔ لیکن وہ میری کسی کیفیت سے بے خبر اپنا کام کر رہی تھی۔ اس کے لیے یہ سب کچھ اجنبی نہیں تھا۔ ممکن ہے یہاں رہنے والوں میں سے کسی کے لیے اجنبی نہ ہو۔ وہ خاموشی سے یہاں آتے ہوں۔ مالش کراتے ہوں، غسل کرتے ہوں، چلے جاتے ہوں، لیکن مجھ غریب پاکستانی کے لیے یہ انوکھی بات تھی، لڑکی کے بدن کے زاویئے بدل رہے تھے اور ہر زاویہ میرے لیے ہیجان خیز تھا میں چور نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے کام میں مشغول تھی۔

میں بے سدھ پڑا رہا۔ میرا جسم بھٹی کی طرح دہکنے لگا تھا۔ لیکن لڑکی ان سب باتوں سے بے نیاز تھی۔ پھر اس نے ملائم لہجے میں چت لیٹنے کی درخواست کی اور میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ تب اس کے ہاتھ میرے سینے پر چلنے لگے۔ اب وہ مکمل طور سے میرے سامنے تھی۔ اس کا صحت مند چہرہ، صحت مند جسم میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس کے ترشے ہوئے خوبصورت براؤن بال اس کی پیشانی پر آ پڑتے تو وہ ایک خوبصورت انداز سے انہیں جھٹک کر پیچھے کر لیتی لیکن ایسا کرتے وقت اس کا حسین جسم تھلتھلا جاتا تھا اور یہ تھلتھلاہٹ میرے پورے وجود کو جھنجھوڑ دیتی تھیں اس کا اوپری ننھا سا لباس مشقت کی وجہ سے ڈھیلا ہو کر تقریباً لٹک گیا تھا۔ اور ایک بار جب وہ بالکل نیچے کھسک گیا تو میرے حواس جواب دے گئے۔

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور وہ چونک کر رک گئی۔ اس نے ایک سوالیہ مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور زبان سے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ میری نگاہیں اس کے جسم کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ دوسری طرف مڑی اور اس نے اپنی باڈی کس کر مجھ سے اس کا ہک لگانے کی فرمائش کر دی۔

لیکن۔ میں نے اسے اپنے سینے پر کھینچ لیا۔ تب اچانک اس کے چہرے کے نقوش پھیکے پڑ گئے۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے سینے پر ٹکائے اور پیچھے ہٹ گئی۔ "میں ڈیوٹی پر ہوں جناب۔ یہاں یہ جرم ہے۔" اس نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا اور میں ہوش میں آ گیا۔ میرے چہرے پر کسی قدر ندامت کے آثار پھیل گئے۔ وہ بغور میری شکل دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ عود کر آئی۔ "میری ڈیوٹی ایک بجے ختم ہو گی۔"

"کیا ڈیوٹی کے بعد تم مجھ سے مل سکتی ہو؟"

"ہاں۔ گرین اسکوائر فلیٹ نمبر ففٹی ون۔" اس نے کہا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ازابیلا۔" اس نے جواب دیا اور میں نے گردن ہلا دی۔ پھر اس نے گرم پانی کے تولیوں سے میرا جسم خشک کیا اور اس کے بعد میں نے نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ وہ باہر نکل گئی تھی۔ پھر جب میں لباس پہن کر باہر نکلا تو وہ ایک کرسی میں دراز ایک رسالہ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔ میں نے ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا اور اس نے جھک کر میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر کوپن مجھے واپس کر دیا۔ میں کاؤنٹر کی طرف بڑھا تو وہ میرے پیچھے آئی اور آہستہ سے بولی۔

"کیا میں انتظار کروں؟" اس کی یہ مسکراہٹ مجھے پسند نہ آئی اور میں کوئی جواب دیئے بغیر

آگے بڑھ گیا۔ اس کے قدم رک گئے تھے۔ کاؤنٹر کلرک نے ایک سلپ میری طرف بڑھادی اور میں ادائیگی کرکے باہر نکل آیا۔ ایک بجے کے بعد لڑکی کے فلیٹ پر جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے خشک انداز نے مجھے بددل کردیا تھا۔ اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا۔ یہاں تو دل کے قبول کرنے کی بات تھی۔

بہرحال جو کچھ گزری تھی خوب تھی۔ یہ حمام مجھے پسند آئے تھے۔ بعد میں میں نے ان کے بارے میں معلوم کیا۔ بلیک پول کے انداز کے حمام بہت کم تھے۔ لیکن بہرحال یہاں ہر کام ایک دائرے میں ہوتا تھا اور ایسی کوئی بات نہ ہوتی جو جرم قرار دی جاسکتی۔ اس طرح بعد میں' میں نے اس لڑکی کو معاف کردیا تھا۔ بہرحال وہاں سے نکلنے کے بعد طبیعت بے حد ہلکی ہوگئی تھی۔ اگر وہ چھوٹا سا ناگوار واقعہ نہ ہوتا تو شاید ذہن پر کوئی بار نہ ہوتا۔ ایک چھوٹے سے ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر ایک ٹیکسی لے کر چل پڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور سے میں نے سیر کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ایران کے مختلف حصوں کی سیر کرنے میں مجھے کوئی لطف نہ آیا۔ ظاہر ہے بغیر ساتھی کے سب کچھ بیکار ہوتا ہے۔

میں نے واپس ہوٹل چلنے کی فرمائش کی اور اسے سیل نو کا نام بتادیا' سیل نو پر ٹیکسی رکواکر میں اتر پڑا۔ ابھی صرف پونے تین بجے تھے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو تھوڑی دیر کے بعد بیرا آگیا۔ اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھادیا اور میری پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ میں نے لفافہ کھولا۔ کسٹم آفیسر کی طرف سے تھا شام کی چائے کی دعوت دی گئی تھی اور پانچ بجے گاڑی بھیجنے کے لیے کہا گیا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

ٹھیک ہے۔ شام ان لوگوں کے ساتھ ہی سہی۔ وقت تو گزارنا ہی ہے۔ پونے پانچ بجے تیار ہوکر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ اور زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک شناسا شکل نظر آئی۔ یہ وہی کسٹم انسپکٹر تھا' جس سے پہلے بھی ملاقات ہوچکی تھی۔ گرے کلر کے سوٹ میں وہ بہت اسمارٹ نظر آرہا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے بڑی گرمجوشی سے کہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن وہ میرے گلے لگ گیا تھا۔ "آپ کا یہ تعاون ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔" اس نے میری پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے جواب دیا۔

"آیئے۔ غالباً آپ تیار ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ اور باہر نکل آیا۔ دروازے کو لاک کرکے ہم نیچے اتر گئے۔ انسپکٹر کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ نیچے ایک خوبصورت گاڑی کھڑی تھی۔ جس کے نزدیک ہی ایک باوردی ڈرائیور موجود تھا۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھتے ہی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اور ہم دونوں اندر بیٹھ گئے۔ کار اسٹارٹ ہوکر چل دی اور میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ تب میرے قریب بیٹھے ہوئے انسپکٹر نے کہا۔

"آپ نے اخبار پڑھ لیا ہوگا؟"

"ہاں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ انسپکٹر نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بے تکلفی کی اجازت دیں تو ایک بات پوچھوں جناب؟"

"پوچھو۔"

"کیا آپ اس لڑکی کے لیے مغموم ہیں؟" اس نے کہا۔

"ہاں انسپکٹر۔ وہ کافی دن تک میرے ساتھ رہی ہے۔ سچ بات یوں سمجھو کہ بالکل میری بیوی کی مانند۔ وہ غلط راستوں پر ضرور تھی لیکن بری عورت نہیں تھی۔ حالات اسے ان راستوں پر کھینچ لائے تھے۔ تاہم۔ وہ نہ تو دل کی بری تھی۔ نہ اپنے پیشے سے خوش۔" میں نے مختصراً انسپکٹر کو شلیا کی کہانی سنائی۔

"اس عورت کو میں نے اپنے ہاتھوں سے ہتھکڑیاں لگائی تھیں۔ یقین کریں اس کے چہرے پر نہ تردد کے آثار تھے اور نہ ہی وہ خوفزدہ نظر آئی تھی۔ ایک عجیب سا سکون تھا اس کے چہرے پر۔"

"ایک درخواست کروں انسپکٹر۔" میں نے نہ جانے کس خیال کے تحت کہا۔

"جی۔"

"اگر ہوسکے تو اس کے ساتھ رعایت برت دینا۔ یہ میرے تعاون کا معاوضہ بھی ہوگا اور مجھ پر احسان بھی۔"

"اوہ۔ میرا خیال ہے آپ چیف سے اس سلسلے میں بات کریں جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جس حد تک میری پہنچ ہے میں اس سے رعایت برتوں گا۔"

"شکریہ انسپکٹر۔" میں نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد کار ایک خوبصورت عمارت میں داخل ہوگئی۔ یہ رہائشی عمارت تھی۔ خاصی خوبصورت تھی۔ عمارت کے حسین لان پر رنگ برنگی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ مدعو تھے۔ میری خاص طور سے پذیرائی کی گئی۔ ایکسائز کلکٹر نے میرا پرجوش خیر مقدم کیا اور پھر دوسرے لوگوں سے میرا تعارف کرایا چائے کے پرتکلف دور کے بعد کلکٹر نے خاص طور سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور بہت سی رسمی باتوں کے بعد پارٹی ختم ہوگئی۔ ایکسائز کلکٹر ایک درمیانی عمر کا ہنس مکھ آدمی تھا۔ جب وہ مجھے رخصت کرنے کار تک آیا تو میں نے اس سے اپنی درخواست دہرادی۔ جسے سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ایران میں منشیات فروشوں کے لیے بہت سخت قانون ہے' میں اس قانون سے انحراف تو نہیں کرسکتا۔ ہاں لڑکی اگر ہمارے ساتھ خصوصی تعاون کرے تو ممکن ہے ہم اس کی زندگی بچانے میں کامیاب ہوجائیں میرا خیال ہے میں اس سے آپ کی ملاقات کرادوں۔ آپ اسے تیار کریں۔"

"نہیں جناب۔ میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔ اصل میں میرے اس سے ایسے تعلقات رہ چکے ہیں کہ میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ براہ کرم اس کو وہم بھی نہ ہونے پائے کہ اسے اور اس کے گروہ کو گرفتار کرانے میں میرا ہاتھ ہے۔"

"آپ کے کہنے کے مطابق ہم نے خیال رکھا ہے۔ بہرحال ٹھیک ہے۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں۔ ضرور کروں گا۔"

"میں بے حد شکرگزار ہوں۔" میں نے کہا اور کار میں بیٹھ گیا۔ ایکسائز آفیسر کی کار مجھے واپس سیل نو چھوڑ گئی۔ اور اب پھر وہی تنہائی تھی۔ یہ تنہائی مجھے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ ایک بار دل چاہا کہ حمام والی لڑکی کے دیئے ہوئے پتے پر پہنچ جاؤں۔ لیکن پھر اس کی خشک نگاہیں یاد آئیں۔ اس کے بعد یہ دعوت بیکار تھی۔ چنانچہ رات کے کھانے کے ساتھ میں نے بیرے سے پھر وہسکی طلب کی۔ اور شراب نے مجھے سکون کی نیند بخش دی۔

اور پھر وہی دن---- ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں ناصر یمانی سے ملاقات کروں۔ اور اس سے پوچھوں کہ آئندہ پروگرام کیا ہے۔ اب یہاں سے اکتا گیا تھا۔ بس ایک عجیب سی بیزاری ذہن پر مسلط تھی۔ لباس وغیرہ تبدیل کر کے میں سوچ ہی رہا تھا کہ باہر نکلوں۔ دفعتاً کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور میں آگے بڑھ گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ ناصر یمانی تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اندر آ گیا۔

"کیسے ہیں نواز صاحب؟" وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"اپنے شاندار کارنامے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔"

"شکریہ۔" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"جان بوجھ کر آپ سے اجتناب کیا جا رہا تھا۔ بہرحال میدان صاف ہوتے ہی میں آپ کو لینے آ گیا۔"

"میں خود بھی آپ سے ملنا چاہتا تھا۔"

"ہاں۔ مجھے احساس ہے۔ آپ بور ہو رہے ہوں گے۔"

"بے پناہ۔" میں نے کہا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟"

"بس۔ ابھی تو آپ کی مہمان نوازی باقی ہے۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ تیار ہو جائیں۔ میرا آدمی آپ کے کمرے کی ادائیگی کر رہا ہے۔"

"او کے۔ لیکن اب میں بہت جلد ایران چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔"

"ایران آپ کو چھوڑ دے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" یمانی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ اور میں اس کے جملے پر غور کرتا ہوا اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ کوشلیا کا سامان ایکسائز والے لے گئے تھے۔ اس کی کوئی نشانی میں نے اپنے پاس نہیں رہنے دی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پوستین بھی واپس کر دی تھی جو کوشلیا نے میرے لیے خریدی تھی۔ بہرحال سامان اٹھانے کے بعد ہم باہر نکل آئے۔ یمانی نے میرا سوٹ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا جسے کمرے سے باہر نکلتے ہی ایک بیرے نے تھام لیا اور پھر وہ ہمیں نیچے تک پہنچانے گیا۔ بیرے کو ٹپ دینے کے بعد ہم ایک خوبصورت کار میں بیٹھ گئے اور کار چل پڑی۔

"ایران اتنا بد اخلاق بھی نہیں ہے کہ آپ اسے یوں چھوڑ جائیں۔ اس کی اپنی حیثیت' اپنا وقار ہے۔ وہ مہمانوں کو بیزار نہیں ہونے دیتا۔" راستے میں یمانی بولا۔

"شاید۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاید نہیں یقیناً۔ ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے۔" یمانی نے جھٹکے دار آواز میں کہا۔ اور ہنسنے لگا۔ کار برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ پھر وہ ایک سرسبز رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خوبصورت کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں درخت جھول رہے تھے۔ اس سے قبل میں اس علاقے کی طرف نہیں آیا تھا۔ بہرحال اس کے سبزے نے مجھے متاثر کیا تھا اور پھر ہم ایک ایسی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے جس کی چار دیواری سے سرخ پھولوں والے درختوں کے پتے باہر جھکے ہوئے تھے۔ پھولوں کی ایک سرخ لائن چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ رنگین گیٹ کے دونوں طرف سرخ پھول والے درخت سرخ وردی پوش دربانوں کے سے انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔

ایک باوردی چوکیدار نے گیٹ کھول کر سلام کیا اور کار اندر داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ بلاشبہ حسین ترین کوٹھی تھی۔ بائیں طرف گھاس کا ایک میدان سا چلا گیا تھا جس کے بیچوں بیچ ایک سوئمنگ پول تھا۔ جس کے کنارے تھوڑا تھوڑا فرش سنگ مرمر کی حسین ٹائلوں کا تھا اور اس پر سنگ مرمر کی خوبصورت اور..... آرام دہ بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔

"میں نے کار سے نیچے اتر کر گہری گہری سانسیں لیں اور میرے پھیپھڑوں نے معطر ہوائیں جذب کر لیں۔ ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں آ کر-----

"آیئے۔" ناصر یمانی نے کہا اور میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ ناصر یمانی اتنی بڑی حیثیت کا آدمی ہو گا۔ کوٹھی میں اب تک صرف ملازم ٹائپ کے آدمی نظر آئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں اور کوئی نہیں رہتا ہو۔ میں نے ناصر یمانی سے یہ سوال کر ڈالا۔

"کیا آپ یہاں تنہا رہتے ہیں مسٹر یمانی؟"

"میں---- نہیں مسٹر نواز---- میں یہاں نہیں رہتا۔ یہ کوٹھی صرف بیرونی مہمانوں کے لیے ہے۔"

"فکر نہ کریں۔ آپ یہاں تنہا نہ ہوں گے۔" ناصر یمانی نے ایک کمرے کے دروازے کو دھکا دیا اور اندر سے موسیقی کی لہریں پھوٹ پڑیں---- انتہائی مدھم سروں میں ایک مغربی دھن بج رہی تھی۔ لیکن میری نگاہ اس لڑکی پر تھی جو ایک صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی ٹخنوں تک لمبا سلک کا سفید لبادہ۔ کمر پر سیاہ ڈوری بندھی ہوئی تھی۔ لبادے کی آستینوں پر اور سینے پر بھی سیاہ گوٹ لگی ہوئی تھی۔ اس کے ہلکے نیلے رنگے ہوئے گھنگھریالے بالوں کی لٹیں بل کھاتی ہوئی سفید چہرے کے کئی حصوں کو ڈھانپ رہی تھیں۔ اور لپ اسٹک کے بغیر گلابی ہونٹوں کے دریچے سے موتیوں کی لڑیاں چمک رہی تھیں۔ ایک نگاہ میں جو کچھ دیکھ لیا۔ ممکن ہے وہ یمانی کی کوئی عزیز ہو۔ اس لیے

مفصل نہ دیکھ سکا۔

"خاتون سمابہ۔ آپ کے مہمان۔"

"کیا یہ مسٹر نواز ہیں؟" لڑکی نے سوالیہ انداز میں کہا۔ زبان اردو تھی اور بالکل صاف تھی۔ اس لیے میں چونک پڑا حالانکہ چہرے سے وہ سو فیصدی ایرانی معلوم ہو رہی تھی۔

"ہاں۔" یمانی نے کہا۔

"ہیلو مسٹر نواز۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور اپنا ننھا سا سفید ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ سرور کی ہلکی ہلکی لہریں اس ہاتھ سے میرے پورے جسم میں منتقل ہونے لگیں۔ اب میں نے کسی قدر تفصیل سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کا جسم بہت گداز تھا۔ پتلی کمر' چوڑے خمدار کولہے۔ بھری بھری رانیں۔ گداز شانے جو کھلے ہوئے تھے اور اس کی جلد ٹشو کی طرح ملائم اور چکنی تھی۔

"آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھی۔" میں نے رسماً جواب دیا۔

"تشریف رکھیے۔" وہ بولی۔ اور یمانی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوکے مسٹر نواز۔ مجھے اجازت دیں۔ میں نے آپ کی تنہائی دور کر دی ہے۔ امید ہے خانم سمابہ آپ کو اداس نہ ہونے دیں گی۔"

"ہمارے ساتھ ایک پیالی چائے نہیں پئیں گے مسٹر یمانی؟" سمابہ نے پوچھا۔

"اس وقت معذرت خواہ ہوں۔ پھر کبھی۔" یمانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر دو انگلیوں سے مجھے رخصتی سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ سمابہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر ان لوگوں کی طرف سے یہی میری مدارت ہے تو یقیناً انہوں نے بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔۔۔۔ تب اس نے ایک گہری سانس لی اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"آپ اردو بہت صاف بول لیتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"شکریہ۔ میں نے بڑی محنت سے اسے سیکھا ہے۔ مجھے پاکستانیوں سے بے حد محبت ہے اس کے علاوہ بھی مجھے کچھ زبانیں آتی ہیں۔"

"خوب۔" میں نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو میری آمد کے بارے میں اطلاع تھی۔ میرا مطلب ہے آپ نے فوراً میرا نام لیا تھا؟"

"جی ہاں۔ بڑی تعریفیں سنی تھیں آپ کی۔ خاص طور سے ایران میں داخل ہونے کے بعد آپ کا یہ کارنامہ۔۔۔۔ ٹھاکر ہمارے زبردست حریفوں میں سے ہے۔ اور اس کی گرفتاری کا تو گمان بھی نہیں تھا۔" اس نے کہا۔ اور میں نے ایک طویل سانس لی۔ اس کا مقصد ہے کہ وہ بھی گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور سب کچھ جانتی ہے تاہم میں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی۔

موسیقی کا ریکارڈ ختم ہو گیا اور وہ کرسی سے اٹھ گئی۔ سلک کے لبادے سے اس کے دلکش جسمانی نقوش بے حد ہیجان خیز نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک خوبصورت گرام کے پاس پہنچی اور جھک کر

اس کا ریکارڈ تبدیل کرنے لگی۔ جھکنے سے لبادہ اس کے جسم پر چست ہو گیا اور میں اس کی جسمانی دلکشی کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور پھر اس کے قدموں کی چاپ میرے نزدیک آ گئی۔ وہ دوسرا ریکارڈ لگا چکی تھی۔

"موسیقی سے کوئی دلچسپی ہے مسٹر نواز؟"

"یقیناً۔ ہمارے ہاں روح کی غذا سمجھی جاتی ہے۔"

"مجھے بھی بہت پسند ہے۔ لیکن میرا خیال ہے آپ کسی قدر تکلف سے بیٹھے ہیں۔ ہم یہاں اس کمرے میں ایک ایک کپ چائے پئیں گے اور اس کے بعد میں آپ کے لیے منتخب کمرہ دکھادوں گی۔ اس کمرے میں بیٹھ کر ہم ایران کی سیر کے پروگرام مرتب کریں گے۔"

"میرے لیے بڑی الجھن ہے۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟" وہ چونک کر بولی۔

"ناصر یمانی نے مجھے مفصل پروگرام نہیں بتایا۔" "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں سب سے دبتی ہوں۔ غلام سیٹھ نے ہدایت دی ہے کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے جتنے دن بھی آپ پسند کریں آپ کو ایران کی سیر کرائی جائے۔ اس دوران ٹھاکر کا انجام بھی سامنے آ جائے گا۔ چنانچہ آپ کی میزبانی کا شرف مجھے بخشا گیا ہے۔ یوں تو یہ ایک فرض تھا جسے انجام دینا ہی تھا۔۔۔۔ لیکن آپ سے ملاقات کے بعد اس فرض سے ذاتی دلچسپی بھی پیدا ہو گئی ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ مسکرا دی۔ اس کے دلکش دانتوں کی چمک مجھے بے حد پسند تھی۔

"ذاتی دلچسپی سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"اوہ مسٹر نواز۔۔۔۔ آپ کو علم ہے کہ ہماری لائن کے لوگ زیادہ تر خونخوار اور وحشی قسم کے ہوتے ہیں۔ فنون لطیفہ سے انہیں کم ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ سازوں میں ان کا پسندیدہ ساز پستول ہوتا ہے جس کی کریہہ موسیقی انہیں مسحور کر دیتی ہے۔ لیکن میں نے پہلی ہی نگاہ میں آپ کو موسیقی کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تھا۔" اس نے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

"یہ پستول کی خوب رہی۔" میں نے کہا اور وہ ہنسنے لگی۔ ذہنی تکدر دور ہو رہا تھا۔ لڑکی خوبصورت بھی تھی۔ دلچسپ بھی۔۔۔۔ اور باتیں بھی اچھی کر لیتی تھی۔ خواہ کاروباری ہی کیوں نہ ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نوجوان ملازمہ ایک ٹرالی میں چائے کا سامان سجا لائی۔ یہ بھی ایرانی تھی۔ شکل و صورت سے ملازمہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے سلیقے سے چائے بنا کر ہم لوگوں کے سامنے پیش کی۔

"یہ شیفو ہے۔ آپ اسے صرف ملازمہ نہ سمجھیں۔ یہ ایک عمدہ رقاصہ ہے۔ کئی قسم کے رقص جانتی ہے۔ یہاں آپ کو ہر شخص آرٹسٹ نظر آئے گا۔" سمابہ نے کہا اور شیفو نے گردن جھکا دی۔

"خوب۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں نے ایک چھوٹی سی جنت ترتیب دے ڈالی ہے۔"

"ہاں ----- جنت کا تصور تو بہت بلند ہے۔ وہاں نہ جانے کیا کیا ہو گا۔" سامبہ نے دونوں پاؤں سکوڑ کر چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے بھی اپنا کپ اٹھالیا۔ شیفو دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ چھوٹے سے قد کی یہ ملازمہ بھی خوب تھی۔ چائے پیتے ہوئے میں اس عمارت کے دلکش ماحول کے بارے میں سوچتا رہا۔

گویا یہ گیسٹ ہاؤس ہے جہاں اسمگلروں اور منشیات کے کاروباری ٹھہرائے جاتے ہوں گے اور یہ حسین لڑکیاں سب کے ساتھ اسی طرح پیش آتی ہیں۔ وہ اپنا خلوص' اپنا جسم' سب کچھ ان کے حوالے کر دیتی ہوں گی۔ ذہن پر ہلکا سا بوجھ آپڑا۔ لیکن دل ہی دل میں میں نے خود کو ڈانٹ دیا۔ یہ کیا حماقت ہے۔ بے حد فضول سوچ کیا دنیا میں صرف میں ہی انوکھا انسان ہوں؟----- ہر لڑکی صرف مجھے پسند کرلے۔ دل کی گہرائیوں سے چاہے۔ پوری زندگی میری آرزو کرتی رہے۔ حماقت گدھا پن----- ہونہہ-----

وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ پھر اس نے قریب رکھے حسین سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیا۔ آئرلینڈ کے بنے ہوئے خوبصورت خوشبودار سگریٹ تھے۔ میں نے بھی ایک نکال کر ہونٹوں میں دبالیا۔ اور اس نے پتھر کے لائٹر سے میرا سگریٹ سلگا دیا۔ اپنا سگریٹ اس نے سیاہ پتھر کے ایک لمبے ہولڈر میں لگایا اور اسے سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگی فضا میں خوشبو بکھر گئی تھی۔

"اٹھیں۔" اس نے کہا۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا اور پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ وہ کئی چکنی راہداریاں طے کر کے ایک حصے میں پہنچ گئی۔ سیاہ رنگت کا خوبصورت دروازہ کھول کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ خاصا بڑا کمرہ تھا۔ تین اطراف میں نفیس ترین صوفے لگے ہوئے تھے درمیان میں ایک چوڑی مسہری تھی جس پر خوبصورت بستر بچھا ہوا تھا۔ مسہری کے بائیں طرف پھولوں کا ایک بہت بڑا گلدان رکھا ہوا تھا۔ بائیں سمت کھڑکی تھی جس سے عقبی باغ کا خوبصورت منظر نظر آتا تھا۔ کمرے کی چھت میں نیلے رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے جن میں کہیں روشنی کا کوئی بلب چھپا ہوا تھا۔ انتہائی خوبصورت اور جاذب نگاہ کمرہ تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔

"یہ ہماری خواب گاہ ہے۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا۔ لیکن اس لفظ ہماری پر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میری آنکھوں میں سرور کی ایک لہر دوڑ آئی۔ لیکن میں نے خود کو کنٹرول میں رکھا۔ اس کی حسین آنکھیں بھی میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان میں جھانکا تو وہ مسکرا دی۔

"پسند آئی آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"بے حد۔" میں نے مختصراً کہا اور وہ ایک طرف بڑھ گئی۔ دیوار پر ایک سفید رنگ کے بورڈ میں لگے ہوئے سیاہ بٹن کو دبانے سے دیوار کا ایک حصہ دوسری طرف گھوم گیا۔

"ڈریسنگ روم۔ آپ کا سامان یہاں پہنچ گیا ہے۔ اس کے علاوہ جس چیز کی ضرورت ہو فرمادیں۔"

"شکریہ۔ اور کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"بہتر ہے۔ لنچ تک کے لیے مجھے اجازت دے دیں۔ اس کے بعد آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔" اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ تب اس نے میری طرف ہاتھ لہرایا اور باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گہری سانس لی۔ دلچسپیوں کا یہ نیا موڑ۔ خاصا خوشگوار تھا۔ میرے ذہن کو شلیا کی سوزش بھی کم ہو گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے لیے وہی مناسب ہے جو میں نے کیا ہے۔ غلام سیٹھ میری کارکردگی سے خوش ہے اور مجھے نواز رہا ہے پھر کیوں نہ اس کی مرضی کے مطابق کام کروں۔ میری اپنی حیثیت' میری خواہش کیا حقیقت رکھتی ہے اور پھر مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ قدم قدم پر تجربہ ہوا تھا کہ زندگی کے لیے بنائے گئے اصول' نیکی اور فلاح کے اصول ہیں۔ ان سے انسانیت کے تقاضے ضرور پورے ہوتے ہیں۔ زندگی کے نہیں۔ زندگی ان اصولوں کی موت چاہتی ہے اور جو انہیں قتل کرنے پر آمادہ نہیں ہے' وہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اور پھر زندگی اس سے بھرپور انتقام لیتی ہے۔ ساری عمر اس سے انتقام لیا جاتا ہے۔ معمولی سی مثال کوشلیا کی تھی۔ وہ دیوانی' دل کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اگر وہ صرف اسمگلر رہتی۔ مجھے ایران لانے کے بعد خاموشی سے نکل جاتی تو اس کا کچھ نہ بگڑتا۔ لیکن نادان کی نادانی دوسروں کو بھی لے ڈوبی۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جوتے اتارے اور پھر لباس اتارنے لگا۔ اس کے بعد میں ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ خاصا بڑا کمرہ تھا----- باتھ روم بھی اسی سے ملحق تھا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مار کر میں نے چہرہ صاف کیا۔ آئینے میں خود کو دیکھا اور پہچان نہ سکا۔ کیسی تبدیلیاں ہو گئی ہیں مجھ میں----- کتنا بدل گیا ہوں میں۔ کیا یہ سرائے عالمگیر کے ایک کسان کا بیٹا ہے پنجاب کا ایک گبرو جوان ہے جس کے پسینے میں سرسوں کی مہک آتی ہے۔ جس کی پیشانی سے سورج کی شعاعیں منتشر ہوتی ہیں۔ میرے سامنے تو ایک عجیب و غریب انسان کھڑا تھا۔ جس کی کوئی چیز اپنی نہیں تھی۔ سب کچھ دوسروں کا بخشا ہوا۔ سب کچھ۔

میرا کوئی قصور نہیں ہے----- میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں آج تک پنجاب کا ایک معصوم کسان ہوں۔ اس دنیا نے میرے اوپر غلاف چڑھائے ہیں۔ میرے کمزور بازو یہ لبادے نہیں اتار سکتے۔ آؤ اے قسمت کے فرشتو میری شکل بدل دو۔ میری قسمت بدل دو' میری شخصیت بدل دو' مجھے حقیقی رنگ دے دو۔ اگر تم نے میرے لیے ہی سب کچھ مقدر کیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تمہارے فیصلوں کو بدلنے کی قوت کہاں رکھتا ہوں۔ میں دانت پیستا ہوا آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ میرا خون کھولنے لگا تھا۔ میرا ذہنی ہیجان بڑھ گیا تھا۔ ممکن تھا میرے اوپر پھر دیوانگی کا دورہ پڑ جاتا۔ میں نہ جانے کیا کرتا کہ اسی وقت شیفو دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ مسکراتی' ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی کی طرح۔ ایران کی خوشبو بدن میں سمیٹے ہوئے۔ اور میں اسے دیکھنے لگا!

☆ ☆ ☆

"ہیلو" شیفو نے چمکدار آنکھوں سے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ میں جلتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ لڑکی' ہاں یہ بھی تو ایک لڑکی ہے' نرم و گداز جسم کی مالک۔ غلام سیٹھ کی غلام۔ یہ غلام لڑکیاں بازاروں میں کیوں نکل آئیں۔ گھر کی چار دیواری ان کی محافظ ہوتی ہے۔ خاتون خانہ کی حیثیت سے یہ محفوظ رہتی ہیں۔ انہوں نے ان دیواروں کو چھوڑ کر میدان میں آنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کمزور ہستیاں خود کو طاقتور سمجھنے لگی ہیں' حالانکہ یہ ان بھیڑیوں سے واقف ہیں' جو قدم قدم پر گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ جب یہ ان سے خوفزدہ نہیں ہیں تو پھر بھیڑیوں کو شرافت برتنے کی کیا ضرورت ہے۔ شکار خود اپنے قدموں سے چل کر ان کے نزدیک آتا ہے۔ پھر وہ شکار کیوں نہ کریں۔ ان کا تو کام ہی یہی ہے۔

"ارے نہیں نواز------ تمہاری محبت نے تھوڑا سا بزدل ضرور بنا دیا ہے۔ لیکن یہ نہ بھولو کہ میں اکیلے مال لے کر سفر کرتی ہوں------ راستے میں بے شمار خطرناک لوگ ٹکراتے ہیں۔ میں کمزور عورت نہیں ہوں نواز۔" کوشلیا کی آواز کانوں میں گونجی۔

"تمہیں بھیڑیوں سے خوف نہیں معلوم ہوتا۔" میں نے شیفو سے کہا اور وہ حیرانی سے میری شکل دیکھنے لگی۔ "میں نہیں سمجھی مسٹر نواز۔" اس نے تعجب سے کہا اور میں سنبھل گیا۔ کہیں یہ لڑکی مجھے دیوانہ نہ خیال کرے۔

"سنو شیفو------ تم مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔ تم مجھے کوئی کہانی نہیں سناؤ گی۔ وعدہ کرو------ وعدہ کرو------ اور اگر تم نے اپنی مظلومیت کا اظہار کیا------ تو------ تو میں تمہاری گردن دبا دوں گا! سمجھیں------ میں تمہاری گردن دبا دوں گا!" میں نے غراتے ہوئے کہا اور شیفو کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔

"آپ کس قسم کے ذہنی ہیجان میں مبتلا ہیں مسٹر نواز۔" شیفو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھی۔ اور میرے قریب پہنچ گئی۔ "آیئے" آرام کیجئے------ میں آپ کو کوئی کہانی نہیں سناؤں گی۔" اس نے اپنے ملائم ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔" اور مسہری پر لے آئی۔ پھر اس نے میرے دونوں شانوں پر دباؤ ڈال کر مجھے مسہری پر لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ پھر وہ میرے سرہانے آبیٹھی اور نرم انگلیوں سے میری پیشانی دبانے لگی۔ نہ جانے کیا سحر تھا اس کی انگلیوں میں۔ میرا ذہن حیرت انگیز طور پر پرسکون ہونے لگا! میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ شیفو خاموشی سے میری پیشانی دبا رہی تھی۔ اور میرے پورے وجود میں سکون کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

کئی منٹ خاموشی سے گزر گئے۔ پھر شیفو کی آواز ابھری۔ "سو گئے مسٹر نواز۔؟"

"نہیں شیفو------ تمہارے ہاتھوں میں بے حد سکون ہے۔" میں نے آنکھیں بند کئے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی مسٹر نواز' سوائے اس کے کہ آپ بے حد خوبصورت اور پرکشش نوجوان ہیں۔ کوئی بھی لڑکی آپ کو پانے کی آرزو کر سکتی ہے' اور آپ کو حاصل کر کے اپنی قسمت پر رشک کر سکتی ہے۔ آپ ان تمام لوگوں سے بالکل مختلف ہیں جو اس راہ کے راہی ہیں۔ ممکن ہے آپ کی زندگی سے بہت سی المناک کہانیاں وابستہ ہوں۔ لیکن کہانیوں کا بھول جانا ہی

اچھا ہوتا ہے مسٹر نواز------ ہمارا ہر سانس ہمیں ایک نئے حادثے سے دوچار کرتا ہے۔ ہمیں ان حادثات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اور اس پر قابو پانے کے بعد اسے بھلا دینا ضروری ہوتا ہے تاکہ نئے حادثات سے مقابلہ کے لئے خود کو تیار کریں اسی کا نام زندگی ہے۔ بھلا دیجئے سب کچھ------ حال میں گم ہو جایئے۔ حال ہمارا ہے۔ ماضی اور مستقبل صرف وہم ہے۔ اس کا حال سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو شیفو------ لیکن یہ ماضی یاد کیوں رہ جاتا ہے۔ یہ کسی بچھو کی طرح دماغ کی تہہ سے کیوں چپک جاتا ہے۔ جب یہ آہستہ آہستہ ڈنک مارتا ہے تو بڑی چبھن ہوتی ہے شیفو۔!"

"اس بچھو کو ہلاک کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تھوڑی سی کوشش درکار ہے۔ کیا آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے۔؟" "ہاں۔!" میں نے جواب دیا۔

"تب میں آپ کو گٹار سناؤں گی۔ وہ اٹھ گئی۔ اس نے پہلے الماری سے شراب کی ایک بوتل نکالی۔ گلاس نکالا۔ میرے لیے ایک پیگ بنا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ پھر وہ باہر چلی گئی۔ صرف چند منٹ کے لئے۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت گٹار تھا۔ وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس دوران میں نے دوسرا پیگ بنا لیا تھا۔ شیفو نے گٹار چھیڑ دیا تھا۔ وہ ایک کلاسیکی ایرانی دھن بجا رہی تھی۔ گٹار کی ماہر نہیں تھی۔ لیکن جس انداز سے اس نے گٹار تھاما ہوا تھا' اور جس طرح وہ پاؤں پر پاؤں رکھ کر اسے بجا رہی تھی' وہ بہت خوبصورت تھا۔ میری نگاہیں اس کے حسین جسم کا طواف کر رہی تھیں۔ شراب نے رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اور ایک ہلکا سا سرور طاری ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ لپک کر اسے آغوش میں بھینچ لوں۔ اس کے لباس کو تار تار کر دوں------ اور------ اور پھر اس سے کہوں------ کہ------ کہ اب وہ اس میں بیٹھ کر گٹار بجائے۔ عجیب خواہش تھی۔ پہلی خواہش کے بعد ممکن ہے کوئی اور خواہش جاگ اٹھے۔

لیکن ذہن ابھی ماؤف نہیں ہوا تھا۔ شراب نے ابھی تک حواس نہیں چھینے تھے۔ اس لئے یہ احمقانہ خواہش اس کے سامنے نہ ڈھل سکی------ ایرانی دھن عروج پر پہنچ رہی تھی۔ پھر گٹار نے آخری سر نکالے اور خاموش ہو گیا۔ اس دوران خاصی شراب میرے معدے میں اتر گئی تھی۔ میں نے بھاری آواز سے اسے پکارا۔

"شیفو۔!" اور اس نے بڑے خوبصورت انداز میں گردن جھکا دی۔ بہت خوبصورت ہو تم۔؟" میں اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

"شکریہ------ گٹار پسند آیا۔؟"

"بے حد حسین------ تمہاری طرح------!" میں نے کہا اور اس نے ایک بار پھر اسی ادا سے گردن جھکا دی۔ "میرے قریب آؤ شیفو۔!" میں نے کہا اور وہ گٹار لیے ہوئے میرے نزدیک آگئی۔ "گٹار رکھ دو۔!" میں نے دوسرا حکم دیا اور اس نے قریب ہی ایک تپائی پر گٹار رکھ دیا۔ اور پھر گٹار رکھ کر وہ پلٹی تو میں نے اس کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈال کر اسے خود پر گھسیٹ لیا۔ شیفو پکے ہوئے پھل کی طرح میری آغوش میں آگری۔ میں نے وحشیانہ انداز میں اسے مسہری پر گرا کر دبوچ لیا۔ اور پھر میرے ہاتھ گستاخیاں کرنے لگے۔

"یہ--- یہ پردے کیوں ہیں شیفو--- انہیں جدا کر دو--- تم بے حد حسین ہو--- بہت خوبصورت--- میں تمہیں ان پردوں سے بے نیاز دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی نہیں نواز--- ابھی نہیں--- میں تمہاری ہر خدمت کیلئے تیار ہوں۔ لیکن--- خانم سمابہ کی اجازت کے بغیر نہیں--- انہوں نے مجھے حکم دیا کہ تمہیں اداس نہ ہونے دوں۔ لیکن--- لیکن---!"

"کون سمابہ--- وہ کون ہے اجازت دینے والی--- میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔" میں نے اس کے دونوں بازوؤں پر قوت آزمائی کی اور اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ شیفو نے جدوجہد نہیں کی تھی' لیکن جب میں بوسے سے فارغ ہوا تو اس نے ملتجی انداز میں کہا۔

"میں عورت ہوں نواز--- تم میرے پسندیدہ مرد ہو۔ لیکن تم مجھے حکم عدولی کی سزا سے نہ بچا سکو گے۔ براہ کرم--- براہ کرم--- صرف آج رہنے دو۔ تم خانم سمابہ کا حق ہو۔ ان سے پہلے اگر--- اگر میں نے تمہیں حاصل کر لیا' تو وہ مجھے زندہ نہ رہنے دیں گی۔ میری التجا قبول کر لو نواز۔ میری درخواست قبول کر لو۔" اس نے لجاجت سے کہا اور میں سنبھل گیا۔ درحقیقت مجھے یہ وحشیانہ پن نہیں کرنا چاہئے تھا--- میں نے اسے ایک دم چھوڑ دیا۔ اور پھر میں مسہری سے نیچے اتر آیا۔ میرے چہرے پر خجالت کے آثار تھے۔!

"کیا تم ناراض ہو گئے نواز۔" وہ مسہری سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں شیفو--- میں--- میں شرمندہ ہوں مجھے تمہارے ساتھ یہ زیادتی نہیں کرنی چاہئے تھی۔!"

"میں نے بالکل برا نہیں مانا ہے نواز--- شاید تمہیں اپنی قیمت معلوم نہیں ہے۔ کوئی بھی لڑکی تمہاری آرزو مند ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی لڑکی تمہارے چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں کو حاصل کر کے--- خود کو جنت میں محسوس کر سکتی ہے۔ میں تمہیں بے حد پسند کرتی ہوں۔ بس میں اس وقت کا انتظار کرنا چاہتی ہوں جب مجھے تمہارے بازوؤں میں آنے کی اجازت مل جائے اور اس میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔!"

"مجھے گٹار سناؤ شیفو--- کوئی اور خوبصورت دھن سناؤ۔" میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا۔

"دل و جان سے۔" اس نے جھک کر میرا رخسار چومتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس نے گٹار اٹھا لیا۔ اچانک نہ جانے میرے دل میں کیا سمائی کہ میں نے گٹار کی طرف ہاتھ پھیلا دیئے۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا' میری بات کو سمجھا اور پھر گٹار میری طرف بڑھا دیا۔ میں دل کی گھٹن کو سینے سے آزاد کر دینا چاہتا تھا۔ میں اپنی تمام پریشانیوں کو نغمے میں ڈبو دینا چاہتا تھا۔ میری انگلیوں نے گٹار کے تار چھیڑے اور پھر ایک لے ابھرنے لگی۔ لے' جو اداسیاں لیے ہوئے تھی۔ میں نے ذہن آزاد کر دیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور گٹار کے سر بلند ہونے لگے۔ نغمہ سرسرا رہا تھا۔ ایک درد بھرا نغمہ۔ چیختا ہوا' کراہتا ہوا۔ اپنے دامن میں ویرانیاں سمیٹے ہوئے۔ میرے دل کا درد بہہ رہا تھا۔ اور--- شیفو مبہوت ہو گئی تھی۔ اور آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ نغمہ بہتا رہا۔ میرے دل کا درد نکلتا رہا۔ میں نے اس ظالم دنیا سے سارے شکوے کر ڈالے' جس نے

بہت برا سلوک کیا تھا میرے ساتھ--- جس نے میری پاکیزگی چھین لی تھی۔ جس نے میرے جسم سے ابھرنے والی سرسوں کی دلکش مہک چھین لی تھی' اور اب اس جسم سے چرس' افیون اور بھنگ کے سڑے ہوئے بھبکے نکلتے تھے۔ جہلم کا نواز' اسمگلر بن گیا تھا۔ رومانوں کی امین جہلم کی موجوں میں زہر گھل گیا تھا اور جب میں نے سارے شکوے کر ڈالے تو گٹار خاموش ہو گیا۔ ماحول کا تمام درد فضا میں تحلیل ہو گیا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر شیفو کی طرف دیکھا' اس کے چکنے' چمکدار رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں بہہ رہی تھیں۔ میں نے گٹار رکھ دیا۔ وہ دیوانہ وار لپکی--- اور مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے میری گردن' رخساروں اور پیشانی کے بے شمار بوسے لے ڈالے۔ پھر اس نے میری انگلیاں چوم لیں۔ وہ مسہری پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنا سر میری آغوش میں رکھ دیا اور پھر میری گردن میں دونوں ہاتھ ڈال کر مجھے خود پر اتنا جھکایا' کہ میرے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے جا ملے۔!

"یہ سب کیا تھا نواز--- یہ کونسا نغمہ تھا۔ کونسی زبان میں تھا' یہ کیسا نغمہ تھا نواز--- اس نے تو دل ہلا دیا۔ یہ کس کی پکار تھی۔؟ کس کے لئے تھی؟ کیا یہ تمہارے دل کی آواز تھی نواز--- تم اس قدر دکھی ہو۔"

"میں دکھی نہیں ہوں۔ میں نے غموں کا بوجھ اتار پھینکا ہے۔ میں کیوں اس دنیا کے لئے روؤں۔ اس نے مجھے جو بنا دیا ہے اسی میں کیوں نہ خوش رہوں۔ بولو--- جواب دو--- کیا نیکی اور شرافت کا ٹھیکیدار میں ہی ہوں۔ میں نے تو خود پر یہ ماحول مسلط نہیں کیا۔ بتاؤ--- اس میں میری کیا خطا ہے۔؟"

"کوئی خطا نہیں ہے نواز--- بدل ڈالو خود کو--- گلا گھونٹ دو ضمیر کا۔ یہ صرف بھٹکانا جانتا ہے۔ اس کی باتوں میں مت آیا کرو۔ ابتداء میں یہ بہت پریشان کرتا ہے۔ لیکن۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ--- میرے سینے پر سر رکھ کر سو جاؤ۔ جب سو کر اٹھو گے تو ذہن صاف ہو گا۔!"

اور جب میں سو کر اٹھا تو ذہن صاف تھا۔ کوئی چیز میرے بالوں میں گردش کر رہی تھی۔ میرے رخسار کے نیچے شیفو کا گداز سینہ تھا۔ اس کی نرملاہٹ مجھے سکون بخش رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن' وہ شیفو نہیں تھی۔ میرے رخساروں کے نیچے سیمل کی نرم روئی کا تکیہ تھا۔ اور میری نگاہوں کے سامنے سمابہ کا دمکتا ہوا چہرہ تھا۔! اس کے نرم ہاتھوں کی انگلیاں میرے بالوں میں گردش کر رہی تھیں۔ میں نے اس بدلے ہوئے ماحول کو' بدلے ہوئے چہرے کو دیکھا' اور اسی وقت مجھے سمابہ کی آواز سنائی دی!

"اب اٹھ بھی جاؤ نواز--- پیٹ کی بری حالت ہے!"

"ایں۔" میں چونک پڑا۔ میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ سوا دو بجے تھے۔ شاید دن کے۔ "اوہ۔!" مجھے بھی شدید بھوک کا احساس ہوا تھا۔

"تو کیا--- ؟ آپ لوگوں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔؟" میں نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مہمان کے بغیر۔؟" سمابہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوہ--- سوری--- میں شرمندہ ہوں۔" میں نے جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو غسل کر لو۔ شیفو نے تمہارے کپڑے غسل خانے میں پہنچا دیئے ہیں۔ مگر ذرا جلدی۔"

"بس، ابھی۔!" میں نے کہا اور غسل خانے میں گھس گیا۔ ایران کی عام روایات کے خلاف، یہاں کمروں کے باتھ روم اٹیچ تھے۔ بہرحال میں نے غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے باہر نکل آیا۔ سمابہ ایک رسالہ دیکھ رہی تھی، مجھے دیکھ کر اس نے رسالہ رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی۔

"ایک بار پھر شرمندہ ہوں سمابہ۔۔۔۔۔" میں نے کہا۔

"ارے۔ یہ کیا شرمندہ شرمندہ لگا رکھی ہے۔ کیا بار بار، اظہار شرمندگی کر کے تم مجھے شرمندہ کرنا چاہتے ہو۔ آؤ چلیں۔" سمابہ نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت بھی ایک خوبصورت لباس میں ملبوس تھی۔ اس کے جسم سے کیوڑے کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ شاید اس نے کیوڑے کا سینٹ لگایا ہوا تھا۔

ہم دونوں ڈائننگ روم میں پہنچ گئے، جہاں شیفو اپنی نگرانی میں کھانا لگوا رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ مودب ہو گئی۔ اس نے مجھ سے نگاہیں ملانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پھر اس نے ہم دونوں کے لئے کرسیاں کھینچیں اور ہم بیٹھ گئے۔ میرا دل چاہا کہ شیفو کو بھی کھانے پر مدعو کروں لیکن سمابہ کے بارے میں، مجھے ابھی تک کوئی تفصیل نہیں معلوم تھی سمابہ نے شیفو کو نظرانداز کر دیا تو میں بھی خاموش ہو گیا۔ ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ اور کھانے کے دوران سمابہ بولی۔

"میری غیر موجودگی میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی مسٹر نواز۔؟"

"نہیں۔ آپ کی شیفو عمدہ مہمان نواز ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے آپ نے خوب تفریحات کیں؟" سمابہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ لیکن مجھے اس کے سوال سے ایک کھٹک سی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔۔۔۔ شیفو نے مجھے عمدہ شراب پلائی اور گٹار سنایا۔ یہ بہت اچھا گٹار بجاتی ہے۔"

"لیکن اس نے تو کچھ اور کہا ہے۔" سمابہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا۔؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس کا کہنا ہے کہ گٹار بجانے میں آپ بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔" سمابہ نے چالاکی سے بات سنبھال لی۔ "ہاں مجھے بھی گٹار سے دلچسپی ہے۔"

"تب۔۔۔۔۔ رات کو شیفو رقص کرے گی اور آپ گٹار بجائیں گے" سمابہ مسکراتے ہوئے بولی۔ مسکرانے سے اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے، جو بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ پھر ہم نے کھانا ختم کر لیا۔ اور میز سے اٹھ گئے۔!

"آپ خوب گہری نیند سو چکے ہیں مسٹر نواز۔ میں دن میں سونے کی عادی نہیں ہوں۔ چنانچہ آیئے۔ گفتگو کریں گے اور پھر شام کو چار بجے ہم سیر کرنے چلیں گے۔ آپ نے ابھی ایران کے خوبصورت مقامات تو دیکھے نہیں ہوں گے۔"

"نہ دیکھنے کے برابر۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کو یہاں کے دلکش مقامات کی سیر کراؤں گی۔ ایران قدرتی اور غیر قدرتی مناظر سے مالا مال ہے۔" سمابہ نے میرے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ ایک اور کمرے میں آ گئی۔

خوبصورتی سے سجا ہوا یہ کمرہ بھی بہت خوب تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں کسی ماہر سنگتراش کی کاوش آویزاں تھی، محبت میں ڈوبا ہوا ایک جوڑا۔ لباس سے بے نیاز لیکن ان کے خوبصورتی سے تراشے ہوئے برہنہ جسموں کی بہ نسبت، ان کے چہروں سے ٹپکتے ہوئے جذبات سخت ہیجان خیز تھے۔ میں نے کافی غور سے اس مجسمے کو دیکھا۔ اور پھر دوسری چیزوں کو دیکھنے لگا! مختصر لیکن انتہائی خوبصورت اور نفیس سامان زیبائش سے آراستہ یہ کمرہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔

"بہت عمدہ جگہ ہے۔"

"تمہیں پسند آئی۔؟" سمابہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ "یہ سب کچھ۔ میری کاوش ہے۔!"

"آپ بہت باذوق خاتون ہیں۔۔۔۔۔۔!" میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" اس نے گردن خم کی۔ "لیکن میں پہلی بار اس گروہ کے ایک انوکھے شخص سے ملاقات کر رہی ہوں۔ خود آپ کی شخصیت کم سحر انگیز نہیں ہے مسٹر نواز۔!"

"ایک بات پوچھوں خاتون سمابہ۔؟"

"ضرور۔۔۔۔۔؟" وہ مسکرائی۔

"یہاں بہت سے لوگ آتے ہوں گے۔"

"ہاں۔ گروہ سے متعلق۔!"

"آپ ان کی میزبانی اسی انداز سے کرتی ہوں گی؟"

"گو وہ مجھے دل سے نہیں بھاتے۔۔۔۔۔ لیکن میری ڈیوٹی یہی ہے؟ سمابہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ اور ایک لمحے کے لئے میرے دل پر میل آ گیا گویا یہ مکھن جیسا بدن، نہ جانے کتنے بدنما انسانوں سے ہم آغوش ہو چکا ہے یہ رسیلے ہونٹ بہت سے ہونٹوں کو زندگی بخش چکے ہوں گے، لیکن میں اس انداز میں کیوں سوچوں۔ میں خود بھی تو بہت سی کلیوں کا رس چوس چکا ہوں۔ میں کونسا پاکیزہ انسان ہوں۔ سب کے اپنے اپنے مشاغل ہیں۔ سب کا اپنا اپنا طرز زندگی۔۔۔۔۔ انہیں میں نے کیا دے دیا۔ جنہوں نے اپنی پاکیزگی۔ اپنا کنوارپن، میرے حوالے کر دیا تھا۔ یہ حسین لڑکی بھی میری چند دنوں کی ساتھی ہے۔ اچھا ہے یہ ان سے مختلف ہے، کم از کم یہ اوروں کی طرح میرے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش تو نہیں کرے گی!

"اس دنیا میں۔۔۔۔۔" سمابہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "سب کٹھ پتلیاں ہیں مسٹر نواز۔ ہر ایک کی ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ کٹھ پتلیاں صرف ڈور کی جنبش پر ناچتی ہیں۔ اگر ڈور ٹوٹ جائے تو وہ بے جان ہو جاتی ہیں۔ انہیں ڈور سے منسلک رہنا چاہئے۔ ناچتے رہنا چاہئے۔ یہ انہیں کے حق میں سود مند ہے۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ بھی ایک کہانی ہو گی، یقیناً۔۔۔۔۔ نہ جانے اس کے خوبصورت جلد سے آراستہ سینے میں کون کونسی داستانیں پوشیدہ ہوں گی۔ لیکن اب میں کوئی داستان نہیں سننا چاہتا تھا۔ داستانیں سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے۔ میں اپنا ذہن جھٹکنے لگا، اسی وقت وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیوں۔؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"سنا ہے آپ نے ٹھاکر کے گروہ کو تباہ کرنے کے لئے اسی کے گروہ کی کسی لڑکی کا سہارا لیا تھا۔؟" اس نے کہا۔

"کوشلیا۔!" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"تو اس کا نام کوشلیا تھا۔؟" سابہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ اور اس کے بعد وہ کچھ نہ بولی۔ میں اس کا مطلب ذرا دیر سے سمجھا تھا۔ وہ غالباً مجھے بتانا چاہتی تھی کہ اگر وہ اس عمارت میں ٹھہرنے والے تمام مہمانوں کا دل بہلانے کے لئے مجبور ہے' تو کچھ مجبوریاں میرے ساتھ بھی ہیں۔ جیسے کوشلیا۔ ظاہر ہے ایک حسین اور نوجوان لڑکی کو دام فریب میں لائے بغیر میں ٹھاکر اور اس کے گروہ کو کیسے ختم کر سکتا تھا۔

بہرحال۔ میں نے اس سے سمجھوتہ کر لیا۔ میں نے اس کی مجبوریوں کو قبول کر لیا اور میں بھی ہنسنے لگا۔!

شام تک کا وقت ہم نے مختلف تفریحات میں گزارا' ہم رمی کھیلنے بیٹھ گئے تھے۔ باون تاش میرے غلام تھے۔ کس کی مجال تھی کہ میری مرضی کے بغیر چل سکے۔ میں آسانی سے اسے ہراتا رہا۔ وہ ہارتی اور ہنستی رہی۔ پھر شام ہو گئی' اور اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی خوبصورت گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "ساڑھے چار بج گئے ہیں۔ کیا خیال ہے۔؟"

"جو تمہارا۔!" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"تب پھر لباس تبدیل کر لو-----" اس نے کہا اور میں اٹھ گیا۔ اپنے کمرے میں آکر میں نے لباس نکالا اور نوک پلک سے درست ہو کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ وہ اس طرف آتی نظر آئی۔ مجھے تیار دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بہت سے لوگ یہاں آئے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں کو تہران کی سیر کرائی ہے۔ لیکن آج پہلی بار' لوگ ہمیں تعجب سے نہیں دیکھیں گے ہاں' ہم دونوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں پسندیدگی کے جذبات ضرور ابھر آئیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس توصیف کا شکریہ-----!" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ پورچ میں خوبصورت کار کھڑی تھی۔ سابہ نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور کار اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ سابہ کے حسین بال اڑ رہے تھے۔ بالوں کے گچھوں کے درمیان اس کے سفید چکنے چہرے کے نقوش بے حد جاذب نگاہ ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا پسندیدہ سینٹ استعمال کیا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ خوشبو اس کے بدن سے ہم آہنگ تھی اور اس کے بدن ہی کا ایک جز معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس خوشبو کے بغیر اس کا جسم نامکمل رہے گا-----یا یہ خوشبو اس کے جسم کے علاوہ کہیں اور سے آئے گی تو اپنا حسن کھو بیٹھے گی۔

تہران کی سڑکیں حسب معمول بارونق تھیں۔ اہل تہران سڑکوں کی رونق بڑھا رہے تھے۔ خیابان فردوسی سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر کوشلیا یاد آئی۔ لیکن میں نے گردن جھٹک کر اسے ذہن سے نکال پھینکا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ زیریں تہران سے نکل کر ہم شمیران کی طرف چل پڑے۔ تہران کا یہ حصہ کوہ دماوند کے پہلو میں واقع ہے اور باقی شہر سے دو ہزار فٹ بلند ہے۔ سخت گرمیوں میں جب خیابان فردوسی تپنے لگتا ہے تو شمیران میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔

شہری ہنگاموں' شور و غل سے دور یہ ماحول بے حد پر سکون تھا۔ سڑک کے پہلو میں ندی کی گنگناہٹ' پرندوں کی مدھر تانیں اور پہاڑی چشموں کی شر شر نے ماحول کو نہ جانے کیا بنا دیا تھا۔ ذہن کو ایک عجیب سی پالیدگی کا احساس ہوتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف پھولوں کے تختوں اور چناروں کی قطاریں تھیں۔ جن کے پتے سڑک پر بکھر رہے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے کسی کے استقبال کے لیے پھول بچھا دیئے ہوں۔

سابہ نے دربند کے بیلوارڈ نو میں کار پارک کی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ میں بھی دوسری طرف سے اتر آیا تھا۔ وہ میرے نزدیک آگئی اور ملائمت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ تب ہم دونوں اس چٹان کی طرف بڑھ گئے جس میں سیڑھیاں ترشی ہوئی تھیں۔ ان سیڑھیوں نے ہمیں حسین ریستوران کے پر فضاء ماحول میں پہنچا دیا۔ سر پر کھلا آسمان' نیچے رنگ برنگی میزیں اور کرسیاں' ان کے نزدیک ہی ابلتے ہوئے سفید پانی کے لاتعداد چشمے----- میزوں کے درمیان میں آرائشی گلدانوں کی بجائے ننھے منے خوبصورت پرندوں کے نفیس پنجرے رکھے ہوئے تھے۔ ماحول بے حد دلکش بے حد حسین تھا اور پھر سابہ۔! حسن کی دیوی۔ یونان کی وینس۔! میں نے اس کے دمکتے چہرے کو دیکھا۔ اور میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ دنیا نے مجھے ایک شریفانہ زندگی گزارنے سے روک دیا ہے۔ لیکن جو زندگی مجھے ملی ہے' وہ بے حد دلکش ہے۔ خاص طور سے عورت--- میری زندگی کا عورت سے گہرا تعلق ہے۔ کسی بھی وقت' میں عورت سے محروم نہیں رہا ہوں ایک سے ایک حسین لڑکی۔ ایک سے ایک عجیب لڑکی' ہر وقت میرے ساتھ رہی ہے۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے۔! "کیا سوچ رہے ہو نواز۔؟" سابہ کی مترنم آواز نے مجھے ٹوک دیا۔

"بڑی حسین جگہ ہے سابہ۔ بڑی رومان پرور----- اور پھر----- تمہاری موجودگی سے اس جگہ کا حسن بڑھ گیا ہے۔"

"شکریہ-----!" سابہ دلاویز انداز میں مسکرائی۔ ویٹر ہمارے نزدیک آگیا تھا۔ "آب جو خنک' و جگر مرغ۔" اس نے ویٹر کو آرڈر دیا اور وہ گردن جھکا کر چلا گیا۔

آب جو خنک بھی خوب تھا۔ بیئر کے کئی جگ چڑھانے کے بعد طبیعت میں ترنگ آگئی۔ سابہ کا چہرہ بھی تمتمانے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں لال لال ڈورے تیرنے لگے تھے اور ان کی گہرائی کچھ اور بڑھ گئی تھی جس نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے۔ میرا دل نہ جانے کیا کیا چاہ رہا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس پبلک مقام پر دل کی ایک بھی حسرت پوری نہیں کی جا سکتی تھی۔ تہران کے تفریحی مقامات اور انگلینڈ کے ساحلوں میں بہت فرق ہے۔ آب جو اور جگر مرغ سے نپٹ کر ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کیا خیال ہے۔؟" میں نے سابہ سے پوچھا۔

"ابھی بہت وقت باقی ہے۔"

"پھر-----؟"

"آؤ-----!" اس نے کہا۔ اور بل ادا کر کے اٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم شمالی علاقے سے اتر کر تہران کی وسیع سڑکوں پر آگئے۔ سابہ نے کار کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز کر دی تھی۔ میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"اسٹیئرنگ پر کنٹرول رکھو سامبہ۔!" میں بے ساختہ بول پڑا اور سامبہ کھنک دار ہنسی ہنس کر خاموش ہو گئی۔ رفتار وہی رہی تھی۔ پھر میں بھی بے فکر ہو گیا۔ اب بزدلی بھی نہیں دکھائی جا سکتی تھی۔ تہران پیچھے رہا جا رہا تھا۔ اور پھر ہم قصبہ خراج بھی پیچھے چھوڑ آئے۔ اب کار دریائے خراج کے ساتھ ساتھ لپٹی ہوئی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دریا سڑک اور پتھریلی چٹانوں کے درمیان سر پٹختا ہوا بڑے زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ اور دریا کے کنارے درختوں کی گھنی چھاؤں میں رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس لوگ بیٹھے مختلف مشاغل میں مصروف تھے۔!

ایک موڑ پر دریا درختوں میں گم ہو گیا تھا۔ سامبہ نے کار ایک طرف روک دی۔ اور ایک بار پھر ہم نیچے اتر آئے۔ اس ماحول کا بھی جواب نہیں تھا۔ سامبہ میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نیچے وادی میں جانے والی کچی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ میں گہری سانسیں لے رہا تھا۔

"سامبہ-----!" میں نے اسے آواز دی۔

"ہوں-----!" اس نے اسی انداز سے سیڑھیاں اترتے ہوئے پیار بھرے انداز میں کہا۔ "ایک بات پوچھوں۔؟"

"ضرور-----!"

"تم بہت سے مہمانوں کے ساتھ یہاں آئی ہو گی۔!"

"ہاں۔!" اس نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔

"کوئی ایسا بھی تھا' جو یہاں سے جانے کے بعد تمہیں یاد رہ گیا ہو؟" میں نے کہا۔ اور سامبہ خاموش ہو گئی۔ اس کی خاموشی سے اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے فطرت سے مجبور ہو کر پھر ایک احمقانہ سوال کر دیا ہے۔ وہ پوری صاف گوئی سے اپنے بارے میں بتا چکی تھی۔ ایک لفظ پر بھی اس نے غلاف چڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بعد یہ سوال۔!

میں نے سامبہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس پر سوچ کے آثار تھے۔ "کیا سوچنے لگیں سامبہ-----؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"تمہارے سوال کا جواب-----!" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اوہ----- وہ کوئی سنجیدہ سوال نہیں ہے۔ مجھے یہ جگہ بہت پسند آئی ہے۔ میں نے اپنے طور پر پوچھ لیا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد----- جب کبھی یہ دلکش وادی یاد آئے گی۔ میں تمہیں ضرور یاد کروں گا۔ اس وادی کا حسن تمہارے بغیر نامکمل ہے۔ میرا یہی احساس ہے۔ تم اسے کسی اور بات پر محمول نہ کرنا-----!" میں نے جلدی سے کہا۔ اور سامبہ ہنس پڑی۔ تکدر چھٹ گیا۔ اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ نہ ہی میں نے پھر اس سلسلے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کی----- ہم دونوں کچی سیڑھیاں طے کر چکے تھے اور اب دریا کے کنارے پر تھے!

جھاگ اڑاتے دریا کے کنارے پتھروں پر حسین ترین قالین بچھائے بیٹھے لوگ' اپنے آپ میں مگن تھے۔ سامبہ مجھے لے کر اس ریستوران کی طرف چل پڑی جو تھوڑی دور واقع تھا۔ ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"یہاں کی مچھلی بے حد لذیذ ہوتی ہے۔" سامبہ بولی۔ "تمہیں مچھلی پسند ہے۔؟"

"ہاں۔!" میں نے جواب دیا۔

"تب پھر مچھلی کھائیں گے۔" اس نے کہا اور میں خاموش ہو گیا بلند درختوں میں خوشگوار ہوا کی سرسراہٹ بہتے ہوئے دریا کے شور سے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب سی نغمگی بکھیر رہی تھی۔ ریستوران کے درمیان ایک کچے تالاب میں دریائے خراج سے پکڑی ہوئی مچھلیاں اچھل رہی تھیں۔ "اپنی پسند کی مچھلی خود پکڑو اور ویٹر کے حوالے کر دو۔ وہ آپ کی میز کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ ایستادہ کر کے بڑی نفاست کے ساتھ تل دے گا۔" سامبہ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا۔ اور مجھے یہ طریقہ خاصا دلچسپ معلوم ہوا۔ ہم دونوں حوض کے کنارے جا بیٹھے۔ دوسرے چند لوگ بھی مچھلیاں پکڑ رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے بھی کوٹ اتار کر سامبہ کو دیا' قمیض کی آستین اونچی کی اور حوض میں ہاتھ ڈال دیا۔ ایک مچھلی پر میرا ہاتھ پڑا اور وہ پھسل کر جلدی سے نکل گئی۔ سامبہ کے کھنک دار قہقہے نے میرے کانوں میں رس گھول دیا۔

"تم بھی کوشش کرو-----" میں نے اسے دعوت دی۔

"نہیں----- آج تمہارے ہاتھ سے پکڑی ہوئی مچھلی کھاؤں گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور میں پھر کوشش کرنے لگا۔ بہت سی مچھلیاں ہاتھ لگیں اور نکل گئیں۔ لیکن بالآخر ایک مچھلی میری گرفت میں آ ہی گئی اور میں نے اسے باہر نکال کر ایک طرف اچھال دیا۔ ویٹر نے جلدی سے مچھلی اٹھا لی تھی۔ پھر میں نے ایک اور مچھلی پکڑی اور پھر رومال سے ہاتھ خشک کرتا ہوا اٹھ گیا۔ یہ بچوں کا سا کھیل بہت دلچسپ لگا تھا۔ ہم کئی منٹ اس پر تبصرہ کرتے رہے پھر اچانک ہم سے تھوڑے فاصلے پر موسیقی کی لہریں ابھریں۔ چند موسیقار ایران کے روایتی ساز بجا رہے تھے اور پھر دف پر تھاپ پڑی اور ایک ایرانی موسیقار ایک غزل الاپنے لگا۔ آواز کافی دلکش تھی۔ میرا مچھلی تل رہا تھا' اس کی سوندھی سوندھی بو نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ دوسری طرف موسیقار کی دلکش آواز کا تاثر! وہ لمحے میری زندگی میں یادگار تھے۔ بے حد متاثر ہوا تھا میں اس ماحول سے۔ شام ڈھل چکی تھی اور روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ ہم نے لذیز مچھلی کھائی اور پھر کافی پینے کے بعد اٹھ گئے۔ اب واپسی کا سفر شروع ہوا۔ سامبہ نے اب بھی بڑے ماہرانہ انداز میں ڈرائیونگ کی' اور اس وقت رات پورے ماحول پر چھا چکی تھی جب ہم اپنی کوٹھی میں داخل ہوئے۔

سامبہ کے چہرے پر خوشیاں رقصاں تھیں۔ میں بھی مسرور تھا ذہن پر کوئی بار نہیں تھا۔ ہم دونوں مسکراتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہو گئے۔! ایک دروازے پر شیفو نے ہمارا استقبال کیا۔ میں نے چونک کر شیفو کو دیکھا اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ بالکل تاریکی تھی۔ بہرحال ظاہر ہے وہ ملازمہ تھی۔ تنہائی میں اس نے جس والہیت کا اظہار کیا تھا وہ مجھے یاد تھی لیکن بہرحال وہ خانم سامبہ کی اجازت کے بغیر مجھ سے اظہار محبت بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"تم نے تیاریاں کر لی ہیں شیفو۔؟" سامبہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں خانم۔ تیاریاں مکمل ہیں۔" شیفو نے جواب دیا۔ اور پھر بولی۔ "کھانا کس وقت کھایا جائے گا۔؟"

"یہ تو مسٹر نواز ہی بتا سکیں گے۔!"

"کھانا----- میرا خیال ہے کھانے کی گنجائش تو نہیں رہی۔ مرغ اور پھر مچھلیاں----- میں تو اب کچھ نہ کھاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ادھر بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ شیفو۔۔۔۔۔۔ صرف پھلوں کا انتظام کرو۔۔۔۔۔۔ اور وہ بھی نو بجے کے بعد۔۔۔۔۔۔! اس سے پہلے ہم آرام کریں گے۔ کیوں نواز صاحب۔۔؟"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے کہا۔ اور شیفو خاموشی سے واپس چلی گئی! سمابہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک اور کمرے میں آگئی۔ یہ ہماری خواب گاہ نہیں تھی لیکن خواب گاہ ہی کے انداز میں سجا ہوا ایک کمرہ تھا۔! "لباس بدل کر آرام سے لیٹ جائیں۔ اب ہماری ملاقات نو بجے کے بعد ہو گی۔ اس وقت تک آرام کریں!" وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی اور میں نے گردن ہلا دی۔! پھر میں نے جوتے اتارے' لباس تبدیل کیا اور مسہری پر لیٹ گیا۔ ان تیاریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو شیفو نے مکمل کرلی تھیں۔ میری ذہنی رو بھٹکتی رہی۔ کبھی شمران کی بلند پہاڑیوں پر' کبھی خراج کی وادی کے ریستوران میں۔ نہ جانے کہاں کہاں۔۔۔۔۔۔! بہرحال میں نے ذہن کو کسی تکلیف دہ خیال سے پراگندہ نہ ہونے دیا۔!

اور اسی طرح طویل وقت گزر گیا۔ تب دروازے پر آہٹ ہوئی' نہ جانے کیوں۔ میں اسی انداز میں لیٹا رہا۔ اندر داخل ہونے والی شیفو تھی' اس نے چوروں کے سے انداز میں مجھے دیکھا۔ پھر دروازے کی طرف۔ اور پھر وہ دبے قدموں سے میرے بستر کے نزدیک آگئی۔ میں نے آنکھیں بند کرکے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کرلیے' جیسے بے خبر سو رہا ہوں۔ شیفو چند سیکنڈ حالات کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر آہستہ سے جھکی اور اس نے چوری چوری میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔

یہ انوکھی بات' انوکھا انداز' میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ سب کیا تھا۔ شیفو جلدی سے ہٹ گئی تھی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ پھر دروازے کی طرف۔۔۔۔۔۔ پھر اس کا ایک ہاتھ میرے سینے کی طرف بڑھا۔ غالباً وہ مجھے جگانا چاہتی تھی' لیکن اسے احساس ہوا کہ اس کی حرکت نے میری نیند نہیں توڑی ہے تو شاید اس کا دل ایک بار پھر چوری کرنے کو چاہا۔۔۔۔۔۔ وہ پھر جھکی اور اس نے اسی انداز میں میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔۔۔۔۔۔ لیکن اس بار میں نے اچانک دونوں ہاتھ اٹھائے اور اسے دبوچ لیا۔۔۔۔۔۔ شیفو ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ میرے اوپر آگری۔۔۔۔۔۔ اس کا نرم و گداز جسم میرے اوپر آپڑا تھا اور میں نے اسے پوری قوت سے بھینچ لیا تھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر بھی گرفت سخت کر دی تھی۔ بدقت تمام وہ اپنا منہ میرے منہ سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

"للہ۔۔۔۔۔۔ چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔ خانم آجائے گی۔ وہ۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔"۔

"تم خانم سے خوفزدہ ہو شیفو۔۔۔۔۔۔!" میں نے اپنے ہاتھ تھوڑے سے نیچے پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔ بس چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔ وہ کبھی یہ بات پسند نہ کرے گی۔ کہ۔۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔۔ اس سے پہلے۔۔۔۔۔۔ میں تمہارے قریب ہو جاؤں۔ میری شامت ہی آجائے گی۔ اس معاملے میں وہ بڑی جلاد ہے۔" شیفو نے کہا۔ وہ کسمسا رہی تھی۔ لیکن میرے ہاتھوں کی حرکت سے اس کی مدافعت کسی قدر سست بھی پڑ گئی۔!

تب میں نے اسے خوب بھینچ کر اس کا ایک "ٹیکنیکل" بوسہ لیا اور وہ نڈھال سی ہو گئی۔ تاہم میں نے اس بوسے کے بعد اسے چھوڑ دیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے جسم سے اٹھ گئی۔ لیکن

اس کے تنفس میں تیزی تھی' اٹھتے ہوئے اس نے میرے جسم کا سہارا لیا تھا۔ اور میرے پورے جسم میں انگارے سے سلگ اٹھے تھے۔

"اٹھو۔۔۔۔۔۔ خانم بلا رہی ہیں۔" اس نے اپنی حالت سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔؟"

"آئینہ خانے میں۔۔۔۔۔۔" شیفو نے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔۔۔۔ یہ آئینہ خانہ کہاں ہے؟"

"دیکھ لو گے۔" اس نے مکمل طور پر خود پر قابو پاکر مسکراتے ہوئے کہا۔ اور میں کسلمندی سے اٹھ گیا۔ پھر میں شیفو کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ پوری کوٹھی میں نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔ آئینہ خانہ کوٹھی کے انتہائی سرے پر واقع تھا۔ ایک خوبصورت دروازے کو کھول کر میں اندر داخل ہو گیا۔ شیفو دروازے پر ہی رک گئی تھی۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ اور۔۔۔۔۔۔ آئینہ خانے میں داخل ہو گیا۔

درحقیقت آئینہ خانہ تھا۔ چاروں طرف دیواروں میں ہلکے آسمانی آئینے نصب تھے۔ چھت میں رنگین شمعوں کا فانوس لٹک رہا تھا اور صرف ایک فانوس نے اس بہت بڑے ہال نما کمرے کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔ ایک طرف لمبی سیٹی پڑی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔ ایک کونے میں ایک چوڑی مسہری تھی' جو خوب سجی ہوئی تھی۔ سیٹی کے قریب ایک لمبی میز پر پھلوں کے اور خشک میووں کے برتن سجے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان اعلیٰ قسم کی شراب کی کئی بوتلیں اور بلوریں پیمانے رکھے ہوئے تھے۔

"تو یہ تیاریاں تھیں۔!" میں نے گہری سانس لے کر سوچا۔ لیکن سمابہ کہاں۔؟ دوسرے لمحے ایک آئینہ اپنی جگہ سے سرکا اور اس کے عقب سے سمابہ باہر نکل آئی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ انتہائی حسین میک اپ کیا ہوا تھا اس نے۔۔۔۔۔۔ اس کے بال ناگنوں کے انداز میں بکھرے ہوئے تھے' جسم پر باریک جالی کا بنا ہوا ایک لباس تھا' جو بالکل چست تھا۔ سیاہ رنگ کے لباس میں جگہ جگہ کٹاؤ تھا جن کے نیچے سے سمابہ کا دلکش سفید جسم اسی طرح چمک رہا تھا جیسے تاریکی میں شمعیں جل رہی ہوں۔

میں مبہوت اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے نزدیک آگئی۔ اس نے ایک خاص ادا سے میری طرف دونوں ہاتھ بڑھا دیئے اور اپنے جسم کو پیچھے کی طرف جھکا کر انتظار کرنے لگی۔ میں آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ تب اس نے اپنے ریشمی ہاتھ میری گردن میں ڈال دیئے اور میں نے اسے خود میں جذب کر لیا۔ ہمارا بوسہ کئی منٹ طویل تھا اور ابھی ہم اس سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اسی دروازے سے شیفو اندر داخل ہو گئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ شیفو ایرانی رقاصاؤں کا لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کے ہاتھوں میں ایک گٹار دبا ہوا تھا۔! لیکن اسے دیکھ کر سمابہ مجھ سے جدا نہ ہوئی' بلکہ اس نے ایک بار پھر بھینچ کر مجھے اپنے جسم سے چپکا لیا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ تب شیفو نے گٹار چھیڑ دیا۔ اور دھیمے دھیمے سروں میں ایک ایرانی دھن گٹار سے ابھرنے لگی۔ ماحول بے حد رومانی تھا۔ سمابہ مجھے لئے ہوئے سیٹی کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے میز سے انگوروں کا ایک خوشہ اٹھا لیا۔ مجھے سیٹی پر بٹھایا پھر خود بیٹھی اور میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ پھر اس نے انگور میرے ہونٹوں سے لگا دیئے۔! سمابہ کے نرم و گداز زانو کی گدگداہٹیں میرے پورے جسم میں سرایت کر رہی تھیں۔ میں نے انگور دانتوں سے

توڑ لیا۔ اور سابہ نے وہی خوشہ اپنے منہ سے لگا لیا۔ گٹار کی دھن تھوڑی سی بلند ہو گئی تھی۔ یہ خوبصورت نغمہ تھا۔ شیفو گٹار بجاتی رہی۔ ہم انگور کھاتے رہے اور میں سابہ کے جسم کی گدگداہٹ سے دیوانہ ہوتا رہا۔ میں نے ہاتھ الٹے کر کے اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیئے تھے۔ سابہ کی پتلی کمر میں میرے ہاتھوں کا ہالہ پڑا ہوا تھا۔!

اور ---- شیفو گٹار بجا رہی تھی۔ پھر نغمہ ختم ہو گیا۔! اور شیفو نے ہمارے سامنے آکر گردن جھکائی۔ اس کے بعد اس نے گٹار رکھ دیا۔ اور میز کی طرف بڑھ گئی۔ کئی شرابوں کو ملا کر اس نے کاک ٹیل بنائی اور ایک خوبصورت ٹرے میں رکھ کر ہم دونوں کو پیمانے پیش کر دیئے۔

میں نے اپنا اور سابہ نے اپنا پیمانہ اٹھا لیا۔ اور آہستہ آہستہ چسکیاں لینے لگے' شیفو نے پھر گٹار اٹھا لیا تھا۔ اس بار اس نے ایک اور دھن چھیڑی ---- بڑی ہیجان خیز دھن تھی۔ ہمارے پاؤں تھرکنے لگے۔ کاک ٹیل رنگ دکھا رہی تھی۔ ویسے بہت عمدہ تھی۔ میں یوں بھی شرابوں سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ لیکن مجھے یہ کاک ٹیل بہت پسند آئی۔ سابہ نے خود اٹھ کر دوسرے جام لبریز کئے۔ اور ہم شیفو کا نغمہ سنتے رہے۔ پھر یہ نغمہ بھی ختم ہو گیا۔ اور شیفو نے گٹار رکھ دیا۔! پھر وہ بال سنوارتے ہوئے ہماری طرف دیکھنے لگی' تب سابہ نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

"نواز ----!"

"ہوں ----!"

"اب تم گٹار بجاؤ گے اور شیفو رقص کرے گی۔ یہ بہت اچھی رقاصہ ہے۔ کیا خیال ہے۔؟"

"بہت عمدہ ----!" میں نے جھوم کر گٹار اٹھا لیا ---- شراب کا ہلکا سا سرور میرے ذہن پر طاری تھا۔ وہ دو پریاں میری آغوش میں تھیں' چنانچہ اس وقت جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ میں کوئی ایسا نغمہ تلاش کرنے لگا جو دلوں میں آگ لگا دے۔ اور پھر گٹار کے تاروں سے ایک خوبصورت نغمہ پھوٹ پڑا۔ یہ ایک فرنچ دھن تھی جو میں نے بہت محنت سے سیکھی تھی۔ اور اس دھن کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ شیفو بے خود ہو کر رقص کرنے لگی۔ سابہ بھی تھرک رہی تھی۔ اس کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ اس نے اور شراب اپنے جام میں انڈیل لی اور جب تک میں نغمہ بجاتا رہا۔ کئی جام چڑھا گئی۔ اب اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور پھر وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ وہ بدمست ہو کر رقص کرنے لگی۔ ایک ہیجانی رقص بالکل ان ہپیوں کی طرح جن کے رقص میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ میں نے نغمے کی دھن پھر تیز کر دی۔ شیفو رک گئی تھی اور اب صرف سابہ رقص کر رہی تھی۔ اس کا دراز قامت چست لباس دل ہوتے لے رہا تھا۔ اور پھر ایک تیز آواز کے ساتھ اچانک اس نے لباس کے ڈھکے ہوئے بند کندھوں سے اتار دیئے۔ لباس نیچے کھسکنے لگا اور پھر کمر سے نیچے لٹک..... گیا۔ اس کا چمکدار جسم عریاں ہو گیا۔ وہ رقص کر رہی تھی۔ اس کے لمبے بال وحشیانہ انداز میں گردش کر رہے تھے۔

سنگ مرمر سے تراشا ہوا بدن۔ چاندی کی طرح چمکتا ہوا۔ آنکھوں سے رستی ہوئی شراب' شیشے چٹخے جا رہے تھے۔ میں نے گٹار ایک طرف اچھال دیا۔ اور لپک کر سابہ کو آغوش میں گھسیٹ لیا اور اسی وقت شیفو نے شمعدان گل کر دیا۔ رنگین شیشوں کے پیچھے چھپی ہوئی مدھم روشنی جل اٹھی اور ماحول میں رومان انگیز نیلاہٹ پھیل گئی۔ میری وحشت عود کر آئی تھی۔ میں شیفو کو نظر انداز کر چکا

تھا۔ میں نے سابہ کو مسہری پر اچھال دیا اور پھر خود بھی چھلانگ لگا دی۔!

تب میں نے شیفو کے ہاتھ اپنے جسم پر رینگتے محسوس کئے وہ مجھے لباس کی بندشوں سے آزاد کر رہی تھی۔ شیفو کی موجودگی مجھے بری نہیں معلوم ہوئی۔ میں نے اسے اس کا کام کرنے دیا۔ میں تو سابہ کے جسم کی چمک میں گم ہو کر خود کو بھول چکا تھا۔ اپنی حیثیت فراموش کر چکا تھا۔ لیکن شیفو کو اپنا فرض معلوم تھا۔

اس نے ایک اور جام بنا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ سابہ گردن بھینچ رہی تھی۔ کمرہ گھوم رہا تھا ---- زلزلہ آگیا تھا۔ اور پھر ---- ماحول ساکت ہو گیا۔ طوفان گزر گیا تھا ----

اور ---- اب سناٹا تھا ---- گہرا اور طویل سناٹا ---- میرے ذہن میں سنسناہٹ ابھر رہی تھی۔ نہ جانے کب تک یہ سنسناہٹ جاری رہی تھی۔!

پھر میں نے اپنے جسم پر کوئی چیز رینگتی محسوس کی ---- ذہن کچھ جاگا ---- احساس بیدار ہوا ---- ہاتھ ہی تو تھے۔ میں نے بے چین ہو کر وہ ہاتھ پکڑ لیے۔ لیکن میرے ہونٹوں پر ایک بوجھل نمی' ایک ہلکے سے وزن کا احساس ہوا۔ سابہ بھی جاگ گئی تھی۔ وہ مجھے بیدار کر رہی تھی۔ اور میں بیدار ہو گیا۔ میں نے سابہ کو دیکھا۔ لیکن ---- میرے سامنے سابہ کا چہرہ نہیں تھا۔ وہ تو شیفو تھی۔ میری پسندیدہ عورت ---- میں نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اور شیفو کا پورا بدن میرے اوپر آگیا۔ لباس سے بے نیاز بدن ---- تب میرے ہاتھ اس کے چکنے بدن پر پھسلنے لگے لیکن انتہائی سروں تک کسی رکاوٹ کا احساس نہ ہوا۔ شیفو کے بدن پر کوئی لباس نہیں تھا۔ میں چونک کر اٹھ گیا۔ سابہ مسہری کے آخری سرے پر بے سدھ پڑی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ---- شیفو میرے بدن سے پھسل گئی۔ اس کی آنکھوں میں طلب تھی۔ التجا تھی ---- نہ جانے کیا کچھ تھا۔ پھر اس کے ہونٹ لرزے۔

"میری یہی حیثیت ہے نواز ---- میں خادمہ ہوں۔!" اس کی سرگوشی ابھری۔ اور میں نے اس کے دل سے ہر محرومی مٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اس کے دل سے یہ احساس مٹا دیا کہ وہ کسی سے کم ہے' اور وہ میری محبت سے سرشار ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آسودگی کے کنول کھل گئے۔ صبح تک وہ میری آغوش میں رہی۔ سابہ بے خبر سو رہی تھی۔ پھر سورج نکلنے سے قبل شیفو آہستگی سے میرے پہلو سے نکل گئی۔ اور میں گہری نیند سو گیا۔!

ناشتہ ٹھیک پونے گیارہ بجے کیا گیا۔ سابہ نکھری ہوئی تھی۔ سفید سلک کے حسین تراش کے لباس میں وہ بے حد خوبصورت نظر آرہی تھی۔ اس کے حسن کا طلسم ٹوٹ گیا تھا اور اب وہ ایک کھلی کتاب تھی۔ بے شک وہ بے حد حسین تھی۔ اس کا جسم سڈول اور دلکش تھا۔ ایک پرانے اور تجربے کار شکاری کی حیثیت سے' میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ اس کی بہ نسبت شیفو کہیں زیادہ دلکش' کہیں زیادہ بھرپور تھی۔ بوٹے سے قد کی یہ حسینہ' چونکہ نظر انداز کی جاتی رہی تھی۔ اس لئے اس کی سپردگی میں ایک انوکھی کشش تھی' جو سابہ میں مفقود تھی اور میں نے پوری طرح یہ کشش محسوس کی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اس کا اظہار بے سود ہے۔

ناشتے کے بعد سابہ نے گھڑی دیکھی اور پھر معذرت آمیز انداز میں بولی۔ "مجھے اجازت دو گے نواز ---- ذرا جانا ہے۔ ممکن ہے آج لنچ پر بھی نہ پہنچ سکوں۔ ہاں شام ہماری ہو گی ----" وہ

مسکرائی۔ "اور۔۔۔۔۔ رات بھی۔"

"اوکے۔۔۔۔۔!" میں نے کہا۔ "میں گہری نیند سوؤں گا۔"

"ضرور۔۔۔۔۔" اس نے کہا۔ اور پھر شیفو سے بولی۔ "شیفو۔۔۔۔۔ ہر طرح کا خیال رکھنا۔"

"جی۔۔۔۔۔!" شیفو نے گردن ہلا دی۔

"لیکن اتنی پابندی سے آپ کہاں جاتی ہیں سامبہ۔؟"

"آفس۔۔۔۔۔!" اس نے سادگی سے کہا۔

"میں نہیں سمجھا۔"

"میں سمجھا بھی نہیں سکوں گی۔ بس یوں سمجھ لو۔۔۔۔۔ کہ یہاں ہمارا سپلائی ڈپو موجود ہے، جہاں سے مختلف ذرائع سے ضرورت مندوں کو فروخت ہوتی ہے۔ لیکن ہول سیل۔۔۔۔۔ ریٹیل سیل ہمارے یہاں نہیں ہے، کیونکہ اس میں خطرہ ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔!" میں نے گردن ہلائی۔

"یہاں ہمارے بہت بڑے بڑے اسٹور ہیں۔ جہاں سے آگے سپلائی ہوتی ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔ باقاعدہ۔۔۔۔۔؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور ناصر یمانی یہاں کا انچارج ہے۔؟"

"نہیں۔۔۔۔۔ انچارج کوئی اور ہے۔" سامبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ "اب اجازت۔؟"

"ٹھیک ہے۔؟" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور وہ ناشتے کے کمرے سے نکل گئی۔ "مجھے ایک کپ کافی اور دو شیفو۔!" میں نے کہا اور شیفو جلدی جلدی کافی بنانے لگی، پھر اس نے کافی کا کپ میرے سامنے رکھ دیا۔

"اپنے لئے بھی بناؤ شیفو۔ یہاں تمہاری کوئی حیثیت نہ ہو۔ لیکن میری نگاہوں میں تم سامبہ سے بہتر ہو۔" میں نے کہا۔ اور شیفو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "ہاں شیفو۔۔۔۔۔ تم سامبہ سے زیادہ خوبصورت ہو۔ تم اس سے کہیں زیادہ دلکش ہو۔ یقین کرو۔۔۔۔۔ میں تمہیں سامبہ سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔" میں نے پھر کہا اور شیفو نے گردن جھکالی۔ "اپنے لئے کافی بناؤ شیفو۔۔۔۔۔ اور میرے ساتھ پیو۔"

"مناسب نہیں ہو گا نواز۔۔۔۔۔ خانم سامبہ تک بھی اطلاع پہنچ سکتی ہے۔" شیفو نے کہا۔

"تم اس سے اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ اگر اطلاع مل بھی جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے مجبور کیا تھا۔ کافی بناؤ شیفو۔۔۔۔۔ یا پھر ٹھہرو۔ میں خود تمہارے لئے بناتا ہوں۔!" شیفو منع کرتی رہی۔ لیکن میں نے اس کے لئے کافی بنائی۔ اور پھر اسے اپنے قریب بٹھا کر پلائی۔ "سامبہ نے تمہیں میری خدمت کیلئے مخصوص کیا ہے۔ اب میں جس طرح چاہوں تم سے خدمت لے سکتا ہوں۔"

"میں حاضر ہوں۔!" شیفو نے کہا "لیکن خانم سامبہ نے جو پابندیاں لگادی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"میں ان پابندیوں کو قبول نہیں کروں گا۔ اور اگر تم نے اصرار کیا تو۔۔۔۔۔ اسی وقت یہ کوٹھی چھوڑ دوں گا۔!" میں نے غصیلے انداز میں کہا۔ اور شیفو میری شکل دیکھتی رہی۔ کافی کی پیالیاں ختم کرنے کے بعد ہم...... کمرے سے نکل آئے...... اور میں شیفو کا ہاتھ پکڑے ہوئے خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

"یہاں کتنے ملازم ہیں؟"

"بے شمار۔!"

"تمہارے سپرد آج کیا کام ہے۔؟"

"صرف آپ کی خدمت۔! جب تک آپ یہاں موجود ہیں۔"

"ہوں۔!" میں نے خواب گاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور پھر جب شیفو بھی اندر آگئی تو میں نے دروازہ بند کر لیا۔ "میرا خیال ہے شیفو۔۔۔۔۔ میں تمہیں پسند نہیں آسکا۔!"

"ایسی بات نہ کہئے۔ میں نے۔۔۔۔۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو دل سے چاہا ہے۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "پھر یہ کیسی چاہت ہے شیفو۔۔۔۔۔ تم ذرا سا خطرہ مول نہیں لے سکتیں۔" اور شیفو نے گردن جھکا دی۔ وہ خطرہ مول لینے کو تیار ہو گئی تھی وہ میرے مقابل آبیٹھی۔ اور میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اسے اپنے پہلو میں گراتے ہوئے کہا۔ "یقین کرو شیفو، سامبہ بظاہر حسین ہے۔ لیکن وہ تمہارے حسن کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ میں تمہیں بے حد پسند کرنے لگا ہوں۔ کیا آج مجھے گٹار نہ سناؤ گی۔"

"گٹار۔۔۔۔۔ آپ مجھ سے کہیں بہتر گٹار بجاتے ہیں مسٹر نواز۔۔۔۔۔ رات کو آپ نے غضب کیا تھا۔!"

"لاؤ۔۔۔۔۔ پھر آج میں تمہیں اپنے دیس کا نغمہ سناؤں گا! گٹار لے آؤ۔" اور وہ خوشی سے گردن ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں عقب سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اپنی آوارگی پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ عورتوں کو بے وقوف بنانے کا فن مجھے خوب آگیا تھا اور پھر یہ ایسی مشکل بات بھی نہیں تھی۔ تمام عورتوں کو ایک ہی انداز میں بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔

شیفو گٹار لے کر واپس آگئی۔ اس نے گٹار میری آغوش میں رکھ دیا۔ اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ تب میں نے گٹار اٹھالیا۔ اور پھر گٹار کے سر' لال میری پت رکھیو...... کی گردان کرنے لگے۔! میں ایک آوارہ انسان تھا۔ ایک بھٹکا ہوا انسان۔۔۔۔۔ لیکن اس نغمے سے مجھے آج بھی عقیدت تھی۔ اس سے آج بھی مجھے پیار تھا اور اسے بجاتے ہوئے آج بھی میں بے خود ہو جاتا تھا۔ یہ نغمہ میری روح میں رچا ہوا تھا۔ نغمہ پوری طرح جوان ہو گیا۔ شیفو سکتے کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت تھی۔! ایسا لگتا تھا جیسے اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی ہو۔

نغمہ ختم ہو گیا۔ لیکن فضائیں ایسی ہی دھن الاپ رہی تھیں۔ درودیوار سے وہی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جو میں نے اپنے کانوں سے سنیں۔ یقیناً شیفو نے بھی سنی ہوں گی۔"

"نواز۔۔۔۔۔" بالآخر اس نے کہا۔ اور میں چونک پڑا۔ "بے شک تم دنیا کے سب سے بڑے فنکار ہو۔ یہ انوکھے نغمے تمہاری انگلیوں سے کیوں جاگتے ہیں واہ۔۔۔۔۔ کیسی خوبصورت دھن

تھی۔ دل مچل کر رہ گیا۔"

"یہ میرے دیس کا نغمہ ہے۔ یہ میرے وطن کی سوندھی مٹی کی خوشبو سے بسا ہوا ہے۔ اس میں، میرے دیس کے ذرے ذرے کی آواز رچی ہوئی ہے یہ ----- یہ ----- میں خاموش ہو گیا۔ "تمہیں اپنے وطن سے بہت پیار ہے نواز...... تمہیں اپنے دیس سے بے پناہ محبت ہے۔؟" شیفو نے کہا اور میرے دل پر گھونسہ سا لگا! میرے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔ کیا میں وطن پرست ہوں۔ کیا وطن پرست ایسے ہی ہوتے ہیں۔؟ میرے ضمیر نے سر اٹھا کر پوچھا۔ اور میرا سکون برباد ہو گیا۔

"آہ ----- یہ کیا سوال کر دیا شیفو ----- آہ ----- یہ کیا پوچھ لیا -----" میں نے درد سے کراہتے ہوئے کہا اور شیفو چونک کر میری شکل دیکھنے لگی۔

"ارے ----- ارے کیا ہو گیا مسٹر نواز ----- کیا آپ کی طبیعت خراب ہے -----؟ مسٹر نواز -----!"

"شراب ----- مجھے شراب دو شیفو ----- مجھے شراب دو ----- جلدی۔" میں نے کہا اور شیفو الماری کی طرف دوڑ گئی۔ اس نے جلدی سے شراب کی بوتل اور گلاس نکالا اور پھر گلاس میں مجھے شراب انڈیل کر دی۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں شراب حلق سے نیچے اتار لی اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے دوبارہ اس میں شراب انڈیل دی تھی۔ تین چار پیگ پینے کے بعد میرے دل کی جلن کم ہوئی۔ شیفو شدید حیران تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس نے ایسی کونسی بات کہہ دی ہے، جس نے میرا یہ حال کر دیا۔!

بہرحال ----- میں کافی حد تک پرسکون ہو گیا تھا۔ میں نے ضمیر کی چیخوں کو شراب میں ڈبو دیا تھا۔ اور اب میں بہک رہا تھا۔ اب میرے منہ سے جو الفاظ نکل رہے تھے ان کا مجھے خود احساس نہیں تھا۔ "ہاں شیفو!" میں اس سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے اپنے دیس سے بے پناہ محبت ہے۔ میں اس کا عاشق ہوں۔ میں اپنا خون اس کی مٹی میں جذب کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن ----- میں اس سے روٹھ گیا ہوں۔ اس نے، اپنی آغوش میرے لئے تنگ کر دی تھی۔ اس نے مجھ سے سوتیلے بیٹے کا سا سلوک کیا تھا۔ تب میں اس سے ناراض ہو کر سمندر کی آغوش میں سونے چل پڑا۔ لیکن سمندر کس کا ہوتا ہے۔ ایک بحرِ بیکراں، جو ہرجائی ہے۔ جو سب کا ہے۔ اس نے بھی مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں ایک یتیم و یسیر بچے کی طرح سرگرداں تھا کہ کچھ لوگوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اس سے باہر جانے والے راستے پر ڈال دیا۔ یہ راستہ اچھا نہیں تھا۔ لیکن ----- میں اپنی ماں سے روٹھا ہوا بچہ ----- میں آگے بڑھتا رہا۔ بڑھتا رہا ----- اور پھر میں راستہ بھول گیا۔ میں اپنے وطن کا راستہ بھول گیا۔ آج بھی اس کی یاد مجھے تڑپاتی ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے شیفو۔ میں اسے بے پناہ چاہتا ہوں۔ لیکن میں اس کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔ میں اس سے روٹھ کر آیا تھا۔ لیکن اب میرا چہرہ اس قدر داغدار ہے کہ میرا وطن مجھے دیکھ کر خوف سے، غم سے چیخ پڑے گا۔ وہ میری صورت پر نفرت سے تھوک دے گا۔ وہ میرا داغدار چہرہ دیکھ کر غم سے نڈھال ہو جائے گا۔ میں اب وہاں کبھی نہیں جاؤں گا شیفو ----- میں اب وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔" میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور شیفو بے قرار ہو گئی۔ "نواز ----- نواز ----- میں شرمندہ ہوں نواز -----! میں -----

میں نے نادانستگی میں تم سے یہ سوال کر دیا تھا۔"

"ماں سے کسے محبت نہیں ہوتی شیفو ----- ماں کو کون نہیں چاہتا، میرا وطن بھی میری ماں ہے۔ میں اسے بے پناہ چاہتا ہوں۔ میں ماں کی آغوش میں سونا چاہتا ہوں۔ لیکن ماں اب مجھے قبول نہیں کرے گی۔ اس کا بیٹا روسیاہ ہے۔ بدکار ہے۔ میری ماں نے مجھ سے بد سلوکی کی تھی شیفو ----- لیکن وہ میری ماں ہے۔!"

"نواز ----- چپ ہو جاؤ۔ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ نواز ----- میں شرمندہ ہوں۔"

"مجھے سکون چاہئے۔ شیفو ----- مجھے سکون دو ----- میں جل رہا ہوں میرے دل کی آگ بجھا دو۔ مجھے اور شراب دو۔!" اور شیفو نے میرے لئے اور پیگ بنائے۔ تب میں ماں کو بھول گیا۔ مجھے صرف شیفو یاد رہ گئی۔ لباس سے بے نیاز شیفو۔ جو میرے لئے خانم کی ناراضگی مول لینے کو تیار ہو گئی۔ اس کے تپتے ہوئے سانس میرے سانسوں سے الجھ گئے۔ اس کا مرمریں جسم میرے جسم سے الجھ گیا۔ اس کے حسین جسم کی جاذبیت نے میرے دل کی آگ سرد کر دی۔! وہ اپنے تمام فرائض پورے کر رہی تھی۔ میں تو شرابی تھا، شراب کے نشے میں چور تھا۔ پھر شاید میرا لباس بھی اس نے میرے جسم پر سجایا۔ میرا سر تکئے پر رکھا اور جب میں سو گیا تو ----- خاموشی سے ----- بے آواز دروازہ بند کر کے چلی گئی۔!

پھر جب میری آنکھ کھلی تو شام کے چھ بجے تھے۔ طبیعت بے حد بھاری تھی۔ ذہن پر بوجھ تھا۔ میں بستر پر پڑا انگڑائیاں لیتا رہا۔ اور پھر دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی تو میں چونک پڑا۔ دروازے سے تھوڑی سی گردن نکال کر سمابہ نے اندر جھانکا تھا۔ شاید وہ دیکھ رہی تھی کہ میں جاگ گیا ہوں یا نہیں۔"!

"سمابہ -----!" میں نے اسے آواز دی۔ اور وہ اندر آ گئی۔

"جاگ گئے مسٹر نواز۔؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ----- کیا وقت ہوا ہے۔؟" میں نے کہا۔

"چھ بجے گئے۔!"

"اوہ ----- بڑی دیر سے سو رہا ہوں۔ سوری ----- شام کی چائے کا وقت بھی گزر گیا۔"

میں جلدی سے اٹھ گیا۔

"کوئی حرج نہیں ہے۔ شام کی چائے ذرا دیر سے پی لی جائے گی۔ شیفو نے بتایا کہ تمہاری طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔!

"کوئی خاص بات نہیں تھی، بس یونہی۔" میں نے کہا۔ اور پھر میں اس کی اجازت سے باتھ روم میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم چائے کی میز پر تھے۔ شیفو حسب معمول خاموشی سے سروس کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس دوران کوئی خاص بات ہی نہ ہوئی ہو۔ میں نے بھی احتیاط برتی چائے کے دوران سمابہ نے کہا۔

"البتہ ----- آج سیر کا وقت نکل گیا۔ میرا ارادہ آج طویل سفر کا تھا۔ ہم کیپسیں چلتے جو یہاں سے سوا سو میل دور ہے۔ البرز کی خوفناک گھاٹیاں اور خطرناک موڑ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ راستے کے بلند مینار ہیبتناک قلعے بے حد دلکش ہیں اور ایران کی تاریخ میں نمایاں حیثیت

رکھتے ہیں۔"

"سوا سو میل کا سفر------ میرا خیال ہے وہاں جانا اور وہاں سے واپسی خاصی دشوار ہوگی۔ بہرحال' پھر سہی۔!" میں نے کہا۔

"پھر------؟" سابہ نے عجیب سی اداسی سے کہا۔

"کیوں------؟" میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"میرا خیال ہے تم صرف آج رات کے مہمان ہو۔ غلام سیٹھ کل آرہا ہے۔"

"اوہ------!" میں نے ہونٹ سکوڑ لیے۔ پھر گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ "آنے دو۔ پھر کبھی سہی۔ ممکن ہے زندگی کی دوڑ میں پھر کبھی ساتھ ہو جائے۔ کیا یہ بات یمانی نے بتائی ہے۔؟"

"ہاں------ غلام سیٹھ نے تمہارے لئے کچھ ہدایات بھیجی ہیں۔"

"خوب------! کیا؟"

"یہ نہیں معلوم ہو سکا۔ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ تمہیں اس سے آگاہ کر دیا جائے کہ------ کل تمہیں ایران چھوڑ دینا ہے۔"

"چھوڑ دیں گے------ کل بہت دور ہے۔" میں نے سابہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا اور وہ مسکرانے لگی۔

"حضور------ ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں؟"

"بجنے دو سابہ------ اپنی گھڑی اتار کر پھینک دو۔ مجھے ان گھڑیوں سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔"

"ایک بات کہوں نواز------؟" سابہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"کہو جان من۔"

"تم بے حد حسین ہو۔ بے پناہ پرکشش مرد۔ لیکن اگر تم نے شراب کا استعمال اسی رفتار سے جاری رکھا۔ تو------ تم اپنی جوانی کھو بیٹھو گے اس قدر زیادتی نقصان دہ ہے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ گے نواز۔ لیکن' ہم بہت عرصے تک تڑپتے رہیں گے!" سابہ نے اپنا رخسار میرے چہرے سے ملا کر کہا۔ شیفو کی موجودگی کو اس نے بھی نظرانداز کر دیا تھا۔ اور میں نے بھی۔!

"شراب------ اس تڑپ کو سرد کر دیتی ہے جان من۔" میں نے اس کے ہونٹ چومتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی------ وعدہ کرو' احتیاط رکھو گے۔؟"

"چلو وعدہ------!" میں نے کہا اور وہ مسکرانے لگی! کوٹھی کے لان میں ٹہلتے ہوئے ہم نے بہت سی باتیں کر ڈالیں۔ وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ شیفو شاید کھانے کے انتظام میں مصروف تھی اس لئے وہ نظر نہیں آئی۔ سابہ نے بھی اس کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ بہرحال پھر شیفو نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی اور ہم کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔ بڑے پر تکلف کھانے تھے۔ مختلف ایرانی اور غیر ملکی ڈشز سے میز بھری ہوئی تھی۔

میں نے کچھ اپنی اور کچھ سابہ کی پسند کی چیزیں کھائیں۔ کھانے کے بعد ہم کوٹھی کے عقبی حصے میں خوبصورت گھاس اور پھولوں سے لدے ہوئے لان میں چہل قدمی کرتے رہے۔ دنیا جہان کی

باتیں ہوتی رہیں۔ ان باتوں کے درمیان میں نے ایک بات محسوس کی۔ سابہ جس قدر حسین تھی اس سے کہیں زیادہ چالاک بھی تھی۔ کوئی بھی چبھتا ہوا سوال اگر میں کر لیتا تو وہ اس سے بڑی خوبصورتی سے پہلو بچا جاتی۔ اس کی عمر کا صحیح تعین میں نہیں کر سکا تھا لیکن جس قدر وہ چالاک تھی اس سے اس کے تجربے کا اندازہ ہوتا تھا! پھر شیفو نظر آئی۔ اور ہمارے قریب پہنچ گئی۔

"دس بج چکے ہیں خانم------" اس نے کہا۔

"اوہ------ ہاں------ وقت کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔ آؤ نواز------ اس آخری رات کو جاوداں بنالیں۔" سابہ نے ایک انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ اور اس رات کو جاوداں بنانے چل پڑا۔ خود میری زندگی میں تو ایسی جاوداں راتیں بے شمار آئی تھیں۔ ابتداء میں' میں نے ہر رات کو جاوداں سمجھا تھا۔ لیکن وہ میری بھول تھی۔ میں نے زندگی کو محدود سمجھ لیا تھا۔ میری زندگی کی جاوداں رات نہ جانے کونسی ہوگی۔! ہوگی بھی یا نہیں ہوگی۔!

اور------ یہ رات بھی پہلی رات سے مختلف نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ آج سابہ نے اور کچھ اہتمام کئے تھے۔ آج شیفو کو بھی کھل کھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔ آج سابہ نے اسے اپنے برابر کی حیثیت دے دی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ شیفو اس سے بھی بلند مقام حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اس رات کی دلکشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عورت کے کچھ اور روپ سامنے آئے۔ جنس کی کچھ اور غلاظتیں میرے سامنے ابھریں۔ لیکن------ دونوں عورتیں خوش تھیں۔ شیفو بھی خوش تھی۔ اور پھر صبح ہو گئی۔ سنجیدگی کا لحاف اوڑھے ہوئے۔ سنجیدگی یوں کہ یہاں میرا آخری دن تھا اور اس بات پر دونوں لڑکیاں افسردہ تھیں۔!

بہرحال میں نے ذہن کو پراگندہ نہیں کیا۔ تقریباً دس بجے یمانی آ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا۔ "کہئے مسٹر نواز ایران پسند آیا۔؟" اس نے پوچھا۔

"بے حد۔" میں نے سابہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"غلام سیٹھ رات کو آ گیا ہے۔"

"اوہ------ خیریت------؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں------ بالکل خیریت------ بس آپ سے ملاقات کرنے آیا ہے۔"

"کہاں ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"وہیں چل رہے ہیں۔ تیار ہو جائیے۔"

"میں تیار ہوں۔"

"تب پھر آئیے۔!" یمانی نے کہا اور میں نے سابہ کی طرف دیکھا۔

"مجھے بھی چلنا ہے۔؟" سابہ نے پوچھا۔

"غلام سیٹھ نے صرف انہیں طلب کیا ہے۔!" یمانی نے معذرت کے انداز میں جواب دیا۔

"یہ واپس تو یہاں آئیں گے۔؟" سابہ نے کسی قدر بے قراری سے پوچھا۔

"یقیناً!" یمانی معنی خیز انداز سے مسکراتے ہوئے بولا------ اور پھر کار میں میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "اس دلکش قیامت کو آپ نے بہت متاثر کیا ہے مسٹر نواز------ شاید زندگی میں پہلی بار یہ کسی کے لئے بے قرار ہوئی ہے۔" میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

تو اس نے دوبارہ پوچھا۔ "آپ کا وقت تو مناسب گزرا۔؟"

"ہاں-----!" میں نے مختصراً کہا۔ اور یمانی خاموش ہو گیا۔ کار راستہ طے کرتی رہی۔ سفر کی طوالت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ لیکن جب خاموشی طویل ہو گئی تو میں نے یمانی سے پوچھا۔

"ٹھاکر اور اس کے ساتھیوں کا کیا ہوا۔؟"

"صیغہ راز میں ہے۔ اخبارات بھی اب ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں دے رہے۔ ممکن ہے انڈیا گورنمنٹ سے رابطہ قائم کیا گیا ہو۔؟ ممکن ہے سب کو خاموشی سے گولی مار دی گئی ہو۔ ایرانی قانون میں اسمگلروں کو اور خاص طور سے منشیات کے اسمگلروں کے لئے کوئی لچک نہیں ہے۔" یمانی نے جواب دیا۔

"تم لوگ اپنی سرگرمیوں پر خوفزدہ نہیں ہو۔؟"

"خطرہ------ خطرہ تو زندگی کا ایک جزو بن چکا ہے مسٹر نواز------ کوئی بھی کام کرنے نکل پڑو۔ خواہ وہ نیکی اور شرافت سے بھرپور ہو۔ یا بدی اور بدکاری سے۔ ہر کام میں خطرہ موجود ہے۔ جدید دور نے زندگی بڑی بے معنی سی شے بنا کر رکھ دی ہے۔ اسے گزارنے کا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خطرات سے دوزرہ کر' شرافت کے سہارے زندگی گزارنے کی کوشش کریں اور پریشانیوں سے دوچار رہیں۔ یا پھر------ خود کو خطرات میں جھونک دیں۔ اور جب تک کی سانسیں مقدر ہیں' عیش و آرام سے گزاریں۔!" یمانی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ میں خاموش ہو گیا۔ یمانی کا فلسفہ بھی عجیب تھا۔ پھر میں ٹھاکر اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں سوچنے لگا! اور یمانی کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ "ممکن ہے خاموشی سے سب کو گولی ماردی گئی ہو۔!"

کوشلیا کو بھی------! حسین اور چمکدار جسم والی کوشلیا' شرمائی شرمائی سی------ مسکراتی ہوئی میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ خود سپردگی کا انداز لئے۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ جسے میں نے سختی سے دبا دیا' لیکن کوشلیا کی تصویر میری نگاہوں سے اوجھل نہ ہوئی۔ اچانک اس کے چہرے پر کرب کے آثار ابھرے اور اس کے دائیں پہلو سے خون کے فوارے ابلنے لگے! اور اس کے دلکش ہونٹ کرب کے انداز میں ہلے۔ اس کی آنکھیں میرا سہارا تلاش کرنے لگیں۔ اور پھر------ وہ چکراتی ہوئی گر پڑی اس کا جسم کرب کے انداز میں اینٹھ رہا تھا۔!

میرے پورے جسم نے پسینہ اگل دیا۔ آنکھوں میں تاریکی چھا گئی دماغ چکرا گیا۔ سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن یمانی میری کیفیت سے بے خبر کار چلاتا رہا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے سر کار کی سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا اور اپنی حالت درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر میرے کانوں میں یمانی کی آواز ابھری۔!

"مسٹر نواز------! سو گئے۔؟"

"اور میں چونک پڑا۔ میں نے اردگرد کے ماحول کو دیکھا------ کار رک چکی تھی۔ شاید کسی عمارت میں۔!

"ظاہر ہے۔ ان دو دنوں میں آپ کو نیند کہاں نصیب ہوئی ہو گی۔" یمانی مسکراتا ہوا معنی خیز انداز میں بولا۔ "اور پھر------ سمابہ کے لئے تو آپ حلوہ تر تھے۔ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ مردخور ہے' مردخور------ آیئے۔!" اس نے نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا۔

میں نیچے اتر آیا------ یمانی کے الفاظ مجھے کسی قسم کے خطرے کا پتہ دے رہے تھے۔ سمابہ کے حسین جسم کی تہہ میں مجھے بے شمار کیڑے کلبلاتے نظر آئے۔ یمانی کے الفاظ------ "مردخور ہے۔ مردخور------" نے ذہن سے بہت سے بھوت اتار دیئے تھے۔ یہ سب ہی یکساں ہوتی ہیں۔ ان کے لئے تڑپنا حماقت ہے۔ سو فیصدی حماقت۔!

کار سے اتر کر ہم برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔ اور برآمدے میں ہی غلام سیٹھ نظر آیا۔ میں نے خود کو پوری طرح سنبھال لیا اور ہوشیار ہو گیا میں اس پر اسرار شخص کی حیثیت سمجھ چکا تھا۔ درحقیقت یہ بے حد پر اسرار تھا اور اس سے محتاط رہنا ضروری تھا۔!

"ہیلو نواز------" غلام سیٹھ چند قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ اور پھر اس نے گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ "کیسے ہو------؟ کیا ہو رہا ہے۔؟" اس نے مجھے اندر لے جاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوں' غلام سیٹھ۔" میں نے جواب دیا۔

"ایران سے دل بھر گیا۔ یا ابھی کچھ اور قیام کا ارادہ ہے۔ ایک کمرے میں پہنچ کر' مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے' خود میرے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

"میرے لئے ہر جگہ ٹھیک ہے غلام سیٹھ------ جو بھی ادارے کے مفاد میں ہو۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ حقیقت ہے نواز------ اتفاقیہ طور پر ہمیں ایک ہیرا دستیاب ہو گیا ہے' ادارہ تمہاری شمولیت پر ناز کرتا ہے۔ تم ہمارے لئے بے حد اہم شخصیت بن چکے ہو' بہرحال ہمیں بھی تمہاری ہر سہولت کا خیال ہے۔ اگر ابھی ایران میں قیام کا ارادہ ہو تو وہ پروگرام کچھ دنوں کیلئے ملتوی کیا جا سکتا ہے' جو بنایا گیا ہے۔"

"نہیں------ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لئے جو پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ میں اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"ہوں------!" غلام سیٹھ کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ادارے نے تمہاری بے پناہ صلاحیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے تمہاری ڈیوٹی بدل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ کام جو اب تک تم کر رہے تھے' کسی اور کے سپرد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے تم سے کم صلاحیتوں والے آدمی سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔ انٹرنیشنل مارکیٹ کے لئے ہمیں کسی تم جیسے نوجوان کی ضرورت تھی۔ تمہاری کچھ ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی نواز------ لیکن ادارے کی نگاہ میں تم سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں۔"

"مجھے کیا کرنا ہو گا۔؟"

"سپلائی------! تم حسب معمول اسی پٹی پر سفر کرو گے جو مقرر کی گئی تھی۔ لیکن اب تمہارے ذمہ قیمتی منشیات کی سپلائی ہو گی۔ کیا تم یہ کام مشکل پاتے ہو۔؟" غلام سیٹھ نے پوچھا۔ اور میں سوچ میں گم ہو گیا۔ بلاشبہ یہ کام مشکل تھا۔ پہلے صرف مجھے ان علاقوں کا سروے کرنا ہوتا تھا۔ پولیس اور ایکسائز والوں سے براہ راست میری مڈھ بھیڑ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن سپلائی کے سلسلے میں مجھے کافی محنت کرنا ہو گی۔ اس کے لئے مجھے وحشیانہ انداز میں کام کرنا ہو گا۔!

"لیکن------ اگر میں اس کام کے لئے منع کر دوں۔ تو------؟ کیا غلام سیٹھ کا رویہ میرے

ساتھ بہتر رہ سکے گا۔؟ کیا وہ لوگ میرے دشمن نہیں ہو جائیں گے۔ اونہہ ------ تمام خطرات کی انتہا موت پر ہوتی ہے اور میری زندگی کونسی قیمتی ہے۔ میں کس کے لئے زندہ ہوں۔ اور یہ فیصلہ بھی مشکل ہے کہ میں زندہ ہوں یا مرگیا۔ یہ ایک بوجھ' جسے زندگی کہتے ہیں۔ زبردستی میرے شانوں پر لدا ہوا ہے' کسی وقت بھی اتر جائے' مجھے کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے بے خوفی سے کہا۔

"میں تیار ہوں غلام سیٹھ۔!"

"خوب سوچ سمجھ لیا ہے۔؟"

"سوچنا کیا ------ میں وہ ہر کام کرنے کے لئے تیار ہوں جو ادارے کے مفاد میں ہو۔"

"ویری گڈ ------ اور نواز ------ اس کام کی مدت صرف پانچ سال ہو گی۔ تمہارے تمام اخراجات بہرصورت ادارے کے ذمے ہوں گے' شہنشاہوں کی طرح زندگی بسر کرو۔ اس کے علاوہ ادارے کی طرف سے تمہاری تنخواہ بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ تیس ہزار روپے ماہانہ ------ اور پھر مال کا کمیشن ------ پانچ فیصد' اور یہ سمجھ لو کہ ایک دفعہ کی نقل و حرکت کم از کم پندرہ لاکھ کی ہوتی ہے۔ پانچ فیصد کمیشن سے بہت بڑی رقم بنتی ہے۔ تمہارا کمیشن' اور تنخواہ کی رقم' ہر ماہ پوری باقاعدگی کے ساتھ سوئزرلینڈ کے کسی بینک میں تمہارا اکاؤنٹ کھول کر جمع کی جاتی رہے گی۔ تاکہ پانچ سال کے بعد جب تم ریٹائر ہو تو تمہیں ایک بہت بڑی رقم بقیہ زندگی گزارنے کے لئے مل جائے' اس کے علاوہ' تم جس ملک میں پسند کرو گے' وہاں کی نیشنلٹی دلانا ادارے کی ذمہ داری ہو گی۔"

"ٹھیک ہے غلام سیٹھ ------ جیسا پسند کرو کر دینا۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"مال نکالنے کیلئے پلاننگ تمہیں خود کرنا ہو گی۔ اگر کبھی گرفتار ہو جاؤ گے تو پوری کوشش سے تمہیں رہا کرا لیا جائے گا۔ جو مال ضائع ہو گا اس کی کوئی ذمہ داری تمہارے اوپر نہ ہو گی۔ ہاں اس کا کمیشن تمہیں نہ مل سکے گا۔"

"میں کہہ چکا ہوں۔ مجھے سب کچھ منظور ہے۔"

"اس کے لئے کسی قسم کی تربیت محسوس کرتے ہو۔؟"

"نہیں ------!"

"تب پھر ------ تیاریاں کر لو ------ آج سے تین دن کے اندر تمہیں پانچ سو پونڈ کوکین لے کر ترکی روانہ ہونا ہے۔ آج ادارے کا مستقل نشان تمہارے سپرد کر دیا جائے گا۔! اور کچھ۔؟"

"نہیں ------!" میں نے کہا اور غلام سیٹھ نے ایک دیوار میں لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ یمانی اندر داخل ہو گیا۔

"مسٹر یمانی ------ ادارے کا مستقل نشان مسٹر نواز کو دے دیا جائے۔!"

"بہت بہتر ------!" یمانی نے جواب دیا اور میں اٹھ گیا۔

"میں ابھی یہیں ہوں۔ تمام کاغذات تیار کر لیے جائیں گے تب میں یہاں سے جاؤں گا۔ اس درمیان تم جب چاہو یمانی کی معرفت مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ اور ہاں ------ آج سے تم ادارے کے خاص لوگوں میں کہلاؤ گے۔ اور اس کی سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہ رکھی جائیں گی۔!"

"شکریہ ------!" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور یمانی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

"مبارک ہو مسٹر نواز۔ جتنے معمولی عرصے میں آپ نے ترقی کے مدارج طے کئے ہیں' ادارے

کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یمانی نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ یمانی مجھے لے کر ایک کمرے میں آیا۔ پھر اس نے دیوار میں پوشیدہ ایک الماری کھولی اور اس میں سے کچھ نکالنے لگا۔

ایک لمبا تار تھا جس کے آخری سرے پر کوئی سیاہ سی چیز تھی اس نے تار کا پلگ ایک دیوار میں لگے ہوئے ساکٹ میں لگا دیا۔ اور وہ سیاہ سی شے پکڑے ہوئے میرے نزدیک آ گیا۔ تب میں نے اسے غور سے دیکھا کسی دھات کی بنی ہوئی ایک گول مہر تھی۔ جس میں کچھ عجیب سے نشان بنے ہوئے تھے۔ میں اس کا مقصد سمجھ گیا۔ اور میں نے کوٹ اتار دیا۔

"کہاں لگائی جائے گی مہر ------؟" میں نے پوچھا۔

"دائیں ہاتھ کی کلائی پر۔!" یمانی نے جواب دیا۔

"لیکن' کیا مہر مخدوش نہیں ہو گی۔؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں ------ اس کا بندوبست بھی ہے۔!" یمانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی۔ مہر کے نشانات سرخ ہو کر چمکنے لگے تھے۔ یمانی اسے ایک اسٹول پر رکھ دیا اور پھر جیب سے ایک شیشی نکال کر اس کا کارک کھول دیا۔ شیشی کے ساتھ روئی بھی تھی۔ تب اس نے مہر اسٹول سے اٹھائی اور میں نے کلائی کھول کر سامنے کر دی۔

دوسرے لمحے میرے جسم میں درد کی لہریں اتر رہی تھیں۔ لیکن ------ میں نے تو بڑے بڑے درد سہے تھے۔ میرے چہرے سے کوئی تاثر نہ ظاہر ہو سکا۔ یمانی نے مہر لگائی اور روئی اور شیشی اٹھائی اور روئی کو شیشی کے سیال میں بھگو کر سیال جلے ہوئے نشان پر لگا دیا۔ حیرت انگیز چیز تھی۔ ایک دم سوزش کم ہو گئی۔ پھر یمانی نے ایک ٹین کے بکس سے ایک باریک سی جھلی نکالی اور اسے کھول کر میری کلائی پر چپکا دیا۔ نشان چھپ گیا تھا۔ جھلی جلد کی شکل کی تھی۔ اس لئے احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

"کسی خاص ضرورت پر اسے اٹھانا اور پھر چپکا دینا۔" یمانی نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ "بس کام ختم۔!" اس نے کہا۔ اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ "آرام کریں گے۔؟"

"کیا یہیں رہنا ہو گا۔؟"

"ہاں ------ لیکن رات اپنی پسند کے مطابق گزار سکیں گے۔ تکلف بر طرف' جس چیز کی ضرورت ہو' مہیا کر دی جائے گی۔!"

"یہیں ------ اسی عمارت میں۔؟" میں نے پوچھا۔

"میں رات تنہا نہیں گزارنا چاہتا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"تنہا نہیں گزرے گی۔" یمانی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن دن تو تنہا ہی گزرے گا۔ آخر مال لے جانے کی پلاننگ بھی تو کرنا ہو گی۔"

"ہوں ------!" میں نے گردن ہلا دی اور یمانی میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ پھر اس نے عمارت میں مجھے میرا کمرہ دکھایا۔ ضروریات زندگی کا یہ سامان موجود تھا۔ ایک طرف رائٹنگ ٹیبل بھی پڑی ہوئی تھی۔ اس پر کھٹمنڈو سے امریکہ تک کا نقشہ بڑی تفصیل سے موجود تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر بولا۔

"میرا سامان------ لباس وغیرہ------؟"
"ابھی آتا ہوگا۔"
"کیا سلمیٰ سے اب ملاقات نہیں ہوگی۔؟"
"مناسب نہیں ہوگا مسٹر نواز------ ویسے جو حکم۔!"
"نہیں------ مناسب نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ اور یمانی باہر نکل گیا۔ ابھی میرا سامان نہیں آیا تھا اس لئے لباس تبدیل کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں نے جوتے اتارے 'کوٹ!' ٹائی کھول کر ایک طرف ڈال دی۔ قمیض پتلون سے باہر نکال لی اور پھر ایک آرام کرسی میں دراز ہو گیا۔ ہاتھ میں سوزش نام کو بھی نہیں رہی تھی۔ کرسی میں دراز ہو کر میں اپنے نئے کام کے بارے میں سوچنے لگا! کیا میں ایسی صلاحیتیں رکھتا ہوں' جن کا وہ تعین کر چکے ہیں؟ آخر انہوں نے میرے اندر کونسی خوبی پائی ہے۔؟ میرے اپنے اندازے کے مطابق تو میں نے ابھی تک کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ ٹھاکر والا کام بھی بس ہو گیا تو شلیا کی سادگی اس کے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ بہرحال اب غلام سیٹھ نے میرے اوپر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی تھی۔ میں اس ذمہ داری کو کس طرح سرانجام دوں گا۔ جبکہ میں نے اس سے وعدہ بھی کر لیا ہے۔ میں نے اپنے ذہن کو یکسو کیا۔ اور سوچتا رہا۔ اسی دوران میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اور اس نئے خیال پر میں کافی دیر تک غور کرتا رہا۔ پھر میں اٹھ کر لکھنے کی میز پر جا بیٹھا۔ میں نے اس خیال پر غور کیا۔ اور پھر ایک کاغذ پر اس کے ضروری پوائنٹس لکھنے لگا۔!

جب میں نے اپنے لکھے ہوئے پوائنٹس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ان میں کوئی جھول نہیں ہے۔ اور میں چونک پڑا۔ اس کا مقصد ہے کہ میں ذہین ہوں۔! میں نے سوچا اور پھر خود ہنس پڑا۔ خود اپنے بارے میں فیصلے کر رہا ہوں۔ ذرا احمقانہ بات ہے۔ لیکن------ یہ حقیقت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ میں آج تک خود میں الجھا رہا ہوں۔ پیش آنے والے واقعات مجھے الجھاتے رہے ہیں اور میں ان میں پھنس کر اپنی شخصیت ہی کھو بیٹھا ہوں۔!

"نواز------!" میرے اندر سے ایک آواز ابھری۔ "تو اگر اپنی پچھلی زندگی میں لوٹنا بھی چاہے تو اب یہ ممکن نہیں ہے۔ سڑکوں پر بھیک مانگ کر بھی اپنے ضمیر کے وہ داغ صاف نہیں کر سکتا جو لگ چکے ہیں۔ نہ تیری پچھلی زندگی اپنی ہے نہ موجودہ------ لیکن موجودہ زندگی کا سفر تیرے سامنے ہے۔ ایک راستہ اختیار کر لے اور اس پر پامردی سے بڑھتا رہ۔ ان مشکلات کو فنا کر دے جو خود تیرے ذہن کی پیدا کردہ ہیں۔ تو جانتا ہے۔ تیری الجھن کی وجہ کیا ہے۔؟"
"نہیں------" میں نے جواب دیا۔
"عورت' صرف عورت------ تیرے سوچنے کے انداز میں عورت شامل رہی ہے۔ عورت صرف ایک ضرورت ہے۔ اسے ذہن پر مسلط کر لینا حماقت ہے اپنی ضرورت پوری کر------ اور سب کچھ بھول جا۔ صرف یہ یاد رکھ کہ تو کیا ہے۔ اور اپنا کام انجام دے۔ بلاشبہ تو ذہین ہے۔"
اور میں نے دل کی آواز کو غور سے سنا۔ اپنا تجزیہ کیا۔ یہ حقیقت تھی کہ آج تک میں عورت کے ہاتھوں کھیلتا اور اپنے ذہن کو پراگندہ کرتا رہا تھا۔ زندگی کے ابتدائی دور سے نکل کر جس دور میں' میں آ گیا تھا' اس میں کوئی کاروباری الجھن...... نہیں تھی۔ اس راہ پر چل پڑنے کے بعد میں کسی چیز

سے خوفزدہ نہیں تھا۔ نہ ہی کسی مسئلے پر مجھے کوئی الجھن ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بعض دن میرے اوپر بہت کٹھن گزرے تھے۔ آخر کیوں۔؟ صرف عورت کی وجہ سے نا۔؟ بے شمار عورتیں میرے لئے مسئلہ بنی تھیں۔ کرشی' میگاں' درخشانہ' کوشلیا وغیرہ۔ انہوں نے میرے ذہن کو ہلا کر رکھ دیا تھا' حالانکہ معمولی سی بات تھی۔ اگر میں انہیں صرف عورت سمجھتا۔ ضرورت کی ایک چیز------ تو میرا ذہن اس افراتفری کا شکار نہ ہوتا۔ لیکن آئندہ------ آئندہ مجھے اسی انداز میں اپنا ذہن ترتیب دینا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔
چنانچہ------ اس فیصلے کے بعد میں نے خود کو ہلکا محسوس کیا۔ دراصل میں خود کو پورے طور سے پہچانا نہیں تھا۔ مجھے خود بھی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا احساس نہیں تھا۔ غلام سیٹھ مجھ سے زیادہ تجربے کار تھا۔ اس نے میرے اندر چھپے ہوئے چالاک آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ اس لئے وہ میرے اوپر زیادہ سے زیادہ مہربان ہو رہا تھا۔ بہرحال------ میں ان خیالات کو جھٹک کر پھر اپنے پروگرام کے بارے میں سوچنے لگا! بڑا کامیاب پروگرام تھا۔ بشرطیکہ میری مرضی کے مطابق ہی کامیابی حاصل ہو سکے۔!
تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم ٹائپ کا آدمی میرا سامان لے آیا۔ اور میں جلدی سے اٹھ گیا۔ میں نے اپنا سلیپنگ سوٹ نکالا۔ پتلون اور قمیض میں خاصی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال لباس تبدیل کرنے کے بعد میں آرام سے لیٹ گیا۔ اور پھر میری آنکھوں میں نیند گھس آئی۔! لنچ کے وقت ملازم نے جگایا۔ اور منہ ہاتھ دھو کر میں نے کھانا کھایا۔ کھانے پر تنہا تھا لیکن ملازم میری خوب آؤ بھگت کر رہے تھے۔ نیند پوری ہو چکی تھی۔ اب سونے کو دل نہیں چاہا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں۔ کہ دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور یمانی نے اندر جھانکا۔
"ہیلو۔! مسٹر نواز۔!"
"ہیلو یمانی!" میں کھڑا ہو گیا۔
"آیئے غلام سیٹھ انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے کہا۔
"اوہ------ کہاں------؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ اور یمانی مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔ غلام سیٹھ ابھی ابھی آیا تھا۔ وہ ایک کمرے میں آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پاؤں سکوڑ لیے اور پھر اپنا بریف کیس اٹھا کر ایک فائل نکال لی۔ فائل میں کچھ کاغذات تھے۔ اس نے چند کاغذات نکالے اور پھر میرے سامنے پھیلا دیئے۔
"میں نے پوری کارروائی مکمل کر لی ہے۔ شام کو پانچ بجے واپس چلا جاؤں گا۔ ان کاغذات پر دستخط کر دو۔ تمہاری تنخواہ ہر ماہ سوئزرلینڈ میں جمع ہو جائے گی اور تمہارا کمیشن بھی------ ان کی رسیدیں تم جس وقت چاہو طلب کر سکتے ہو۔"
"آپ شرمندہ کر رہے ہیں غلام سیٹھ۔!" میں نے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں------ اس میں برائی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم ہمارے لئے خلوص سے کام کر رہے ہو۔ ہم بھی تمہارے لئے مخلص ہیں۔ کوئی بال تمہارے ذہن میں نہیں رہنا چاہیئے۔"
"میرے ذہن میں کوئی بال نہیں ہے غلام سیٹھ۔ تنہا آدمی ہوں' جو کچھ مل رہا ہے وہی کافی ہے۔"

"تمہاری طبیعت شاہانہ ہے نواز ------ بہرحال ------ جب تم ریٹائرڈ ہو گے تو تمہیں دولت کی ضرورت پیش آئے گی اور پھر جب سب کو معاوضہ ملتا ہے تو پھر تم ہی کیوں رہ جاؤ۔"

"شکریہ غلام سیٹھ ------ جو آپ کا دل چاہے کریں۔ میں اپنے کام کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"مجھے یقین ہے۔ اچھا ------ اب میں زیادہ نہیں رکوں گا۔ یمانی تمہاری ہر طرح مدد کریں گے۔!" غلام سیٹھ اٹھ گیا۔ اس نے گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور یمانی کے ساتھ باہر جانے لگا۔

"میں نو بجے تک واپس آجاؤں گا۔ آپ میرا انتظار کریں۔" یمانی نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ وہ دونوں باہر نکل گئے تھے۔ میں پھر تنہا رہ گیا تھا۔ بہرحال اب مجھے تنہائی کا احساس زیادہ نہیں تھا۔ میں اپنے کام کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے کمرے میں جاکر نیا سوٹ زیب تن کیا اور پھر باہر نکل آیا۔

"گاڑی ہے۔؟" میں نے ایک ملازم سے پوچھا۔

"جی ہاں جناب!" ملازم نے ادب سے کہا اور جلدی سے ایک کمرے میں جاکر کار کی چابی نکال لایا۔ اس نے چابی میرے حوالے کر دی اور میں باہر نکل آیا۔ باہر ایک چھوٹی سی اسپورٹ کھڑی تھی۔ میں نے اسپورٹ اسٹارٹ کی اور سڑک پر نکل آیا۔ اب میں خود مختار تھا۔ کسی کی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنے طور پر کام کرنا تھا' چنانچہ اسپورٹ سست رفتاری سے سڑکوں پر دوڑتی رہی اور پھر ایک خوبصورت سے ہوٹل کے سامنے میں نے اسپورٹ روک دی۔ اتر کر اندر گیا۔ اور کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ میں نے کاؤنٹر کلرک سے ایک کمرہ طلب کیا۔ ہوٹل کی پہلی منزل پر مجھے ایک کمرہ مل گیا۔ ایک ہفتے کا کرایہ ادا کر کے میں نے چابی لی۔ اور کمرہ دیکھنے چل پڑا۔ عمدہ کمرہ تھا' کمرے کو دیکھنے کے بعد میں واپس نکل آیا اور اب میرا رخ بازار کی طرف تھا۔ بازار سے میں نے ایک سوٹ کیس' کچھ عمدہ قسم کے ریڈی میڈ لباس' سردیوں کے استعمال کے بڑے بالوں والی ایک پوستین اور ایسی ہی کچھ دوسری چیزیں خریدیں ------ اور واپس ہوٹل چل پڑا۔ یوں میں اس ہوٹل میں فروکش ہو گیا لیکن میرا مقصد یہاں رہنا نہیں تھا۔ چنانچہ کمرے کو تالا لگا کر ایک بار پھر میں باہر نکل آیا۔ اب میں نے ایک اوپیرا ہاؤس کا رخ کیا تھا۔ میں اپنے طور پر ہی ایران سے واقف ہونا چاہتا تھا۔!

اوپیرا ہاؤس میں کچھ وقت گزارنے کے بعد میں وہاں سے بھی نکل آیا ------ اور ------ اس وقت میں شاہ والا کے ایک بارونق بازار سے گزر رہا تھا جب میری نگاہ اس پر پڑی ------ میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر لرز گئے تھے۔ یادداشت دھوکہ نہیں دے رہی تھی۔ بینائی پر مکمل اعتماد تھا۔ گو شکل میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ لیکن ------ وہ درفشانہ ہی تھی ------ وہ افغان رقاصہ جو کافی دن میرے ساتھ رہی تھی اور جسے میں ہربنس کے اڈے سے نکال لایا تھا۔

میں نے بریک لگا کر کار سڑک کے کنارے روک دی اور نیچے اتر آیا۔ میں نے ٹریفک سے بچتے ہوئے فٹ پاتھ کراس کیا۔ چند منٹ تک درفشانہ کا تعاقب کرتے ہوئے میں نے اندر لگایا کہ اس کے ساتھ کوئی اور تو نہیں ہے۔ لیکن وہ تنہا تھی۔ جدید طرز کے لباس میں' بال کٹے ہوئے۔ خوبصورت میک اپ میں لتھڑی ہوئی درفشانہ ------ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اپنا پرس ہلاتی ہوئی

دوکانوں پر نگاہ ڈالتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔!

"درخشانہ ------!" میں نے اسے آواز دی۔ اور وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اور مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نواز ------!" وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"خدا کا شکر ہے کہ میرا انداز غلط نہیں تھا۔"

"تم ------ یہاں نواز ------!" وہ اسی انداز میں بولی۔

"یہی سوال میں تم سے کر سکتا ہوں۔!"

"آؤ ------ کہیں بیٹھ کر بات کریں۔ یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"آؤ ------!" میں نے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور وہ خاموشی سے میرے پاس آبیٹھی۔ میں نے جلدی سے کار اسٹارٹ کی۔ اس سے گفتگو کے لئے میرے ہوٹل سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے کمرے میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ درخشانہ کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ راستے بھر ہم نے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔! بہرحال میں نے سلسلہ گفتگو شروع کیا۔

"کیسی گزر رہی ہے درخشانہ۔؟"

"بس گزر رہی ہے۔!" اس نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے تو حلیہ ہی بدل لیا۔" میں نے کہا۔

"میں ------ میں کیا حیثیت رکھتی ہوں۔ جس کا دل چاہتا ہے' اپنی پسند کی شکل دے دیتا ہے۔"

"اوہ ------!" میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ "میری یہ ملاقات تمہیں ناگوار تو نہیں گزری درفشانہ۔؟" جواب میں اس نے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں ------!"

"ایران کب آئیں۔؟"

"ایک ہفتے قبل۔"

"کہاں مقیم ہو۔؟"

"آریانہ ------ روم نمبر سترہ۔!"

"تنہا ہو ------؟"

"نہیں ------! تلسی میرے ساتھ ہے۔" اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"تلسی کون ہے۔؟"

"ہربنس کا آدمی ------ مال لاتا لیجاتا ہے۔ میرا پرانا عاشق ہے' بدشکل بدصورت' بد اخلاق' کسی طور قابل قبول نہیں تھا۔ لیکن مجبوریاں۔ وہاں ہربنس کے اڈے پر' میں کتے کو پسند کرتی تھی' کسی کو نہیں۔ وہ میرے نزدیک آنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اسے کبھی منہ نہیں نہ لگایا۔ لیکن ------ پھر وہ مجھے اتفاق سے مل گیا۔ اس نے بتایا کہ ہربنس میری تلاش میں ہے۔ اس نے کہا یہ اس کا بھی فرض ہے کہ وہ مجھے گرفتار کر کے ہربنس کے حوالے کر دے۔ لیکن وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کر لوں تو وہ مجھے ہربنس سے بچالے گا۔ اور اب میں اس کے

ساتھ ہوں۔"

"اوہ------!" مجھے درخشانہ پر کافی رحم آیا۔ مظلوم لڑکی نہ جانے کونسی قسمت لے کر پیدا ہوئی تھی۔ لیکن------ اچانک میرے اندر کا سویا ہوا چالاک آدمی جاگ پڑا۔ کسی اندرونی خیال سے میرا چہرہ سرخ ہوگیا اور۔ بمشکل میں نے اپنے جوش پر قابو پایا۔ "تو اب تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔؟" میں نے پوچھا۔

"ترکی------! تلسی مال لایا ہے' ترکی لے جا رہا ہے۔" درخشانہ نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"تمہاری حیثیت اس کے ساتھ کیا ہے۔؟"

"ایک داشتہ کی سی۔!"

"اوہ------ مگر اس کے لئے تم تیار کیوں ہوئیں؟" میں نے پوچھا اور درخشانہ نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر بھاری لہجے میں بولی۔

"پیٹ کیلئے------ زندہ رہنے کیلئے۔!"

"لیکن تم تلسی کو پسند بھی تو نہیں کرتیں درخشانہ۔؟"

"ایک طوائف کی۔ اپنی کوئی پسند نہیں ہوتی نواز۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"اگر تمہیں کوئی بہتر زندگی مل جائے درخشانہ------؟"

"کون دے گا۔؟ بتاؤ------ کون دے گا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تم رقاصہ ہو درخشانہ۔ کسی کلب میں رقص کر کے زندگی گزار سکتی ہو۔ زندگی کی ابتداء کے لئے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں کوشش کر کے تمہیں ایران کی شہریت دلوا دوں گا۔ یہاں ملازمت کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں زندگی کے آخری لمحوں تک تمہاری ممنون رہوں گی!" درخشانہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اوکے درخشانہ۔ یہ کام میرا ہے۔ میں یہ کر دوں گا' تم بے فکر رہو۔ چند روز اور تمہیں تلسی کے ساتھ گزارنے ہوں گے۔ ویسے تمہاری------ روانگی کا کیا پروگرام ہے۔؟"

"تلسی ہر حالت میں آج سے چوتھے روز سرحد عبور کر لے گا۔"

"مگر وہ مال کس طرح لے جا رہا ہے۔؟"

"کھلونوں کے بیوپاری کی حیثیت سے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ پلاسٹک کے خوبصورت کھلونے ہیں۔ ان میں سے بہت سے کھلونوں میں منشیات موجود ہیں۔"

"ہوں------ یہ تو تم جانتی ہو درخشانہ------ کہ تمہیں یہ گفتگو راز رکھنی ہے۔"

"میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔!" درخشانہ نے جواب دیا۔ پھر تھوڑی دیر تک درخشانہ میرے پاس بیٹھی رہی۔ میں نے اسے کافی وغیرہ پلائی اور پھر نیچے آ کر اسے ایک ٹیکسی میں سوار کر کے روانہ کر دیا۔ قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ نو بجے سے پہلے میں اپنی رہائش گاہ پر واپس آ گیا۔ ٹھیک نو بجے یمانی پہنچ گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد ہم باہر نکل آئے۔ یمانی اپنی کار لایا تھا اس میں بیٹھ کر ہم چل پڑے۔ ڈرائیونگ یمانی ہی کر رہا تھا۔ کار سڑکیں طے کرتی رہی۔!

"کوکین تیار ہے یمانی۔؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل۔!"

"اس کی پیکنگ کس انداز کی ہے۔؟"

"ابھی صرف پلاسٹک کے چھ انچ لمبے پائپ ہیں۔ لیکن آپ جس انداز میں کہیں گے اسے پیک کر دیا جائے گا۔"

"ہوں------ میں اسے کار کے اکسٹرا سلنڈر میں لے جانا چاہتا ہوں لمبے لمبے پائپ کار میں مختلف جگہ فٹ کئے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ اور یمانی ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔

"کیوں------؟" میں نے اس کے چہرے پر غور و فکر کے آثار دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ طریقہ پرانا ہے۔ کسٹم والے اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

"فکر مت کرو یمانی------ میں اسی پرانے طریقے میں تھوڑا سا نیا پن پیدا کروں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے مسٹر نواز۔ میں آپ کی مرضی کے مطابق ایسے سلنڈر تیار کر لوں گا۔" یمانی نے گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ویسے میرا اندازہ تھا کہ وہ میری بات سے مطمئن نہیں ہے۔ تاہم میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے اور کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے اپنے ہوٹل کے کمرے کے بارے میں بتایا۔

"اوہ------ یہ کیوں۔؟"

"بس میرے پروگرام کے لئے ضروری تھا۔"

"اوہ------!" اس نے پھر گردن ہلائی۔

"اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں۔؟" میں نے پوچھا۔

"اسنیکا۔! وہاں کھانا کھائیں گے۔ وہیں میرا ایک دوست بھی موجود ہے جو آپ کے لئے دلچسپیاں فراہم کرے گا۔"

"خوب------!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم اسنیکا پہنچ گئے بہت خوبصورت اوپن ایر ریستوران تھا۔ انتہائی لذیذ کھانے تھے۔ یمانی نے اپنے پسند کے کھانے مجھے کھلائے۔ آرکسٹرا پر موسیقی ابھر رہی تھی۔ پھر ایک رقاصہ ٹیپل ڈانس کرنے لگی۔ گیارہ بجے تک ہم وہاں کی دلچسپیوں میں کھوئے رہے۔ پھر یمانی نے ایک ویٹر کو بلایا۔ اور ویٹر اس کے قریب پہنچ کر جھک گیا۔!

"فوکر نہیں نظر آیا------؟" اس نے کہا۔

"بار روم میں موجود ہے جناب۔" ویٹر نے ادب سے جواب دیا۔

"اس سے کہو' یمانی طلب کرتا ہے۔" یمانی نے کہا اور ویٹر گردن ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سفید کوٹ اور سیاہ پینٹ میں ملبوس ادھیڑ عمر کا ایک اسمارٹ آدمی یمانی کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو مسٹر یمانی۔!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"میرے دوست سے ملو۔ مسٹر نواز!"

"خوب------ بڑی مسرت ہوئی۔"

"مہمان ہیں------ اور تم جانتے ہو مہمانوں کی مدارات کس طرح سے کی جاتی ہے۔؟"

"اچھی طرح جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں۔!" فوکر نے یمانی کی جیب سے نکلتی ہوئی نوٹوں کی گڈی کو کسی بھوکے کوے کی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔ گڈی نکل کر انتہائی پھرتی سے فوکر کی جیب میں پہنچ گئی۔

"ابھی چلیں جناب۔ یا کچھ دیر بعد۔؟" فوکر نے پوچھا۔

"جانا کہاں ہوگا۔؟"

"انتہائی نفیس ماحول۔۔۔۔۔ بالکل گھر کی طرح۔ آپ بے فکر رہیں مسٹر یمانی۔ فوکر آپ کیلئے اجنبی نہیں ہے۔" فوکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آیئے مسٹر نواز۔۔۔۔۔!" یمانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ فوکر ہم دونوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ پھر وہ ایک لمبی سی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"تشریف رکھیے۔"

"خوب۔۔۔۔۔!" میں نے یمانی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا، اور یمانی بھی مسکرا دیا۔ میں کار میں بیٹھ گیا۔ اور فوکر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ یمانی اپنی کار لے کر چلا گیا تھا۔ راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ اور پھر ایک چھوٹے سے خوبصورت ایک منزلہ بنگلے میں داخل ہو کر کار رک گئی۔ فوکر نے ادب سے دروازہ کھول دیا۔ اور میں نیچے اتر کر اس کے ساتھ عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہ مجھے لئے ہوئے ایک خوبصورت ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ پھر اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔ اور پھر جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ چھ حسین ترین لڑکیاں تھیں۔!

وہ ایک ایک کر کے سب سے تعارف کرانے لگا! سب ہی خوبصورت تھیں۔ میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ بہرحال میں نے ایک متناسب الاعضاء لڑکی کی طرف انگلی اٹھا دی، جو دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں شکل صورت میں کمتر تھی اور شاید احساس کمتری کا شکار بھی۔۔۔۔۔ دوسری لڑکیوں نے اور خود فوکر نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ لیکن پھر فوکر جلدی سے بولا۔

"اوکے ربابہ۔۔۔۔۔ مہمان کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔" اور ربابہ نے گردن ہلا دی۔ وہ مجھے لئے ہوئے ایک خوبصورت کمرے میں پہنچ گئی۔ اور اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لیکن اس کے چہرے پر اب بھی حیرت کے نقوش چسپاں تھے۔

"آپ پاکستانی ہیں جناب؟" اس نے میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔!"

"مجھے پاکستان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"ہوں۔۔۔۔۔!" میں نے کہا۔ پھر وہ اٹھی اور میرے قدموں کے نزدیک بیٹھ کر جوتوں کے بند کھولنے لگی۔ میں نے اسے روکا نہیں تھا۔ اس نے ایک سلیپر لا کر میرے نزدیک رکھ دیا۔ پھر اٹھتی ہوئی بولی۔

"کچھ پئیں گے۔؟"

"جو تم پلا دو گی۔" میں نے کہا۔

"میری پسند سے۔؟" وہ مسکرائی۔

"ہاں۔۔۔۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ پہلے اس نے ملحقہ باتھ روم میں جا کر ہاتھ

دھوئے۔ پھر واپس آ کر ایک الماری سے شراب کی تین بوتلیں نکالیں۔ ان تین شرابوں کو ملا کر اس نے ایک خوشرنگ کاک ٹیل تیار کی۔ اور میرے نزدیک آ گئی۔ چار پیگ میں نے لئے۔ دو اس نے، اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا۔ لیکن وہ بہکی نہیں تھی۔ پھر اس نے میری آغوش میں گرتے ہوئے کہا۔

"ایک بات بتائیں گے۔؟"

"ضرور۔۔۔۔۔؟"

"دوسری لڑکیاں میرے مقابلے میں کافی خوبصورت تھیں۔ پھر آپ نے میرا انتخاب کیوں کیا۔؟"

"خوبصورتی کا فیصلہ کرنے والے بدذوق ہوں گے۔ تم ان سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔" میں نے اس کے گداز شانوں کو دبوچتے ہوئے کہا۔

"آپ کا حسن نظر ہے ورنہ۔ آج تک ان کے مقابلے میں کسی نے مجھے پسند نہیں کیا۔"

"مگر میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔"

"وہ سب پاکستانیوں کی دیوانی ہیں۔ ہر ایک کی خواہش تھی۔ کہ آپ اسے پسند کریں۔ اب وہ کئی دن تک مجھ سے منہ بنائے رکھیں گی؟ وہ ہنسی اور میں نے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ ربابہ احساس کمتری کا شکار تھی۔ میں نے اسے پسند کیا تو اس کی پیاسی روح کو تسکین ملی۔ وہ کاروبار بھول گئی اور اس کی یہی خواہش رہی کہ میری پسند برقرار رہے۔ صبح کو ایک طویل بوسے کے بعد اس نے مجھے رخصت کیا۔ ایک پرانی فورڈ کار مجھے میری رہائش گاہ پر چھوڑنے آئی تھی۔ میں ربابہ سے دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے آیا تھا، لیکن میرا اس کے پاس دوبارہ جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اور یہ اس پروگرام کی کامیاب ابتداء تھی جو میں نے عورت کے معاملے میں بنایا تھا۔!

بہرحال۔۔۔۔۔ آج کا دن بے حد مصروفیت کا تھا۔ یمانی دس بجے کے قریب آیا اور میں نے اس سے درخشانہ کے بارے میں گفتگو کی۔ "یہ میرا ذاتی کام ہے مسٹر یمانی۔۔۔۔۔ اور اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار رہوں گا!"

"میری ذمہ داری جناب۔۔۔۔۔ اس کا کام باآسانی کرا دوں گا۔ کئی نائٹ کلبوں کے منیجروں سے میری دوستی ہے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ اور ہاں، یہ کارڈ اسے دے دیں۔ وہ جب بھی آپ کے حوالے سے مجھ سے ملے گی میں اس کی پذیرائی کروں گا۔"

"بہت بہت شکریہ یمانی۔۔۔۔۔ اب مجھے دوسرے کام کرنے ہیں، اجازت دو۔" اور میں اٹھ گیا۔ اور پھر میں نے اسپورٹ لی اور باہر نکل آیا۔ درحقیقت آج مجھے بہت سے خاص کام کرنے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں کسٹم ہاؤس گیا۔ میرے شناسا کسٹم افسروں نے میرا پرجوش استقبال کیا۔ جمشید عظمی بھی موجود تھا۔

"آپ کو تو بہت تلاش کیا گیا مسٹر نواز۔ کیا آپ تہران ہی میں تھے یا باہر نکل گئے تھے۔؟" احسانی نے پوچھا۔

"تہران ہی میں تھا مسٹر احسانی۔۔۔۔۔ البرق میں قیام ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی۔ خیر۔۔۔۔۔ ایک آدھ دن ہمارے ساتھ بھی گزاریئے۔ ہم سب

آپ کے احسان مند ہیں۔ وہ گروہ تو بہت بڑا نکلا اور اس کی جڑیں دور تک گئی ہیں۔"

"حاضر ہوں۔ اور سوچ رہا ہوں کہ آپ کے لئے کچھ اور کروں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ------ آپ کے احسان کا کس منہ سے شکریہ ادا کریں۔ کیا کوئی اور اشارہ ملا ہے۔؟"

"ہاں------ لیکن ابھی یقین کر رہا ہوں۔ حالات سے مطلع ہوتے ہی آپ کو آگاہ کر دوں گا۔"

"بخدا------ ہم آپ کے بے حد احسان مند رہیں گے۔ ہم ایران کی سرحدوں میں یہ لعنت نہیں دیکھ سکتے۔"

"میں آپ کی مکمل مدد کے لئے تیار ہوں۔!" اور پھر میں ان کا مہمان بن گیا۔ دوپہر کا کھانا میں نے احسانی اور جمشید عظمی کے ساتھ ایک عمدہ سے ہوٹل میں کھایا۔ دونوں بے حد خوش اخلاق اور ملنسار تھے۔

"بس ایک دو دن میں' میں آپ کا وطن چھوڑ رہا ہوں۔!" روا روی میں' میں نے کہا۔

"اس قدر جلد------! کچھ وقت ہمارے ساتھ بھی گزاریئے۔" احسانی نے کہا۔

"تہران کا چپہ چپہ دیکھ چکا ہوں۔ اب اجازت ہی دیں تو بہتر ہے۔"

"کب روانہ ہو رہے ہیں۔؟"

"دو تین دن میں۔!"

"اور ہمارا کام۔؟"

"اس سے قبل ہی انجام دے دوں گا!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ دونوں جوش مسرت سے ہاتھ ملنے لگے۔

"بہرحال------ آپ کی دوستی اور تعاون ہمیشہ یاد رہے گا۔ ویسے ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی کوئی خدمت نہ کی جاسکی۔ یہاں کسی چیز کی ضرورت ہو تو....."

"کیا آپ ایک سیکنڈ ہنڈ لینڈ کروزر خریدنے میں میری مدد کریں گے میرا خیال ہے باقی سفر گاڑی سے کروں۔"

"ضرور------ ضرور------ میرا خیال ہے' میں آپ کے لئے یہ بندوبست کر سکتا ہوں۔" جمشید عظمی نے کہا۔

"تب پھر براہ کرم میرا یہ کام آج ہی کر دیں۔" میں نے کہا اور جمشید عظمی مجھ سے اجازت لے کر اٹھ گیا۔ وہ کسی کو فون کرنے گیا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ واپس آیا۔

"چلئے نواز صاحب------ میرے ایک دوست کا آٹو گیراج ہے۔ اس کے پاس کئی گاڑیاں ہیں۔! عمدہ اور سستی۔ گاڑیاں۔"

"آیئے------!" اور میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ آٹو گیراج سے میں نے ایک لینڈ کروزر پسند کی اور تھوڑی سی رقم ایڈوانس دے دی۔ بقیہ رقم دوسرے دن ادا کرنے کا وعدہ کر کے ہم وہاں سے چلے آئے! پھر میں انہیں اپنے ہوٹل لایا------ یوں شام تک میں ان لوگوں کے ساتھ رہا۔ اور پھر دوسرے دن ملاقات کا وعدہ کر کے وہ چلے گئے۔!

ایک ویٹر نے مجھے ایک چٹ دی۔ یہ درخشانہ کی تھی۔ وہ دن کو دو بجے آئی تھی' اور دوسرے دن دو بجے آنے کی اطلاع دے کر چلی گئی تھی۔ رات کا کھانا میں نے اپنے ہوٹل میں کھایا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے تیاریاں کیں اور پھر یمانی کی طرف چل پڑا۔ ویسے میں پوری طرح محتاط تھا۔ کسٹم والے اس بات پر شک کر سکتے تھے کہ میرے پاس اسپورٹ کہاں سے آئی۔ یا پھر میں نے لینڈ کروزر کے لئے رقم کہاں سے اکٹھا کی------ بہرحال' اگر اس سلسلے میں سوال کیا جاتا تو جواب میرے پاس تیار تھا۔ یہاں بہت سے لائسنس یافتہ جوئے خانے موجود تھے۔!

یمانی میرا منتظر تھا۔ اس نے پریشان سے انداز میں میرا استقبال کیا۔ "بڑی شدت سے انتظار تھا مسٹر نواز------ اگر آپ کچھ دیر اور نہ آتے تو میں ہوٹل فون کرنے والا تھا۔"

"بے فکر رہو------ اب ایران میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ اچھی بات ہے۔ بہرحال آج کیا پروگرام ہے۔؟"

"نوکر عمدہ آدمی ہے۔ اس سے ملاقات کریں گے۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

دوسری رات بھی پہلی رات سے مختلف نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ اس رات میں دو بجے اپنے ہوٹل واپس آگیا۔ دوسرے دن احسانی اور جمشید عظمی نے میرے ساتھ ہی ناشتہ کیا تھا۔ وہ لوگ مجھ سے اس نئے شکار کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے۔

"تھوڑا سا انتظار اور------ مسٹر عظمی' میرے اوپر بھروسہ رکھیں" میں نے کہا۔

"سوری------! بس یوں سمجھ لیں۔ انتظار موت سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔" احسانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس تھوڑا سا وقت اور------ ممکن ہے آپ کو میرے ساتھ ہی سفر کرنا پڑے۔!"

"اوہ------ کہاں تک۔؟"

"سرحد تک! اس کا امکان ہے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی ضرورت نہ پیش آئے۔ ویسے دشمن چالاک ہے۔"

"خوب------! آپ بے فکر رہیں۔ ہم آپ سے مکمل تعاون کریں گے اور آپ کی ہدایت کے خلاف کچھ نہ ہو گا۔!"

"شکریہ!" میں نے کہا۔ "ہاں۔ میری گاڑی تیار ہو گئی۔ دراصل ایک مقامی دوست کی کارمانگ رکھی ہے۔ ایک نائٹ کلب میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس بات کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ اہل ایران بڑے پر خلوص ہوتے ہیں۔"

"خاص طور سے پاکستانیوں کے لئے------ ہم اپنے دلوں میں آپ کے لئے خاص محبت رکھتے ہیں۔" احسانی نے کہا۔

"میرے ساتھ تو انہوں نے بہت ہی اچھا سلوک کیا ہے۔ اب آپ ہی دیکھئے۔ آپ نے میرے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔!"

"ہمیں معلوم ہے آپ ایک سیاحت پسند انسان ہیں۔ آپ کی صاف اور نیک طبیعت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے منشیات کا کاروبار کرنے والے گروہ کا صفایا کرنے میں ہماری مدد کی

ہے۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔ لیکن میں اہل ایران کے جس خلوص کا ذکر کر رہا ہوں وہ کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا-----؟"

"یہاں کے نائٹ کلب اور ان کے گیمز روم-----جہاں سے انہوں نے میرے لئے ایران میں سہولتیں مہیا کیں۔ ورنہ میری جیب خالی ہو چکی تھی۔"

"اوہ-----!" احسانی نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ جمشید بھی ہنسنے لگا۔ "تو یہ بات ہے۔ ہاں ہم سوچ ضرور رہے تھے کہ یا تو آپ کے پاس بے اندازہ ٹریولرز چیک ہیں۔ یا پھر آپ کے وسائل۔!"

"نہیں بھائی-----ایک غریب آدمی ہوں۔ بس ہر ملک میں میں تاش کے پتوں کا سہارا لیتا ہوں۔ وہی میرا روزگار ہے۔"

"خوب روزگار ہے۔ ویسے نواز صاحب-----کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اگر کچھ خدمت کر سکیں۔ تو خوشی ہوگی۔"

"میر جیبیں خاصی وزنی ہو چکی ہیں۔ اگر ضرورت ہوتی تو آپ کو ضرور تکلیف دیتا۔ ہاں ترکی کی سرحدوں پر کچھ وقت پیش آسکتی ہے۔ کیا کرنسی بدلنے میں کوئی خاص دقت ہوگی؟ میرا مطلب ہے اتنی کہ ترکی میں داخل ہو کر کچھ وقت گزار سکوں؟"

"آپ بالکل فکر نہ کریں مسٹر نواز-----بازرگان کی سرحدی چوکی پر میرا دوست محمود بے تعینات ہے۔ بڑا بے تکلف اور ہنس مکھ انسان ہے میں آپ کو تعارفی خط دے دوں گا۔ وہ آپ کی ہر ممکن مدد کرے گا۔!" احسانی نے کہا۔

"یہ آپ کا سب سے بڑا احسان ہوگا۔" میں نے کہا۔ پھر ہم ہوٹل سے نکل آئے! گیرج جاکر میں نے لینڈ اوور کی ٹرائی لی۔ رقم ادا کی گیراج کے مالک نے ضروری کاغذات تیار کر لیے تھے۔ چنانچہ لینڈ اوور میرے قبضے میں آگئی۔ اور ہم اسے ہوٹل تک لے آئے!

بارہ بجے میں نے ان دونوں سے معذرت کی اور دوسرے دن کی ملاقات کا پروگرام بنا لیا۔ اور پھر میں درخشانہ کا انتظار کرنے لگا! ٹھیک دو بجے درخشانہ پہنچ گئی۔ وہ جلدی میں تھی۔!

"میں زیادہ دیر نہ رکوں گی۔ کل اس نے روانگی کا پروگرام بنا لیا ہے۔ مجھے بتاؤ-----اب میں کیا کروں۔؟"

"اگر تم اچانک غائب ہو جاؤ درخشانہ-----تو کیا وہ تمہیں تلاش کرنے کے لیے رک جائے گا۔!"

"نہیں رک سکتا۔ اسے ہر حالت میں کل ایران چھوڑ دینا ہے۔"

"خوب-----کل کس وقت روانہ ہو رہا ہے۔؟"

"یہاں سے گیارہ بجے چل پڑے گا۔"

"بس تو تمہارا کام ہو گیا۔ اب تمہیں اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ-----"

میں اٹھ گیا۔ اور پھر میں درخشانہ کو لے کر اپنی لینڈ اوور میں بیٹھ کر یمانی کی طرف چل پڑا۔ اتفاق سے

یمانی موجود تھا۔ لینڈ اوور کو دیکھ کر اس نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"میں نے خرید لی ہے۔ ان سے ملو۔ یہ درخشانہ ہیں۔ اور درخشانہ-----یمانی تمہاری مدد کریں گے۔ یہ عمارت تمہاری نئی رہائش گاہ ہے۔ میری طرف سے یہ رقم قبول کرو۔ جس وقت اور جس چیز کی ضرورت ہو یمانی سے بے جھجک کہہ دینا۔" میں نے کافی موٹی رقم درخشانہ کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا۔ درخشانہ کی آنکھوں میں ممنونیت کے آنسو چھلک آئے تھے۔

"آپ بے فکر رہیں خاتون درخشانہ-----یوں محسوس کریں کہ آپ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہیں۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ مسٹر نواز نے مجھے آپ کے بارے میں ہدایات دے دی ہیں۔ بے فکری سے یہاں رہیں۔ میں آپ کے لئے آپ کی پسند کی ملازمت مہیا کر دوں گا۔ آپ باعزت زندگی گزار سکیں گی۔!"

"میں تمہاری شکر گزار ہوں نواز-----!" درخشانہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ اور میں نے اسے سمجھا بجھا کر اندر پہنچا دیا۔ پھر میں یمانی کو لے کر ایک کمرے میں آگیا۔

"سلنڈر تیار ہیں یمانی۔؟" میں نے پوچھا۔

"پورا کام مکمل ہے۔"

"اس لینڈ روور میں احتیاط سے فٹ کرا دو۔ راتوں رات یہ کام مکمل ہو جانا چاہئے۔ میں کل روانہ ہو رہا ہوں۔"

"اوہ-----کل کس وقت؟" یمانی نے چونک کر پوچھا۔

"لینڈ روور صبح سات بجے ہوٹل پہنچ جانی چاہئے۔ بس تم سلنڈر احتیاط سے فٹ کرانا۔ ان میں کوتاہی نہ رہ جائے۔!"

"بالکل بے فکر رہیں مسٹر نواز-----ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ یمانی نے مستعدی سے جواب دیا۔

"شکریہ-----باقی کسی قسم کی فکر مت کرو-----اور ہاں، کچھ رقم کی ضرورت ہے۔؟"

"جتنی ضرورت ہو۔!" یمانی نے کہا۔ یمانی سے رقم لے کر میں پھر درخشانہ سے ملا۔ اور میں نے اس سے تلسی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ اور اسے تسلیاں دے کر وہاں سے نکل آیا۔ یمانی نے اپنے ملازم کو میرے ساتھ بھیج دیا تھا تاکہ وہ اسپورٹ واپس لے آئے۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے اسپورٹ کی چابی ملازم کو دی اور بھرپور اطمینان سے احسانی کو فون کرنے لگا دوسری طرف سے احسانی نے ہی فون ریسیو کیا تھا۔

"میں نواز بول رہا ہوں۔"

"اوہ-----نواز صاحب-----خیریت۔؟"

"نہیں-----فوراً آجاؤ۔"

"اوہو-----میں حاضر ہو رہا ہوں۔" احسانی نے بدحواسی سے کہا۔ نہ جانے اس کے مکان سے یہاں تک کا فاصلہ کتنا تھا۔ بہرحال اس نے میرے پاس پہنچنے میں صرف بارہ منٹ خرچ کئے تھے اور پھر وہ بدحواس سا میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"کیا بات ہے مسٹر نواز-----؟" اس نے پوچھا۔

"کل ------ کل ہم یہاں سے چل رہے ہیں۔ ہمیں طویل سفر کرنا ہو گا۔"
"ہمیں یہاں سے کہاں جانا ہو گا مسٹر نواز۔؟"
"میرا خیال ہے تبریز تک ------ ہم منشیات کے اسمگلروں کا اندازہ لگالیں گے۔ ممکن ہے تبریز ہی میں ان پر ہاتھ ڈال دیا جائے۔ ورنہ پھر بازرگان پر تو یقینی ہے۔" میں نے کہا۔
"ان کی تعداد کے بارے میں کوئی اندازہ ہے مسٹر نواز۔؟"
"صحیح نہیں ------ لیکن دو یا زیادہ سے زیادہ تین ------ بس یہ آخری تعداد ہے۔"
"ہمیں کتنے آدمیوں کو ساتھ لینا ہو گا۔؟" احسانی نے پوچھا۔
"اسلحہ ضرور ہونا چاہئے۔ آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے۔"
"براہ کرم اس سلسلے میں کوئی اشارہ تو دیں۔ آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے۔ ممکن ہے ہم مشکلات سے دوچار ہو جائیں۔ احسانی نے کہا۔
"مسٹر احسانی ------ تمام مشکلات کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔ کچھ معاملات میرے ذہن میں صاف نہیں ہیں جن کی تصدیق کے لئے میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ اگر معاملہ صاف ہوتا تو میں ذرا بھی دقت نہ محسوس کرتا۔"
"خیر ------ کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمیں آپ پر اعتماد ہے۔ جمشید عظمی کو تو ساتھ لینا ہے۔؟"
"یقینی طور پر ------ میں نے کہا۔
"ٹھیک ہے ------ کل ہماری ملاقات کہاں ہو گی۔؟"
"کل ساڑھے دس بجے ------ آپ تیار ہو کر یہاں تشریف لے آئیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔"
"او کے!" احسانی نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر وہ مجھ سے مصافحہ کر کے باہر نکل گیا۔ یہ رات میں نے اپنے کمرے میں ہی گزاری۔ اب یمانی سے ملاقات بھی مناسب نہیں تھی۔
دوسرے دن صبح سات بجے یمانی نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ میں ساڑھے چھ بجے ہی جاگ چکا تھا۔ یمانی نے اطلاع دی کہ گاڑی پہنچا دی گئی ہے۔ تمام کام بالکل درست ہے۔!
"اجازت دیں مسٹر یمانی۔ آپ کی دعائیں درکار رہیں گی۔"
"میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں مسٹر نواز۔" یمانی نے گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں ------ آپ وہاں جا کر انقرہ میں گیس اسٹور کی معرفت اپنی مکمل رپورٹ دیں۔"
"بہت بہتر ------" میں نے گردن ہلا دی۔
"کیا آپ کو کسی کا انتظار ہے۔" یمانی نے میری شکل غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں ------!"
"پوچھ سکتا ہوں۔ کس کا۔؟"
"فی الحال صرف دو نام لوں گا۔ ایکسائز آفیسر مسٹر احسانی اور جمشید اعظمی کا ------ یہ دونوں حضرات میرے ساتھ اسی گاڑی میں سفر کریں گے' میرا مطلب ہے میری لینڈ روور میں' جسے خرید نے میں انہوں نے میری مدد کی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور یمانی کا منہ حیرت سے پھیل

گیا۔
"کک ------ کیا مطلب۔ کیا مطلب۔؟ یعنی کہ یہ دونوں حضرات......!" اس نے بدحواسی سے کہا۔
"ہاں ------! یہ دونوں حضرات نہ صرف مجھے ایران کی سرحد پار کرائیں گے بلکہ ارض روم کی سرحد سے میرے نکلنے کا بندوبست بھی کریں گے بس' اس سے آگے کچھ نہ بتا سکوں گا مسٹر یمانی ------ خدا حافظ۔"
یمانی پاگلوں کی طرح میری شکل دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر شانے ہلائے اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "اب تو آپ کی رپورٹ کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔"
"خدا حافظ ------!" میں نے ہاتھ ہلایا اور مخبوط الحواسوں کے سے انداز میں باہر نکل گیا۔!

☆ ☆ ☆

یمانی کے چلے جانے کے بعد میں نے ایک گہری سانس لی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے لئے یہ بات واقعی حیرت انگیز ہو گی کہ میں اپنے ساتھ دو کسٹم حکام کو لے جا رہا ہوں۔ جبکہ منشیات کے اسمگلر تو ان کے سائے سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں' اس کے علاوہ جس انداز میں میں نے کوکین سلنڈروں میں بھروائی تھی۔ وہ ایک عام اور گھٹیا طریقہ تھا جسے اب اسمگلروں نے نظرانداز کر دیا تھا کیونکہ کسٹم کے معمولی سپاہی بھی اب اس سے واقف ہو گئے تھے۔
لیکن ------ میں نے اسی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اور یہاں آپ میری ذہانت کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ جس بات کو انہوں نے نظرانداز کر دیا تھا' وہی میں نے کی تھی۔ تاکہ وہ اس طرف متوجہ نہ ہوں۔ اور پھر بے چارے ایرانی افسر میرے اوپر بھروسہ کرتے تھے کیونکہ میں ان کے خیال میں ایک نیک فطرت انسان تھا۔ میں نے منشیات کے ایک بہت بڑے گروہ کا قلع قمع کرایا تھا۔ اور اب میں دوبارہ یعنی جاتے جاتے بھی ان کی مدد کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ میرے اوپر شک نہیں کر سکتے تھے۔
ٹھیک دس بجے جمشید عظمی اور احسانی میرے پاس پہنچ گئے۔ وہ سادہ لباس میں تھے۔ اور ان کے لباس میں اسلحہ چھپا ہوا تھا۔ دونوں بے حد اسمارٹ نظر آ رہے تھے۔
"احتیاطاً" چار افراد کو ساتھ لے لیا گیا ہے۔ لیکن وہ ایک دوسری گاڑی میں سفر کریں گے۔ حلیہ ہپیوں کا سا ہے اور گاڑی پرانی ہے۔ ان پر کوئی شک بھی نہیں کر سکے گا۔ لیکن وہ پوری طرح مسلح ہیں اور ہمارے احکامات کی تعمیل کے لئے چوکس ------" جمشید عظمی نے بتایا۔
"ٹھیک ہے۔ حفظ ماتقدم کے تحت مناسب ہے۔ جبکہ میری اطلاع کے مطابق شاید اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔"
"بہرصورت ------ آپ کو ارض روم کے حوالے کر کے ہم اسی گاڑی سے واپس آجائیں گے۔" احسانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور میں نے گردن ہلا دی۔ پھر میں نے بھی تیاریاں مکمل کیں۔ اور تقریباً ساڑھے دس بجے ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے درخشانہ نے بتایا تھا کہ ہر حالت میں ٹھیک گیارہ بجے تلسی ہوٹل چھوڑ دے گی۔ چنانچہ میں ہوٹل آریانہ کی طرف چل پڑا۔ ڈرائیونگ میں ہی کر رہا تھا۔ اور میری رفتار سست تھی۔ مجھے بہت ہوشیاری سے کام کرنا تھا۔ بڑی خطرناک پچویشن تھی۔ ایک طرف تلسی پر نگاہ رکھنی تھی۔ تو دوسری طرف ان دونوں کو بھی مطمئن کرنا تھا۔ پروگرام

یہ تھا کہ بازرگان سے پہلے ان لوگوں کو تلسی کی نشاندہی نہیں کروں گا تاکہ سرحد والے بھی اسی کی گرفتاری میں الجھے رہیں اور میری طرف توجہ نہ دے سکیں کیونکہ میں تو اسمگلروں کو گرفتار کرانے والوں میں شامل ہوں گا۔

درخشانہ نے تلسی کا حلیہ اور اس کی کار وغیرہ کی مکمل نشاندہی کر دی تھی اور یہ دلچسپ اتفاق ہی تھا کہ جب میں آریانہ سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر تھا تو آریانہ کے کمپاؤنڈ میں گہرے عنابی رنگ کی پرانی کار باہر نکلی۔ وہی نمبر تھا جو درخشانہ نے بتایا تھا۔ اور ڈرائیونگ کرنے والے کا حلیہ بھی وہی تھا۔ البتہ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایک پگڑی اور داڑھی والا سکھ تھا۔

میں نے ان لوگوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ تاکہ جمشید اور احسانی اس طرف متوجہ نہ ہوں۔ اور پھر ایک مخصوص فاصلے سے ہم عنابی کار کے تعاقب میں چل پڑے ہمارے پیچھے کسٹم کے دوسرے افراد کی کار تھی جو مناسب رفتار سے آرہی تھی۔ احسانی اور جمشید خاموش تھے۔ وہ کوئی انکشاف چاہتے تھے۔ لیکن ابھی تو اس کے لئے بہت وقت پڑا تھا۔ تاہم اخلاقی طور پر وہ جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے۔

"بڑی گہری سوچ میں ہیں آپ حضرات۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں ——— ہم آپ کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

"اوہ ——— میں ایک سادہ سا انسان ہوں۔ میرے بارے میں کوئی گہری سوچ بے معنی ہے۔" میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ——— ہمارے لئے تو آپ ایک اہم شخصیت ہیں۔ کیونکہ آپ کے تعاون سے ہمارے لئے ترقی کی سفارش کی گئی ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ جب ہم اپنی ترقی کی خوشی میں دوستوں کو مدعو کریں گے تو آپ ان میں شریک نہ ہوں گے۔"

"آپ خلوص دل سے مجھے یاد کریں۔ میرے لئے یہی کافی ہوگا۔" ویسے اس لڑکی کے سلسلے میں کیا ہوا؟"

"وہ ہندو لڑکی؟۔"

"ہاں ———"

"ابھی مقدمے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ انڈیا گورنمنٹ نے ان اسمگلروں کی حمایت سے انکار کر دیا ہے۔ اور انڈین سفارت خانے نے ہمیں اپنے طور پر انہیں سزائیں دینے کا اختیار دے دیا ہے۔ ممکن ہے اسے سلطانی گواہ بنا لیا جائے۔ کیونکہ وہ ٹھاکر کے گروہ کی ایک معمولی لڑکی ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوا تو بھی اسے شاید سزائے موت نہ دی جائے۔ کچھ سزا دی جائے گی۔"

"ہوں ———" میں خاموش ہو گیا۔ احسانی نے جمشید کی طرف دیکھا اور دونوں مسکرا دیئے۔ میں نے ان کی مسکراہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔ "کیوں؟۔ آپ لوگ ہنس رہے ہیں۔"

"سوری مسٹر نواز ——— بے تکلفی معاف فرمائیں۔ ہمیں یاد آگیا تھا کہ سرحد پر آپ نے اسے اپنی بیوی بنا لیا تھا۔"

"ہاں ———" میں بھی مسکرا دیا۔

"اور اس نے اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔"

"یقیناً ——— وہ کیوں اعتراض کرتی۔ اس طرح اس کی حفاظت ہوتی تھی۔"

"لیکن وہ صرف الفاظی بیوی تھی یا عملی بھی ———؟ بے تکلفی معاف۔ لیکن ہم دوستوں میں ہیں۔" جمشید نے کہا اور میں ہنسنے لگا۔

"عملی ہی سمجھ لیں۔ لیکن یہ شوہر اسے راس نہ آیا۔" میں نے کہا اور وہ دونوں میرے اس جملے سے خاصے محظوظ ہوئے۔

"تب مسٹر نواز ——— اسے گرفتار کراتے ہوئے آپ کو دکھ تو ہوا ہوگا۔"

"ہاں ——— مجھے شدید تردد تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ وہ میرے ساتھ بھی تو مخلص نہیں تھی۔ اگر مجھے بھی اسمگلنگ میں ملوث سمجھ لیا جاتا تو ——— چنانچہ میں نے اس سے نہ صرف چھٹکارا پایا بلکہ اسے سزا بھی دی۔"

"یوں بھی ——— اس کا اور آپ کا ساتھ ناجائز نہیں۔" احسانی بولا۔

"ہاں ———" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور وہ دونوں مسکراتے رہے۔ اس کے بعد پھر ایک طویل عرصے کے لئے خاموشی چھا گئی۔ میں ڈرائیونگ کرتا رہا۔ اور وقت گزرتا رہا۔ احسانی وغیرہ نے ابھی تک اسمگلروں کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے ہم قزوین میں داخل ہو گئے کردوں کا علاقہ جہاں طویل القامت کرد نوجوان اونچی پگڑیاں باندھے نظر آئے۔

"کیا خیال ہے۔ یہاں رک کر چائے پی جائے۔" احسانی نے کہا۔

"چائے تو ساتھ موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک دور رہے۔ یہاں رک کر کیا کریں گے۔ ہمیں اس وقت تک چلتے رہنا ہوگا جب تک مجھے ان لوگوں کا نشان نہ مل جائے۔" میں نے کہا۔ میں نے دیکھا تھا کہ عنابی کار یہاں نہیں رکی ہے پھر میں یہاں کیسے رک سکتا تھا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" جمشید نے کہا اور چائے کا تھرماس نکال لیا گیا۔ پھر ہم تینوں نے چائے پی۔ اور چائے کے دوران احسانی نے کہا۔

"مسٹر نواز ——— ڈرائیونگ کرتے ہوئے تھک جائیں تو یہ خدمت ہم میں سے کسی کے سپرد کر دیں۔"

"تھک جاؤں گا تو ضرور تکلیف دوں گا۔" میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"ویسے معاف کیجئے۔ اگر اجازت ہو تو کچھ سوالات کروں؟"

"تکلف چھوڑو ایرانی دوستو ——— اجازت وغیرہ کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے چائے کا مگ واپس کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک آپ نے اسمگلروں کی نشاندہی نہیں کی ہے۔"

"میں کہہ چکا ہوں شاید کہ مجھے ان کے بارے میں مختصر سی معلومات ہے۔ کسی خاص علاقے میں پہنچ کر ہم انہیں تلاش کر سکیں گے۔ اور اس وقت تک صرف اندازے قائم کرنا ہیں۔"

"ایک اور سوال ——— کیا آپ کے دوسرے کچھ ساتھی بھی ہیں۔؟"

"ساتھی ———" میں مسکرایا۔ "آپ جن معنوں میں ان کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ان میں

نہیں۔"

"پھر۔۔۔۔۔؟"

"جب تکلف ہی ختم ہو گیا۔ تو پھر کوئی بات چھپانا بے سود ہے۔ اس نشاندہی کا ذریعہ بھی ایک لڑکی ہی بنی ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔" دونوں کے منہ سے نکلا۔ "کوئی ایرانی لڑکی ہے۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ افغان۔۔۔۔۔ اسمگلروں کی داشتہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ میری اس سے ملاقات افغانستان کے ایک کلب میں ہی ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے وہ منشیات کے اڈے پر نشہ کرنے والوں کے لئے رقص کرتی تھی۔ یہاں نظر آئی تو میں نے اسے مدعو کیا۔ اور پھر میں نے اس سے اس کا راز اگلوالیا۔"

"بہت خوب۔۔۔۔۔" جمشید نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ کسی مناسب مقام پر مجھے اشارہ دے گی۔"

"بہت خوب۔۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔؟"

"درخشانہ۔" میں نے نہایت چالاکی سے جواب دیا۔

"گویا۔۔۔۔۔ وہ بھی سفر کر رہی ہے اسمگلروں کے ساتھ۔"

"یقیناً ایسا ہی ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔۔۔۔۔" دونوں دلچسپی سے مسکرانے لگے۔ پھر احسانی مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ویسے مسٹر نواز۔۔۔۔۔ لڑکیوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ ہیں بھی پرکشش انسان۔۔۔۔۔"

"دوستوں کو بے وقوف بنانے کا حق بھی ہوتا ہے۔ اس کے لیے میں آپ کی بات کا برا نہیں مانوں گا۔"

"بخدا۔۔۔۔۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ اگر افغان رقاصہ آپ پر ریجھ نہ گئی ہوتی اپنا راز کیسے بتا دیتی۔" جمشید نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر ہم لوگ کافی دیر تک ہنستے رہے۔ اس کے بعد انتہائی بے تکلفی کا ماحول پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ احسانی اور جمشید نے اپنے اپنے معاشقوں کی داستانیں بھی سنانا شروع کر دیں اور سفر کافی دلچسپ ہو گیا۔

"سورج ڈوب چکا تھا جب ہم تبریز پہنچے۔ میرے ذہن میں تردد تھا۔ ابھی ان لوگوں کو عنابی کار کے بارے میں بتا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس سے اس کی نشاندہی مناسب نہ ہوتی۔ لیکن اسے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ ست رفتاری سے ہم تبریز میں داخل ہوئے۔ آذربائیجان کا صدر مقام تبریز۔۔۔۔۔ تہران کے بعد ایران کا سب سے بڑا شہر ہے۔ کوہ ساہند سے نکلنے والی ندیوں نے اس علاقے کو کافی سرسبز اور شاداب بنا دیا ہے۔ تبریز کی تاریخ نگاہوں میں گھوم گئی۔ مولانا رومی اور شمس تبریز کی پہلی ملاقات یاد آئی۔ جب مولانا رومی ایک تالاب کے کنارے بیٹھے کتابوں کے مطالعے میں مصروف تھے شمس ادھر سے گذرے تو مولانا کے قریب پہنچ کر رک کے اور کتابوں کے ڈھیر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے۔؟"

"یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔۔۔۔۔ مولانا، جنہیں اپنے علم پر بے حد ناز تھا۔" طنز سے

بولے۔ لیکن اچانک کتابوں کے ڈھیر میں آگ لگ گئی اور مولانا گھبرا کر شمس تبریز کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"یہ کیا ہے۔؟"

"یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔" حضرت شمس تبریز نے فرمایا۔

یہ قصہ یاد آیا۔ اور آنکھوں میں نمی آگئی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ذہن کے کسی گوشے میں مذہب سے عقیدت کی کوئی چنگاری دبی رہ گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے ذہن ماؤف ہو گیا۔ بدن پر لرزہ طاری رہا۔ کیا لوگ تھے۔ اور۔۔۔۔۔ اب کیا ہے۔ احسانی اور جمشید نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔ استفسار کیا تو انہیں اس کے بارے میں بتایا۔ اور پھر دیر تک تبریز کے قصے ہوتے رہے۔ ایران کے مغل بادشاہوں کا دور یاد کیا گیا۔ ارغن خاں کی درخواست پر جب خان اعظم نے ایک مغل شہزادی مارکو پولو کی حفاظت میں چین سے ایران روانہ کی تو پولو اسے لے کر تبریز ہی آیا تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو ارغن خاں فوت ہو چکا تھا چنانچہ چینی شہزادی اس کے بیٹے غازان خاں کے قبضے میں آگئی۔

احسانی اور جمشید تبریز کے قصے سناتے رہے۔ عنابی کار نے تبریز کے آخری علاقے کے ایک گھٹیا سے ہوٹل کے سامنے قیام کیا تھا۔ اس سے کافی فاصلے پر میں نے بھی کار روک دی۔

"میرا خیال ہے کہ اب کل صبح ہی سفر کیا جائے۔ ہاں اگر اس دوران مجھے کوئی پیغام مل جائے تو دوسری بات ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا کہ رات میں سفر مناسب نہیں رہے گا۔" احسانی نے کہا۔

"کیا رات کار ہی میں گذاری جائے گی؟" جمشید نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے یہی مناسب ہے۔ وہ میری کار پہچانتی ہے۔ ممکن ہے رات کے کسی حصے میں آنے کی کوشش کرے۔" میں نے کہا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔" جمشید نے کہا۔ "میں ذرا اپنے ساتھیوں کو ہدایت دے دوں اور کھانے کے لئے بھی کچھ منگوا دوں۔"

"میں نے گردن ہلا دی۔ اور جمشید اور احسانی اتر کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ایک گہری سانس لی۔ طویل ڈرائیونگ کی وجہ سے بڑی تھکن طاری ہو گئی تھی۔ لیکن بہرحال ترکی میں داخل ہونے کے بعد آرام کرنا تھا۔ اس لئے یہ مشقت بری نہیں تھی۔ اور پھر یہ میرا پہلا کارنامہ تھا۔ اگر اسے بحسن و خوبی انجام دے لیا۔ تو غلام سیٹھ کے دل میں میری وقعت اور بڑھ جائے گی۔

ویسے غلام سیٹھ نے جو شرائط پیش کی تھیں وہ میرے لئے بہت دلکش تھیں۔ ان میں کم از کم وقت کا تعین تھا۔ اگر زندگی کے پانچ سال کامیابی سے گذر گئے تو کیا کہنے ہیں۔ لطف آ جائے گا۔ اس کے بعد کی زندگی پرسکون ہو گی۔ وطن واپس آنے کا تو منہ ہی نہیں رکھتا تھا۔ کس منہ سے اپنی زمین پر جاؤں گا۔ میری شخصیت گناہ کی دلدلوں میں غرق ہے۔ ان قدموں سے اپنی زمین کو ناپاک نہیں کروں گا۔ زمین کا کیا قصور۔۔۔۔۔ ہاں، ممکن ہو سکا تو بقیہ زندگی گناہوں کا کفارہ ادا کرنے میں صرف کروں گا۔

خوش آئند خیالات نے جکڑ لیا اور اس وقت چونکا جب وہ دونوں واپس آ گئے۔ احسانی کے

ہاتھوں میں ایک پیکٹ تھا جس میں گول سیخ کباب اور پراٹھے بندھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں یہ کھانا بہت پسند آیا۔ کافی تھا اس لئے ڈٹ کر کھایا۔ پھر جمشید نے کافی کا تھرماس نکالا۔ اور گرم گرم کافی پی گئی۔

ویسے لینڈ روور کافی بڑی تھی۔ اس لئے اس میں لمبی تاننے کا پروگرام بنایا۔ احتیاطاً" میں نے ایک ایک فرد کے جاگنے کا انتظار کیا اور انہیں بتا دیا کہ اگر درخشانہ آئے تو مجھے فوراً جگا دیا جائے۔ چنانچہ رات کے ایک پہر میں احسانی جاگا۔ دوسرے میں میں' اور تیسرے میں جمشید ۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

صبح اٹھ کر سب سے پہلے میں نے تلسی کی کار پر نگاہ دوڑائی۔ وہ موجود تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اور پھر جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہو گئے۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ عنابی کار اول وقت میں ہی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تھی۔

آج اسٹیئرنگ احسانی نے سنبھالا تھا اور اطمینان سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ تبریز سے نکلتے ہی بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرسبز وادیاں تاحد نگاہ پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان سفر بہت حسین تھا۔ دن کو دس بجے ہم مراند سے گذرے۔ پھر ایک بجے ماکو پہنچے۔ بڑا خوشنما قصبہ تھا۔ پھولوں کا شہر ماکو ۔۔۔۔۔۔ ماکو کا ناقابلِ تسخیر قلعہ ۔۔۔۔۔۔ جس نے تیموری افواج کا منہ پھیر دیا تھا۔ ماکو سے نکلتے ہی چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ جو عنابی کار کے لئے دشوار گذار تھی۔ لیکن لینڈ روور کے مضبوط اور طاقتور انجن نے اس چڑھائی کو چیلنج کر لیا۔ اور اسے اس چیلنج کو پورا کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ البتہ خنکی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے پوستین پہننا پڑی۔ جمشید اور احسانی نے بھی گرم سوئٹر استعمال کئے تھے۔ لیکن اب ان کے چہروں پر نمایاں تردد تھا۔ کیونکہ بازرگان کی ایران ترک چوکی نزدیک آتی جا رہی تھی۔ جمشید اور احسانی غیر معمولی طور پر خاموش ہو گئے تھے۔ میں نے بھی سنجیدگی کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ میری پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ جیسے میں کچھ سوچ رہا ہوں۔ وہ دونوں کبھی کبھی میری شکل دیکھ لیتے تھے۔ لیکن نہایت صبر کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ بازرکان کی چوکی سامنے آ گئی۔

احسانی اور جمشید اب بھی کچھ نہ بولے تھے۔ عنابی کار چوکی پر پہنچ گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری لینڈ روور بھی پہنچ گئی تھی۔ وہاں چند اور کاریں بھی کھڑی ہوئی تھیں جن کی تلاشی ہو رہی تھی۔

ہم لینڈ روور سے نیچے اتر آئے۔

"کیا خیال ہے مسٹر نواز ۔۔۔۔۔۔؟" بالآخر احسانی پوچھ ہی بیٹھا۔

"مجھے شدید حیرت ہے۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ کسٹم کے دو آدمی ٹہلتے ہوئے ہمارے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ تب احسانی نے ان میں سے ایک کو نزدیک بلایا۔ اس نے اپنا کارڈ اس کے سامنے کیا اور بولا۔

"افشار ہادی کو بلاؤ۔"

"بہت بہتر جناب ۔۔۔۔۔۔" کسٹم کا آدمی جلدی سے عمارت کی طرف دوڑ گیا۔

"افشار ہادی یہاں انچارج ہے۔" جمشید نے مجھے بتایا۔ اور چند ہی منٹ کے بعد ایک طویل القامت اور لمبی مونچھوں والا خوبصورت ایرانی افسر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ احسانی اور جمشید سے وہ گلے

ملا تھا اور پھر انہوں نے میرا تعارف کرایا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آیئے ۔۔۔۔۔۔ کیسے آنا ہو گیا۔؟"

ہم اس کے ساتھ کسٹم کی عمارت میں پہنچ گئے اور پھر اس کے دفتر میں آ بیٹھے۔

"براہ کرم یہ تو بتایئے کہ آج صبح سے اب تک کوئی ایسی کار تو نہیں گذری جس میں ایک یا دو آدمی ہوں۔ اور ایک افغانی عورت۔"

"آج ۔۔۔۔۔۔" افشار نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں ۔۔۔۔۔۔ نہ صرف آج بلکہ پچھلے تین چار دن سے ایسے لوگ نہیں گذرے۔ کیوں۔؟"

"آج کے کاغذات میں کسی تلسی نامی شخص کا اندراج ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تلسی ۔۔۔۔۔۔ ایک منٹ میں دیکھتا ہوں۔" افشار نے کہا اور ایک رجسٹر کھول لیا۔ رجسٹر میں آج صرف پانچ افراد کی فہرست تھی جس میں تلسی نام کا کوئی شخص نہیں تھا۔

"پھر کیا ہوا؟۔" میں نے پریشانی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"لیکن بات کیا ہے۔؟" افشار نے ہم تینوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس نام کے شخص پر منشیات لے کر جانے کا شبہ ہے۔" احسانی نے کہا۔

"اوہ ۔۔۔۔۔۔" افشار گردن ہلانے لگا۔ پھر بولا۔ "باہر کئی کاریں موجود ہیں۔ ممکن ہے ان میں کوئی موجود ہو۔ کیا آپ لوگ اسے پہچانتے ہیں؟"

"نہیں ۔۔۔۔۔۔ لیکن اس کا نام تلسی ہے۔"

"آیئے ۔۔۔۔۔۔ دیکھ لیں۔ ابھی انہیں کلیرنس نہیں ملا ہے۔" افشار نے کہا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ فوراً اٹھ گیا۔ میرے اٹھنے کے ساتھ ساتھ احسانی اور جمشید بھی اٹھ گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ان کاروں کے قریب پہنچ گئے جن میں اب احسانی کے ساتھیوں کی کار بھی شامل ہو گئی تھی۔ میری لینڈ روور وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا اور کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ افشار نے ہمارے ساتھ مل کر بذات خود ان کاروں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے کاغذات کی چیکنگ شروع کر دی۔ چوتھے نمبر پر ہم عنابی کار کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ تلسی سگریٹ پی رہا تھا۔ شکل ہی سے خطرناک آدمی معلوم ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ بیٹھا سردار بھی خاصا لحیم شحیم تھا۔

"آپ کے کاغذات ۔۔۔۔۔۔؟" افشار نے اس سے پوچھا اور تلسی نے اپنا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات اس کے حوالے کر دیئے۔ پاسپورٹ پر تلسی چند دیکھتے ہی افشار چونک پڑا تھا۔ اس نے عجیب سی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا اور غیر محسوس انداز میں اشارہ کیا۔ احسانی اور جمشید چونک پڑے تھے۔

"براہ کرم ۔۔۔۔۔۔ کیا آپ ہمارے ساتھ آنا پسند کریں گے۔؟" افشار نے نرم لہجے میں کہا۔

"کوئی خاص ضرورت ہے؟" تلسی نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ احسانی نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیا اور وہ چاروں جیبوں میں ہاتھ ڈالے نیچے اتر آئے۔ یقیناً ان کے ہاتھ پستولوں کے دستوں پر تھے۔

"ہاں ۔۔۔۔۔۔ خاص ضرورت ہے۔" افشار نے لہجہ کسی قدر سخت کرتے ہوئے کہا اندر بیٹھے

ہوئے لوگوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی اور پھر وہ دونوں طرف کے دروازے کھول کر نیچے اتر آئے۔

"فرمایئے۔۔۔۔۔کیا بات ہے۔؟"

"آیئے۔" افشار نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور وہ اس کے پیچھے چل پڑے۔ ہم تینوں بھی ساتھ تھے اور ہمارے پیچھے احسانی کے ساتھی چل رہے تھے۔ اس طرح ہم افشار کے دفتر میں داخل ہو گئے۔ احسانی اور جمشید بے حد چوکنے تھے۔ ان کے چہرے جوش سے سرخ نظر آ رہے تھے۔ ان کے بقیہ ساتھی دروازے پر جم گئے۔

"تشریف رکھیے۔" افشار نے کہا۔

"آپ ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں مسٹر آفیسر۔۔۔۔۔ براہ کرم اپنا کام کریں۔ اور ہمیں جانے کی اجازت دیں۔" تلسی نے کہا۔

"کیا آپ کے پاس اسلحہ موجود ہے؟" افشار نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ ہمارے پاس پستول ہیں۔ لیکن ان کے انٹرنیشنل لائسنس بھی موجود ہیں۔"

"دیکھ سکتا ہوں۔" افشار بولا اور انہوں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر لائسنس نکال کر میز پر ڈال دیئے۔

"پستول۔۔۔۔۔" افشار انہیں گھورتے ہوئے بولا۔ اور ان دونوں نے بغلی ہولسٹروں سے پستول بھی نکال لئے۔ پستول بھی میز پر رکھ دیئے گئے۔ افشار نے لائسنس دیکھ کر انہیں واپس کر دیا۔ انہوں نے پستولوں کی طرف ہاتھ بڑھائے تو افشار نے پستولوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"انہیں ابھی نہ اٹھایئے۔ آپ ترکی کیوں جا رہے ہیں۔؟"

"یہ سوال غیر ضروری ہے۔" سردار جی بولے۔

"جواب دیں۔ ضروری یا غیر ضروری کا تعین آپ نہیں کریں گے۔"

"ہمارا تعلق کابل کی ایک فرم سے ہے۔ جو خوبصورت کھلونے بناتی ہے۔ ہم اس کے سفری ایجنٹ ہیں۔"

"اوہ!۔۔۔۔۔ آپ کے پاس کھلونوں کے نمونے ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"یقیناً۔۔۔۔۔" انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"تب مسٹر افشار۔ براہ کرم تمام کھلونے یہاں منگوالیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پہلی بار ان دونوں کے چہروں پر بدحواسی نظر آئی۔ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگے۔ احسانی اور جمشید کبھی میری اور کبھی ان کی شکل دیکھ رہے تھے۔ افشار نے گھنٹی بجادی اور ایک آدمی اندر داخل ہو گیا۔

"عنابی رنگ کی کار کی مکمل تلاشی لو۔ اور اس میں رکھے ہوئے پلاسٹک کے کھلونے نکال لاؤ۔"

"آپ انہیں وہیں چیک کر لیں۔ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔" سردار نے اکڑتے ہوئے کہا۔

"اگر تم خاموش رہو تو بہتر ہے۔ ورنہ۔۔۔۔۔" افشار تیز ہو گیا۔

"ہماری بے عزتی کی جا رہی ہے۔ ہم اپنے سفارت خانے کی معرفت احتجاج کریں گے۔" تلسی کئی قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ لیکن اسی وقت عقب سے احسانی کے آدمیوں میں سے ایک نے اس

کی گردن پر پستول کی نال رکھ دی۔ تلسی نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ مزید دو آدمی اندر آ گئے تھے۔ تلسی بالکل بدحواس ہو گیا۔

"تلاشی لو ان دونوں کی۔ ان کے پاس اور اسلحہ تو نہیں ہے۔" جمشید نے کہا اور اس کے آدمی سردار جی اور تلسی کی تلاشی لینے لگے۔ ان کے پاس سے لمبے چاقو برآمد ہوئے تھے۔ افشار گردن ہلا رہا تھا۔ وہ دونوں اب خاموش تھے۔ لیکن ان کے چہروں پر اب زردی پھیلتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد افشار کے آدمی چند پیکٹ لئے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اور پھر پیکٹ میز پر رکھ دیئے گئے۔ افشار اور احسانی پیکٹوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جمشید چوکنے انداز میں ان لوگوں کی نگرانی کر رہا تھا۔

میں نے ایک چاقو اٹھایا۔ اور پیکٹ سے ایک کھلونا نکال لیا۔ پھر اس نے بے دردی سے کھلونے کا پیٹ چاک کیا۔ لیکن اس سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ احسانی اور افشار نے بھی دو کھلونے ضائع کئے تھے۔ دوسرے اور پھر تیسرے پیکٹ کے کھلونوں سے بھی کچھ برآمد نہ ہوا۔ لیکن میں درخشانہ کے بیان کو جھوٹ سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھا میں نے تمام پیکٹوں کے کھلونے نکالنا شروع کر دیئے۔ مختلف اقسام کے کھلونے تھے میں ان کے ڈیزائن کا اندازہ لگانے لگا۔ اور پھر میں نے تمام ڈیزائنوں کا ایک ایک کھلونا اٹھا لیا اور ان کا وزن کرنے لگا۔ ذرا سی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ سیاہ رنگ کے ریچھ ان کھلونوں میں سب سے زیادہ، بلکہ غیر معمولی طور پر وزنی ہیں۔ عمدہ طریقہ تھا۔ ریچھ کی کھال مصنوعی بالوں سے بنائی گئی تھی اور اتنی موٹی تھی کہ چاقو سے مشکل سے کٹ سکتی تھی۔ ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔ تلاشی لینے والے اسے بھی کاٹنے کی کوشش کرتے اور جب وہ نہ کٹتا تو وہ دوسرا کھلونا اٹھا لیتے۔ لیکن اصل چیز وہی ریچھ تھے جن کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ میں نے ریچھ کے پیٹ پر چاقو آزمایا لیکن ہر کام آسان نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اسے میز رکھا اور پھر چاقو مٹھی میں پکڑ کر بلند کیا اور زور سے اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اس طرح چاقو ریچھ کے پیٹ میں پیوست ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک سیاہ رنگ کا سیال مادہ ریچھ کے پیٹ سے بہنے لگا۔

"احسانی۔۔۔۔۔" میں نے احسانی کو مخاطب کیا۔

"ہوں۔۔۔۔۔" احسانی چونک کر بولا۔

"یہ دیکھو۔" میں نے اسے سیاہ سیال کی طرف متوجہ کیا اور احسانی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے سیال انگلی پر لگا کر اسے سونگھا اور پھر چکھا۔ اور پھر بری طرح اچھل پڑا۔

"ارے۔!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیوں۔؟" کیا ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"چاشک۔۔۔۔۔ کئی نشہ آور اشیاء سے کشید کیا ہوا محلول۔۔۔۔۔ افوہ!...... یہ تو بڑی قیمتی چیز ہے۔ غالباً ایک تولہ شیشی کی قیمت دس سے پندرہ ہزار روپے تک ہوتی ہے"۔

"خوب۔۔۔۔۔ مگر تمہیں اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"دلچسپ بات ہے۔ چند روز قبل ایک امریکن کے پاس سے ایک ننھی سی شیشی برآمد ہوتی تھی۔ وہ اس کے لئے جان دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ نشہ آور اشیاء میں یہ غالباً سب سے قیمتی چیز ہے۔ ماچس کی تیلی کا ایک سرا اس میں ڈبو کر سگریٹ کے تمباکو پر ٹپکا دو۔ ایک سگریٹ پورے دن کے لئے کافی ہے۔ امریکن ہپی نے بتایا تھا کہ اس ایک شیشی کے

عوض اس نے اپنی محبوبہ فروخت کر دی تھی جو چھ سال سے اس کے ساتھ تھی اور جس کی نیلی آنکھیں امریکہ کی تمام لڑکیوں سے زیادہ حسین تھیں۔ اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رویا۔ اس نے اپنا سر پھاڑ دیا ——— چنانچہ اس کے چند قطرے حاصل کرنے کے بعد شیشی اسے واپس کر دی گئی تھی۔ ورنہ شاید وہ مر ہی جاتا۔"

"ہوں ——— تو پیارے احسانی ——— ان ریچھوں میں چاشک محفوظ ہے۔"

تلسی اور سردار جی کے پاؤں بے جان ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو گئے تھے۔

"کیوں ———؟" افشار انہیں گھورتے ہوئے بولا۔ لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکے اور زمین پر بیٹھ گئے۔ شاید ان کے پیروں میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہ گئی تھی۔!

"ان دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو۔" افشار نے کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ان دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ احسانی اور جمشید مجھ سے چمٹ گئے تھے۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ ریچھوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا گیا۔ جس ریچھ سے سیال نکلا تھا اس کے پیٹ کے شگاف کو موم لگا کر بند کر لیا گیا تھا۔

افشار نے بھی میرا بے حد شکریہ ادا کیا۔

"مگر یار ——— وہ تمہاری خانم ——— میرا مطلب ہے وہ لڑکی کہاں گئی۔؟" احسانی نے پوچھا۔

"اوہ ——— ہاں ——— اس کے بارے میں بھی لوگ کیا کہیں گے۔"

"تلسی ———" احسانی نے پوچھا "تمہارے ساتھ ایک لڑکی تھی۔"

"لڑکی ———" تلسی بڑبڑایا۔

"ہاں ——— افغان لڑکی۔"

"اوہ ———" تلسی اچھل پڑا۔ "درخشانہ ——— مگر تمہیں اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔؟"

"وہ ہے کہاں۔؟" احسانی نے پوچھا۔

"میں سمجھ گیا۔ اسی کتیا نے نشاندہی کی ہو گی۔ افغان کتیا ——— تو اسی لئے غائب ہوئی تھی۔"

تلسی دانت پیسنے لگا۔ یوں اس بیان کی تصدیق بھی ہو گئی اور اب میری پوزیشن بالکل صاف تھی۔

"کیا تم نے اسے قتل کر دیا۔؟" جمشید نے تلسی کے بوٹ کی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"نہیں ——— مگر کاش میں اسے قتل کر سکتا۔ وہ تہران میں ہی غائب ہو گئی تھی میں سمجھ گیا ضرور اس نے ہی ہماری مخبری کی ہو گی۔"

"لیکن ہمیں اطلاع ملی تھی کہ وہ تمہارے ساتھ ہی آ رہی ہے۔"

"آ رہی تھی لیکن عین موقع پر ہی غائب ہو گئی۔ ہم انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن سچ سچ بتا دو۔ کیا اسی نے ———؟"

"اب وہ تو تیری ساتھی تھی۔ وہ سالی کیا مخبری کرتی۔" احسانی نے کہا اور پھر ان دونوں کو اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔

"اب کیا پروگرام ہے احسانی۔؟" میں نے پوچھا۔

"دوست نواز ——— تمہارے اس تعاون پر ہم زندگی بھر تمہارے احسان مند رہیں گے۔ پھر کبھی ایران آنا ہو تو ہم سے ملے بغیر نہ چلے جانا۔ ویسے کیا خیال ہے۔ تم آج ہی سرحد پار کرنا چاہتے ہو۔؟"

"ہاں ——— میرا خیال ہے یہی مناسب ہے۔"

"آج ہمارے مہمان رہیں مسٹر نواز ———" افشار نے کہا۔

"اجازت ہی دیں ——— حالانکہ آپ لوگوں سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہتا ——— لیکن آج نہ سہی کل ——— جانا تو ہے ہی ———"

"تب پھر ایک دور چائے کا ہو جائے۔" افشار نے کہا اور اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا۔ اس ویرانے میں بھی افشار نے چائے کا کافی تکلف کر ڈالا تھا۔ پھر چائے کی میز پر ہی جمشید نے محمود بے کے نام تعارفی خط دیا۔ افشار نے اس پر مہر لگا دی تھی۔ اس خط میں میرے ساتھ تعاون کرنے کی درخواست کی تھی۔ اور مختصراً میرا تعارف بھی کرایا گیا تھا۔ بہرحال ایک بھرپور خط تھا جسے میں نے حفاظت سے رکھ لیا تھا۔ یقیناً دوسرے مرحلے میں یہ میرے کام آئے گا۔

احسانی اور جمشید آخری بار مجھ سے گلے ملے۔ انہوں نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا۔ اور میں اپنی لینڈ روور میں بیٹھ گیا۔ اب میری کار کی چیکنگ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا خود افشار نے مجھے ضمنی طور پر کلیرنس فارم دیا تھا۔ انہوں نے مجھے خدا حافظ کہا اور میں چل پڑا۔ ایرانی کرنسی تبدیل کرانے میں کچھ وقت صرف ہوا۔ اور چند منٹ کے بعد میں ترکی کی سرزمین میں داخل ہو گیا۔ میری نگاہیں چاندی کی دیوار کوہ آرارات سے ٹکرائیں۔ برف کا پہاڑ جو نوح کا پہاڑ بھی کہلاتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی اسی پہاڑ کی چوٹی پر لنگر انداز ہوئی تھی۔

ترکی کسٹم ہاؤس کی عمارت کے دروازے پر سرخ و سفید ترک سپاہیوں نے میرا خیر قدم کیا۔ بظاہر وہ بہت اخلاق سے پیش آئے تھے۔ میں فوراً محمود بے کے بارے میں پوچھا۔ اور سپاہی چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

"کیا آپ ان سے واقف ہیں؟"

"ہاں ——— وہ میرے دوستوں کے دوست ہیں۔ براہ کرم یہ خط انہیں دے دو۔" میں نے خط نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔ ویسے دل اندر سے دھڑک رہا تھا۔ دو تین سپاہی لینڈ روور کی تلاشی لینے لگے۔ انہوں نے اندر جھانکا اور پھر نیچے جھانکنے لگے۔ میرے ہونٹ خشک ہوتے جا رہے تھے۔ بار بار آنکھوں میں تاریکی چھا جاتی۔ بظاہر میں ترک سپاہیوں کی طرف سے بے نیاز تھا۔ لیکن میں ان کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر ان میں سے ایک بھی سپاہی لینڈ روور کے نیچے رینگ جائے تو بلاشبہ وہ سلنڈر ان کی نگاہوں میں آ سکتے ہیں جن کے وجود کا کوئی جواز نہیں ہے۔

میں دل کی ایک ایک دھڑکن شمار کر رہا تھا۔ تب ایک سپاہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ یقیناً یہ بہت چالاک تھے اور پوری مہارت سے تلاشی لیتے تھے۔ سپاہی شاید لینڈ روور کے نیچے جانے کی تیاری کر رہا تھا اور میری آنکھیں خوف سے بند ہوئی جا رہی تھیں کہ بائیں سمت سے آواز آئی۔

"ہیلو ———" اور میں اچھل پڑا۔ ایک طویل القامت ترک میرے سامنے مسکرا رہا تھا بیٹھا

ہوا سپاہی جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے آنے والے کو سلام کیا تھا۔

"غالباً آپ ہی مسٹر نواز اصغر ہیں؟" آنے والے نے انگریزی میں پوچھا۔

"جی۔" میں نے انتہائی کوشش سے آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اور آپ یقیناً محمود بے۔"

"یقیناً۔" محمود بے نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ اور میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا تھا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر------ ایران میں آپ نے انسداد منشیات کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ ویسے بھی میرے لئے یہ مسرت کی بات ہے کہ آپ پاکستانی ہیں۔"

"شکریہ۔" میں نے انکساری سے کہا۔ میری نگاہیں قرب و جوار کے ماحول کا بھی جائزہ لے رہی تھیں اور یہ دیکھ کر کہ اپنے اعلیٰ افسر کو دوستانہ انداز میں میرے نزدیک دیکھ کر سپاہی میری گاڑی کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔ مجھے ایک گونہ سکون ہوا۔ میں زیادہ پرسکون انداز میں محمود بے سے گفتگو کرنے لگا۔

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔" محمود بے نے پوچھا۔

"بس شکریہ۔ کچھ عرصہ آپ کے ملک میں رہوں گا۔ پھر آگے بڑھ جاؤں گا۔"

"ہاں صاحب------ سیاحت بھی خوب چیز ہے بشرطیکہ انسان کو مواقع میسر ہوں۔" محمود بے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بہرحال، میرے ساتھ ایک کپ کافی تو پی لیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

"شکریہ۔" میں نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اور محمود بے نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ میرے ساتھ میری گاڑی میں ہی آبیٹھا۔ گاہے گاہے وہ نظریں اٹھا کر چاروں طرف دیکھ لیتا تھا۔ سپاہی اپنا کام کر رہے تھے۔ آدمی کے آنے پر اس نے کافی کے لئے کہا اور پھر مجھ سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ جمشید عظمی سے دوستی کے قصے، ایران کے سفر کے قصے اور پھر اپنے کام کے بارے میں دلچسپ اور باتونی آدمی تھا۔ بہت جلدی بے تکلف ہو جانے والوں میں------ سپاہی گاڑیوں اور انسانوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ اس کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے محمود بے نے کہا۔

"منشیات کی اسمگلنگ کا زور بڑھ گیا ہے۔ اب تو بڑے منظم پیمانے پر یہ کاروبار ہو رہا ہے۔ اسمگلر نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں۔ اور ہم لوگوں کو ان کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ پہلے نہایت آسانی سے کام چل جاتا تھا۔ مثلاً ہم ایک فارم پر کراتے تھے جس پر سوال ہوتے تھے۔ بظاہر صرف اسے کاغذی کاروائی کہا جاتا تھا۔ اس پر سوال ہوتے تھے۔ آپ کے پاس کیمرہ ہے؟ کتنی فلمیں ہیں؟ ترکی میں کتنے روز قیام کا ارادہ ہے آپ اپنے سامان میں چرس یا افیون تو نہیں لے جا رہے؟ اگر لے جا رہے ہیں تو مہربانی کر کے وزن لکھ دیجئے۔ اور اسمگلر حضرات یہ بے نیازی دیکھ کر تھوڑی بہت مقدار لکھ دیتے تھے اور نہایت آسانی سے دھر لئے جاتے تھے۔ لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ سب کو اس خطرناک فارم کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔ چنانچہ فارم سسٹم ہی ختم کر دیا گیا ہے۔

"خوب۔" میں کہتا رہا۔ میری نگاہ چند ہپیوں پر تھی جن کے پاس شاید کچھ موجود تھا سپاہی ان سے الجھ رہے تھے۔ اتنی دیر میں کافی آ گئی۔ محمود بے سپاہیوں کی طرف متوجہ تھا اور کافی کے گھونٹ

لے رہا تھا۔ بالآخر سپاہی ہپیوں کو لے کر محمود بے کے پاس پہنچ گئے۔ چرس کی تھوڑی سی مقدار ان کے پاس تھی جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ وہ ان کے اپنے استعمال کے لئے ہے۔ محمود بے ان سے گفتگو کرتا رہا۔ بہرحال اس نے چرس اپنے قبضے میں کر لی اور انہیں ترکی میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کافی ختم ہو گئی تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت مانگی۔

"بڑی مختصر ملاقات رہی۔ میں کوئی خدمت بھی نہیں کر سکا۔" محمود بے نے میرے کاغذات طلب کرتے ہوئے کہا اور پھر ان پر دستخط کر دیئے لیکن یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ اس نے کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ میں نے اس کی اجازت سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ محمود نے دور سے ہی اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا تھا اور انہوں نے رکاوٹ ہٹا دی میری گاڑی اندر داخل ہو گئی۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ میں نے اپنی پہلی مہم کامیابی سے سر کر لی تھی۔ بس اب تھوڑی سی کوشش اور------ اس کے بعد بیڑہ پار۔

کوہ آرات کے خنک دامن میں سفر کرتا ہوا میں آگے بڑھتا رہا۔ ٹھٹھرا دینے والی سردی تھی۔ اسٹیئرنگ یخ ہو رہا تھا لیکن فی الحال میں رک کر دستانے پہننے کے موڈ میں بھی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ارض روم جانے والی بسوں کے اڈے پر پہنچ گیا۔

سرحد کا مرحلہ طے ہو گیا تھا اور اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ایک طرف سے گوشت بھننے کی خوشبو ناک میں چڑھ رہی تھی۔ بے اختیار رکنے کو دل چاہا اور میں نے گاڑی کا رخ سڑک کے کنارے بنے ہوئے گھاس پھونس کے قہوہ خانے کی طرف کر دیا۔ قہوہ خانے کا مالک زمین پر بیٹھا کوئلے دہکا کر سیخ کباب بھون رہا تھا۔ میں نے اپنے سامان سے گرم دستانے نکالے۔ انہیں ہاتھوں پر چڑھایا اور گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

چھپر کے نیچے بینچیں پڑی ہوئی تھیں اور ان پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ملکی اور غیر ملکی ہپی بھی تھے۔ تب اچانک میری نگاہ ایک کونے کی طرف اٹھ گئی اور میں چونک پڑا۔

دو شناسا شکلیں نظر آئی تھیں۔ یہ کیسٹر اور جولیا تھے۔ وہ ہپی جوڑا جس نے افغانستان سے ایران تک ہمارے ساتھ سفر کیا تھا۔ اس وقت جب کوشلیا میرے ساتھ تھی جو خاموشی سے ہماری اور کوشلیا کی گفتگو سنتا رہا تھا اور بعد میں یہ کہہ کر اتر گیا تھا کہ وہ اردو سے بخوبی واقف ہیں۔

ان دونوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور وہ مضطربانہ انداز میں کھڑے ہو گئے تھے۔ اب انہوں نے دیکھ ہی لیا تھا تو انہیں نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ انہیں دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی یا الجھن؟------ تاہم میں ان دونوں کی طرف بڑھ گیا۔

"ہیلو------" جولیا مجھے دیکھ کر کھل اٹھی۔

اوہ۔ مسٹر نواز------ تمہاری وائف کہاں ہے؟" جولیا نے پوچھا۔ کوشلیا کا تصور دل میں آیا۔ ایک ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا۔ لیکن پھر یہ چبھن فوراً معدوم ہو گئی۔ اب میں جذبائیت کی حدود سے نکل آیا تھا۔

"وائف------ وہ میری وائف نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب------؟" کیسٹر چونک کر بولا۔

"یہ اندازہ تو صرف تم لوگوں نے قائم کر لیا تھا۔ وہ میری بیوی نہیں صرف وقتی طور پر ساتھی تھی جسے میں نے ایران میں چھوڑ دیا۔"

"اوہ ——— ساتھی۔" جولیا مسکرائی۔

"اس کا ذکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ تم نے قہوہ پیا۔؟" میں نے کوشلیا کے ذکر سے بیزار ہو کر کہا۔

"ہاں۔ لیکن افسوس دوست' ہمارے پاس صرف ایک کپ کے پیسے تھے۔ ہم نے ایک کپ قہوہ منگا کر آدھا آدھا پی لیا۔ مطلب یہ کہ ہم تمہاری خدمت سے معذور ہیں۔" کیسٹر نے کہا۔

"اوہ ——— کوئی بات نہیں ہے۔ اب میری طرف سے پیو۔" میں نے کہا۔ اور بوڑھے کو اشارہ کر کے سیخ کباب اور قہوہ لانے کے لئے کہا۔ بوڑھے نے قہوے کی کیتلی' بڑے بڑے پیالے اور سیخ کباب کی پلیٹ ہمارے سامنے رکھ دی۔ کیسٹر اور جولیا احسان مند نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"شروع کرو۔ تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا اور ان دونوں نے کباب کھانا شروع کر دیئے۔ کباب اور اس کے ساتھ قہوے کے گھونٹ بے حد لطف دے رہے تھے۔ میں نے دوسری پلیٹ کا آرڈر دے دیا۔ نہ جانے وہ دونوں کب سے بھوکے تھے۔ قہوے کے کئی پیالے اور سیخ کباب کی تین پلیٹیں کھانے کے بعد انہوں نے سکون کی سانس لی اور پھر کیسٹر نے میرا شکریہ ادا کیا۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے کیسٹر ———؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ ——— ارض روم جانے والی بس دن میں صرف ایک بار یہاں آتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ بس کنڈکٹر خود کو اتنا بااخلاق ثابت نہیں کر سکا کہ ہمیں مفت لے جاتا۔ چنانچہ طے یہ کیا گیا تھا کہ ڈیڑھ لیسرا میں قہوہ پی کر جسم کو تھوڑا سا گرم کریں۔ اور پھر بایزید تک کا سفر شروع کر دیں۔ قصبہ بایزید یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ سردی کی وجہ سے سفر اور سست ہو جائے گا۔ تاہم ——— ڈر صرف یہ تھا کہ اگر راستے میں رات ہو گئی تو سردی پریشان کرے گی۔" کیسٹر نے بتایا۔

"ہوں۔ تب پھر اٹھو۔" میں نے کہا۔

"اوہ ——— تمہارے پاس گاڑی موجود ہے۔؟"

"ہاں ———"

"شکریہ پیارے دوست۔ کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔" کیسٹر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ جولیا اب بھی تشکر آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات تھے۔

"کتنے پیسے ———؟" میں نے قہوہ خانے کے بوڑھے مالک سے پوچھا۔

"بتیس لیرا۔" اس نے کہا اور دونوں ہاتھ زور زور سے ملنے لگا۔ کیسٹر اور جولیا نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ لیکن میں نے اطمینان سے بتیس لیرا نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور کیسٹر کے شانے پر ہاتھ مار کر باہر نکل آیا۔ جولیا نے چاروں طرف نظریں دوڑائی تھیں۔

"اوہ ——— تمہاری گاڑی ———؟"

"یہ ہے۔" میں لینڈ روور کے نزدیک پہنچ گیا۔ اور جولیا کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"اوہ ——— گاڈ ——— یہ تو ——— یہ تو بہت آرام دہ ہے۔ وہ گاڑی۔ میرا مطلب ہے"

"وہ اسی کی تھی ——— یہ میری ہے۔" میں نے کہا۔

"افوہ ——— اگر ہم تھوڑی دیر قبل چل دیتے تو شاید تم سے ملاقات نہ ہوتی۔" کیسٹر سے زیادہ جولیا خوش نظر آ رہی تھی۔ بہرحال وہ دونوں میرے نزدیک ہی بیٹھ گئے۔ جولیا میرے برابر تھی اور کیسٹر دروازے کی طرف۔ اور ان کے جسموں پر اس سردی کو برداشت کرنے کے لئے لباس بھی ناکافی تھے۔

اور ——— لینڈ روور اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے ایک دلچسپ بات سوچی ——— جولیا نرم و گداز جسم کی مالک ہے۔ بلند و بالا قد کی یہ بھرپور عورت' اگر میرے ساتھ ایک دو رات گذار لے تو میں ان لوگوں کو نیا لباس اور اتنی رقم دے دوں گا جس سے ان کے لئے کچھ آسانیاں فراہم ہو جائیں۔ اس رات کو دلچسپ میں نے یوں محسوس کیا تھا۔ کہ میں نے اپنے سوچنے کے انداز میں تبدیلی پائی تھی۔ اس سے قبل میں دوسرے انداز میں سوچتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ میری سوچ بدلتی جا رہی تھی۔ وہ ماحول میرے ذہن میں رچ رہا تھا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ لینڈ روور مناسب رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اور جولیا مجھ سے بھڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ کیسٹر نے نشست سے ٹیک لگا لی تھی۔ لینڈ روور کے تمام شیشے بند تھے اور سردی کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ شاید پیٹ بھرنے سے کیسٹر پر غنودگی طاری ہو گئی تھی۔

بہرحال سفر خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ پھر جولیا نے بھی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ سڑک دور دور تک صاف ستھری تھی۔ میں نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ خوبصورت خدوخال' کسی قدر کرختگی لئے ہوئے' میلے بال' گلابی ہونٹ لمبی گردن' جسامت کے لحاظ سے بھرپور سینہ ——— جس کا آدھا حصہ کھلا ہوا تھا' پتلی کمر اور گداز بانہیں۔

اچانک جولیا کا ایک ہاتھ سرکا اور میری گود میں آ پڑا۔ میں بوکھلا گیا۔ اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھ لرزنے لگے۔ لیکن میں نے خود کو سنبھالا۔ یہ امکان ہی ہو سکتا ہے۔ شاید اس پر بھی غنودگی طاری ہو گئی ہے۔ لیکن چند ساعت کے بعد میں نے جولیا کے ہاتھ میں گردش محسوس کی اور میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ میں نے جولیا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ لیکن چہرے پر انوکھے جذبات تھے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب عورت کی دنیا کا اناڑی انسان نہیں تھا بلکہ اسے اچھی طرح سمجھتا تھا۔

...○...

اور

راجہ نواز اصغر نے اس دور کو اپنی زندگی کا بدترین دور کہا ہے' جب وہ ذہنی طور پر انسانیت کو بالکل فراموش کر چکے تھے۔ انہوں نے کیا کیا گل کھلائے یہ تو اگلے حصہ میں ہی معلوم ہو سکے گا!